# علامہ اقبال کی پائندہ یادیں



ڈاکٹر ندیم شفیق ملک

نشریات

# علامہ اقبال کی پائندہ یادیں

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک

نشریات

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔فون: 0321-4589419

۲۰۱۷ء

نام کتاب: ........................ علامہ اقبال کی پائندہ یادیں

مصنف: ........................ ڈاکٹر ندیم شفیق ملک

اہتمام: ........................ نشریات

صفحات: ........................ ۳۴۳

علامہ محمد اقبال کے خادمِ خاص اور میرے مخدوم

جناب میاں علی بخش صاحب

کی

خانوادۂ اقبال کی چار دہائیوں سے زیادہ

بے لوث خدمت، رفاقت اور خلوص

کے نام

# ترتیب

# دیباچہ

تمام تر تعریفیں، حمد وثنا اور بزرگی اللہ سبحانہ تعالیٰ کے لیے ہے جو بہت مہربان، نہایت رحم کرنے والا اور علم کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری اور محبوب پیغمبر حضرت سیدنا محمد ﷺ پر اپنی ابدی اور بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے جو کائنات میں علم کے تقسیم کرنے والے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء کو ہماری ملی تاریخ میں ایک نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی کتب کا دنیا کی بہت سی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ خود حیاتِ اقبال پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اب بھی ان کی زندگی کے بہت سے پہلو مخفی ہیں۔ یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک حقیر کاوش ہے۔ زیر نظر مجموعہ علامہ اقبال کے رفقا کی ان سے ملاقاتوں اور یادوں پر مشتمل ہے جن کا انتخاب مختلف جرائد وکتب سے کیا گیا ہے۔ میں تمام محبانِ اقبال کی جانب سے ان کے گرامی قدر مصنفین اور مرتبین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی تحقیق میں ہمیں شریک کیا۔

زیرِ نظر مجموعہ کی تکمیل پر میرا دل جہاں اللہ رب العٰلمین کے حضور سجدہ ریز ہے، وہاں مجھ پر کئی محسنین کا شکریہ بھی واجب ہے جنھوں نے اس ضمن میں میری دامے، درمے، سخنے مدد کی۔ میں خصوصیت سے جناب محمد تنویر، جناب محمد یاسر خان، جناب مستنیر حیدر اور جناب ہارون شہزاد کا تہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے نہایت احسن طریقے سے اس کتاب کی ٹائپ کاری اور تدوین کی۔ میں نشریات کے مہتمم جناب رفیع الدین حجازی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کے اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

آخر میں، میں اپنے والدین کریمین جناب حاجی ملک محمد رفیق صاحب اور جنابہ صفیہ رفیق مرحومہ ومغفورہ کے احسانات کا بھی اعتراف کرتا ہوں جنھوں نے مجھے تحصیلِ علم کی راہ پر لگایا اور ہمیشہ میری علمی کاوشوں کو سراہا۔ آج تک جو کچھ بھی میں حاصل کر سکا ہوں وہ انھی نفوسِ قدسیہ کی

دعاؤں کی بدولت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

مزید برآں میں اپنی اہلیہ نادیہ ندیم، اور دیگر اہل خانہ کا تہہ دل سے احسان مند ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق و تدوین مجھے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی اور ان کے خوش دلانہ تعاون کے بغیر اس تصنیف کی تکمیل ممکن نہ ہوتی۔ میرے بیٹے محمد انسِ مصطفےٰ، بھتیجے محمد اویس ملک اور بھتیجی ایمل فاطمہ کی مسکراہٹیں اور دلچسپ باتیں اس سارے سفر میں میری زادِراہ رہیں۔ ان نعمتوں کے لئے میرا رواں رواں رب العزت کا شکر گزار ہے۔

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک
''بیت مشرقی پاکستان''
مکان نمبر ۵۔اے، سٹریٹ نمبر ۲
ایف ایٹ تھری، اسلام آباد

# اقبال رحمۃ اللہ سے میری پہلی ملاقات•

ابو محمد مصلح

مدارس کے علمی سفر سے واپسی پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم شاہی مہمان کی حیثیت سے چند روز حیدر آباد میں بھی ٹھہرے۔ میں تحریک قرآن کے سلسلے میں نواب نذیر جنگ بہادر کے ہمراہ ملنے گیا۔ تعارف کے بعد تحریک قرآن کا اولین مقصد قرآن مجید کی تعلیم معنی و مطلب کے ساتھ عام اور لازمی کرنا بیان کیا گیا۔ اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ اقبال نے اپنے خاص انداز میں کہا۔

"مولوی صاحب! آپ کی تحریک سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر پہلے یہ تو بتائیے کہ قرآن پڑھائے گا کون؟ مجمع ہمہ تن گوش بن گیا اور مجھ کمبل بدوش کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھنے لگا کیونکہ یہ کوئی معمولی عارضہ نہ تھا اور نہ کسی معمولی شخص کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب! بے شک حقیقی معنوں میں قرآن کے پڑھانے والوں ہی کی کمی ہے۔ جس دن یہ کمی پوری ہوئی سب کچھ ہو جائے گا مگر آپ مجھے قرآن قرآن کرنے دیجیے کیونکہ آپ کے حسب منشا قرآن پڑھانے والے بھی قرآن ہی سے پیدا ہوں گے۔"

اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں اور میں نے رخصت چاہی۔ دوسرے دن ایک طالب علم کے ہاتھ کچھ چھپی ہوئی چیزیں بھجوائیں اور تحریک کے متعلق رائے طلب کی۔ طالب علم نے اپنی طرف سے یہ جرأت کی کہ ان کو بھی قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ کی دعوت دی۔ انہوں نے مزاحاً کہا:

• بصد شکریہ، ابو محمد مصلح، اقبال اور قرآن، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 201-204۔

"پہلے میں آپ کے استاد سے قرآن پڑھوں گا، پھر ضرور ایسا کروں گا۔"

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اقبال کس شان کے آدمی تھے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ان کو کسی سے قرآن کا درس لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو دوسروں کو خدا کا آخری پیغام سنانے کے لیے پیدا کیے گئے تھے اور پھر اس علم وحکمت کے زمانے میں اپنے اس فرض کو ان سے زیادہ دلآویز پیرائے میں کس نے پورا کیا۔ جو روشن خیال تجدد پسند طبقہ کے لیے نا قابل انکار حقیقت بنا ہوا ہے۔ پھر انہوں نے تحریک پر حسب ذیل رائے کا اظہار فرمایا:

جناب مولوی صاحب!

السلام علیکم! قرآن تحریک کا پروگرام مبارک ہے۔ اس زمانہ میں قرآن کا علم ہندوستان سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کی جائے۔ کیا عجب کہ آپ کی تحریک بارآور ہو اور مسلمانوں میں قوتِ عمل پھر عود کر آئے۔"

مخلص۔ اقبال (۱)

## اقبال سے میری دوسری ملاقات

میں "قرآن مجید" مع بچوں کی تفسیر کی کتابت وطباعت کے سلسلے میں کچھ مدت کے لیے لاہور گیا۔ ایک دن ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی ملنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (۲) بھی تھے۔ عصر کی نماز وہیں ادا کی۔ چائے نوشی کی بھی نوبت آئی۔ اقبال چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ علالت کا سلسلہ جاری تھا مگر اتنا نہیں کہ معذوری ہو چکی ہو۔ سب سے پہلے تحریک قرآن کی رفتار کے متعلق استفسار کیا۔ پھر لاہور آنے کی غرض دریافت کی۔ اپنے بچوں کے لیے چھپے ہوئے پارے چغتائی صاحب کے ذریعے بھیج دینے کو کہا۔

حیدرآبادی سیاست کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے "اسلامی کلچر" پر خیال آرائی کا بھی ذکر آیا۔ اقبال نے جو اس کا جواب دیا تھا، میں نے اُس کی تحسین کی۔ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے دہلی منتقل کرنے والے تھے۔ اقبال نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس کے لیے موزوں مقام لاہور ہے۔ اسلام میں عورتوں کی حیثیت کا ذکر چھڑا تو اقبال نے کہا، مجھ سے ایک دن ایک امریکی لیڈی ملنے آئی اور اس نے شکایتاً کہا کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ

انصاف نہیں کیا ہے۔ اس پر اس کو ایسا مسکت جواب دیا گیا کہ قائل ہو گئی۔ اقبال نے یہ بھی کہا تھا کہ دنیا میں صرف ایک ہی ذات ایسی ہوئی ہے جس نے عورت کی فطرت کو کامل طور پر پہچانا اور وہ ذاتِ گرامی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی واُمّی) کی تھی۔ دیکھا گیا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام مبارک آتے ہی اقبال کا دل بھر آیا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں۔

## اقبال کی وفات

میں لاہور میں کئی برس رہا۔ سید محسن شاہ صاحب سیکرٹری انجمن اسلامیہ پنجاب اور میاں نظام الدین صاحب رئیس اعظم لاہور کی خواہش پر مدرسہ عالمگیر تحریکِ قرآن مجید کے نام سے ایک تعلیم گاہ شاہی مسجد میں قائم کی گئی۔ یہ ایک ضمنی کام تھا۔ اصل امور انجام دینے کے لیے مسجد سے باہر صدر دروازے سے متصل شمالی حجروں کے سامنے جھونپڑے ڈالے گئے تھے۔ آسانی کے خیال سے بعد میں شب و روز میں وہیں رہنے بھی لگا۔

ایک دن دوپہر کے وقت خطیب مسجد مولوی نور الحق صاحب نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں باہر آیا تو ان کی زبانی ڈاکٹر اقبال کے انتقال کی خبر ملی۔ خطیب صاحب نے یہ بھی کہا کہ دروازے کے دوسری جانب یعنی جنوب سمت کے حجروں کے سامنے جو صحن ہے، مزار کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ ابھی ابھی میاں نظام الدین صاحب، سید محسن شاہ صاحب اور مولانا غلام مرشد صاحب اس سلسلے میں آئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی علالت کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا اور کبھی کبھی اخبار سے کوئی خبر مل جایا کرتی تھی مگر یہ بات گمان میں بھی نہ تھی کہ قرآن کا مفسر، اسلام کا داعی، انسانیت کا ہمدرد، مسلمانوں کا غمخوار اور دنیا کا ایک بڑا آدمی اقبال ہمیشہ کے لیے ہم سے اس قدر جلد جدا ہو جائے گا۔ خدا کی مرضی ایسی ہی تھی جسے بہر حال پورا ہونا تھا۔ اب شاہی مسجد کے دروازے کے ایک طرف میرا قیام تھا اور دوسری طرف اِقبال کے لیے قبر تیار ہو رہی تھی۔ شام ہوئی، جنازہ آنے سے پہلے شاہی مسجد کے اندر اور باہر لوگ جمع ہونے لگے۔ حضوری باغ میں بھی ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے۔ اس کے بعد جنازہ جس شان سے آیا اور جتنا عظیم الشان اجتماع نظر آیا، وہ اپنی نظیر آپ تھا۔

لاہور کی شاہی مسجد ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع مسجد ہے۔ اس کے صحن میں نمازِ

جنازہ ادا ہوئی اور اس کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ قلعہ اور مسجد کا درمیانی حصہ صدیوں سے خالی پڑا تھا، اب معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں نے بھی اس رعایت کو مدنظر رکھا تھا اور خود اورنگزیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کو بھی اپنے سوگوار اقبال کی خاطر منظور تھی اور چونکہ اس کے بعد بھی عرصہ تک لاہور میں رہا۔ اس لیے وہ سب مناظر رات دن دیکھتا رہا جو اقبال کے مزار پر عقیدت مندوں کی طرف سے پیش ہوتے رہے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے ؎

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی (۳)

(اقبال)

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) علامہ کا یہ خط اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاءاللہ میں شائع ہو چکا ہے۔

(۲) ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم: علامہ کے دوستوں میں شامل تھا۔ عبدالرحمن چغتائی کے بھائی اور اقبال پر دو تین کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

# اقبال......میرا روحانی سہارا•

ابوالاعلیٰ مودودی/ انٹرویو غلام حسین اظہر

## "اقبال میرا روحانی سہارا تھا......"

چند سال ہوئے ترجمان القرآن کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ الفاظ میری نظر سے گزرے۔ ان الفاظ میں مجھے جذبات و احساسات کی شدت محسوس ہوئی۔ ان الفاظ کے پردہ میں کیا المیہ کارفرما ہے۔ یہ جاننے کی چیز تھی۔ بارہا خواہش پیدا ہوئی کہ مولانا سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ لیکن ہر بار مولانا کی گوناگوں مصروفیات کا خیال آتے ہی یہ خواہش دب کے رہ گئی۔۔ اب کے سیارہ کے "اقبال نمبر" کا مرحلہ آیا تو میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مولانا سے اس دیرینہ خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا نے کسی شام کو حاضر ہونے کو کہا۔ چنانچہ میں ۱۴ اپریل کی شام کو مولانا کے ہاں حاضر ہوا۔ مولانا سے گفتگو کا ماحصل پیش خدمت ہے۔

مولانا آپ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ اقبال میرا روحانی سہارا تھا، اس کے پس منظر میں کیا المیہ کارفرما ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے پٹھانکوٹ میں آنے کو لکھا تھا اور مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تم اس جگہ آ کر بیٹھ جاؤ تو میں بھی سال میں چھ مہینے وہاں گزارا کروں گا۔ اس میں ایک ایسی جاذبیت تھی جس کی وجہ سے میں نے فوراً اس تجویز کو قبول کر لیا اور حیدر آباد سے پٹھانکوٹ چلا آیا۔

---

• بصد شکریہ، سیارہ، لاہور، اقبال نمبر، مئی ۱۹۶۳، بحوالہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ، ص 367-370۔

مگر اس ساری داستان کا المیہ یہ ہے کہ مارچ میں میں پٹھانکوٹ منتقل ہوا اور اپریل میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت مجھ پر اس حادثہ کا شدید اثر تھا۔ اسی احساس نے مجھے یہ الفاظ لکھنے پر مجبور کیا۔"

مولانا آپ کے اور علامہ اقبال کے درمیان اس سلسلہ میں جو مراسلت یا گفتگو ہوئی، اسے اگر تفصیلاً بتادیں تو مفید ہوگا۔

وہ خطوط تو میرے پاس نہیں ہیں، میں دوسری تفصیلات بتائے دیتا ہوں۔

مولانا نے اپنے مخصوص دھیمے دھیمے انداز میں کہنا شروع کیا۔

چودھری نیاز علی صاحب نے دین کی خدمت کے پیش نظر ایک ادارہ قائم کرنے کے لئے زمین وقف کی اور عمارات بنانی شروع کیں، لیکن ان کے سامنے یہ متعین نہ تھا کہ ادارہ کس قسم کا ہو۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ کسی قسم کا ادارہ قائم کیا جانا چاہئے۔ میں نے ایک خاکہ لکھ کر بھیجا، جو ان خطوط پر تھا جو بعد میں میں نے دارالاسلام کے بارے میں شائع کیا۔

اسی دوران میں انہوں نے علامہ صاحب سے بھی رہنمائی کی غرض سے خط و کتابت کی۔ اس خط و کتابت کی تفصیلات مجھے معلوم نہیں ہیں۔ البتہ یہ مجھے چودھری نیاز علی صاحب سے معلوم ہوا کہ میری تجویز کردہ اسکیم انہوں نے علامہ مرحوم کو دکھائی تھی اور انہوں نے اسے پسند کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس وقت کرنے کے یہی کام ہیں۔ اس سلسلہ کی ساری خط و کتابت چودھری نیاز علی صاحب کے پاس محفوظ ہے اور ان سے حاصل کی جاسکتی ہے، بلکہ وہ غالباً ایک دفعہ شائع بھی کر چکے ہیں۔ تقریباً ۱۹۳۶ء ہی کا زمانہ تھا جب پہلی مرتبہ علامہ صاحب نے مجھے نذیر نیازی صاحب یا میاں شفیع صاحب کے ہاتھ سے خط لکھوایا تھا کہ میں حیدر آباد چھوڑ کر پنجاب میں منتقل ہو جاؤں۔ مگر اس وقت میں نے اظہار معذرت کر دیا تھا کیونکہ اس وقت میں حیدر آباد ہی میں رہنے کا خیال رکھتا تھا، اور وہاں میں نے زمین بھی اس غرض سے خرید لی تھی کہ اس طرح کا ایک ادارہ قائم کروں گا۔ جس کی تجویز انہوں نے کی تھی۔"

"علامہ صاحب نے آپ کو پنجاب آجانے کے لئے کوئی خاص وجہ بھی لکھی تھی۔"

"بس یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں پنجاب چلا آؤں، زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی، اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کی مصلحت کیا ہے، البتہ ۱۹۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے یہ خود

محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رخ کرنا چاہئے۔ اسی زمانہ میں چودھری نیاز علی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے اس مقام کو دیکھ لوں جو انہوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کے لئے وقف کیا تھا۔ میں خود بھی صرف محسوس کر رہا تھا کہ شمالی ہند کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کروں، جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے۔ اسی خیال سے میں نے ،شاید اگست کا آخر تھا، ۳۷ء میں پنجاب کا سفر کیا اور جالندھر اور لاہور سے ہوتا ہوا پٹھانکوٹ پہنچا۔ اس سفر میں علامہ اقبال مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ چودھری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے، میں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم کروں جس کا خاکہ میں نے چودھری صاحب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا''۔

''آپ کو شمالی ہند کو مرکز بنانے کا ارادہ کیوں ہوا؟''

''میں نے یہ محسوس کیا کہ جنوبی ہند میں کام کرنے کے مواقع روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے مستقبل کا فیصلہ بڑی حد تک شمالی ہند میں ہوگا''۔

''آپ کی اور علامہ اقبال مرحوم کی جو تفصیلی گفتگو ہوئی اس میں کون سے مسائل زیادہ زیر بحث رہے''۔

''اس وقت جو گفتگو ہوئی، وہ یہی تھی کہ مسلمانوں کے لئے کس نوعیت کے تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں میرے اور علامہ مرحوم کے خیالات قریب قریب یکساں تھے اور کام کا وہی خاکہ ان کے پیش نظر تھا جو میں نے پیش کیا تھا اسی کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر ہی ہم اس گفتگو میں سوچتے رہے۔ تفصیلات مجھے یاد نہیں رہیں''۔

''کیا اس وقت یہ چیز پیش نظر تھی کہ ہندوستان میں ایک اسلامی تحریک چلائی جائے؟''

''اس وقت تحریک پیش نظر نہ تھی۔ اس وقت دو چیزیں پیش نظر تھیں۔ ایک یہ کہ علمی حیثیت سے ان گوشوں کو پر کیا جائے جن کے خالی ہونے کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی موجودہ زمانے کے لوگوں کو ناکافی اور ناقابل عمل نظر آ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگ تیار کئے جائیں جو مسلمانوں کی فکری اور عملی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں۔ ایک خالص اور جامع اسلامی تحریک کا تخیل اس وقت واضح طور پر سامنے نہیں تھا''

''علامہ اقبال اس وقت عملی میدان میں کون سے کاموں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے؟''

''زیادہ تفصیل یاد نہیں۔ اسلامی قانون اور فلسفہ کی تدوین ان کے پیش نظر تھی۔ اس وقت جو بات ہوئی یہی تھی''۔

''مولانا؛ سنا ہے علامہ اقبال ترجمان القرآن کا خاص طور پر مطالعہ کیا کرتے تھے''

''یہ مجھے بعد میں نذیر نیازی صاحب اور میاں شفیع صاحب سے معلوم ہوا کہ علامہ مرحوم ترجمان القرآن بڑے غور سے پڑھا کرتے تھے اور الجہاد فی الاسلام پڑھوا کر سنی تھی اور بہت پسند کیا تھا''۔

''مولانا اسلامی نقطہ نظر سے اقبال کو کونسی چیز عظمت بخشتی ہے؟''

''اس وقت حقیقت میں ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو مغربی تعلیم پر فخر کرنے والے عام لوگوں سے زیادہ تعلیم پائے ہوئے ہو اور ان سے بڑھ کر ہی مغربی علوم پر نگاہ رکھتا ہو، اور پھر وہ اس پر زور طریقے سے اسلامی نظریات کی تائید کرے کہ مغرب زدہ لوگ اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ علامہ اقبال کا اصل کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس وقت جو مغربی علوم وفنون کا رعب تھا اور ایک عام تصور تھا کہ خالص اسلام اس زمانہ میں نہیں چل سکتا۔ مغربی تہذیب سے کمپرومائیز کرنا ضروری ہے اور اسلامی نظریات کو مغربی نظریات میں ڈھالا جائے۔ اس تصور کو اقبال نے توڑا۔ اس لحاظ سے اس وقت اسلامی تحریک کے لئے اقبال کی شخصیت اہم سہارا تھی۔ بحیثیت مجموعی انہوں نے جو خدمت سرانجام دی وہ بہت اہم اور قابل قدر ہے۔

✿✿✿

# علامہ اقبال•

ابوالحسن ندوی

ایک دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا۔ علامہ مرحوم سے ۱۹۳۷ء میں دوسری ملاقات کی اور کئی گھنٹے ان کے التفات وارشادات سے محظوظ رہا جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ ''عارفِ ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بلادِ عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول جاتا اور ٹیگور کی قدرافزائی پر غصہ آتا۔ علامہ مرحوم کی دفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کے لیے ایک مفصل وطویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی وخصوصیات پر لکھا، اشعار ورِدِ زبان تھے اور ان کی کتابیں ہر وقت کی ہمدم وہم نشین۔ پھر متنبہ ہوا کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں۔ محسوس ہوا کہ یہ ذوق قرآن مجید کے اشتغال اور ذوق پر غالب آرہا ہے۔ رفتہ رفتہ دوسرے مشاغل اور ذوق اس پر غالب آئے لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کردیتے ہیں۔

❁❁❁

• (ابوالحسن ندوی: مشاہیر کی محسن کتابیں، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی صفحہ ۱۸۱، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 265۔

# علامہ اقبال الٰہ آباد میں •

احمد الدین مارہروی

"قوم کی راہ میں ایک سنگ میل آیا اور گزر گیا، مگر اس کی آنکھیں بدستور بند رہیں، کان میں صور اسرافیل پھونکا گیا، مگر وہ خواب گراں سے بیدار نہ ہوئی۔ مفکر اعظم نے صراط مستقیم کی طرف اس کی رہنمائی کی، لیکن وہ پھر بھی گم کردہ راہ ہی رہی"۔

یہ تھے ہم نوجوانوں کے تاثرات جلسہ الٰہ آباد کے متعلق جس میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ نے پہلی مرتبہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور جو عملی جامہ پہن کر جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی شکل میں آج ہمارے سامنے جلوہ گر ہے۔

اس وقت سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ قوم نہ تو کسی کو اپنا واحد لیڈر تسلیم کر سکتی تھی، نہ اسے اپنے قدیم لیڈروں پر اعتماد باقی رہا تھا۔ ان دنوں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس کا کانگریس نے تو بائیکاٹ کر رکھا تھا، لیکن مسلمانوں کے تمام سربرآوردہ لیڈر اس میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ان حالات میں علامہ اقبال کا صدارت کے لئے منتخب کیا جانا بلاشبہ انتہائی دانش مندی پر مبنی تھا۔ کیونکہ اول تو وہ عملی طور پر مسلمانوں کی ان جماعتوں سے غیر متعلق تھے جو ایک دوسرے سے دست و گریبان تھیں۔ دوسرے ہر جوان، بوڑھا، بچہ ان کو بحیثیت شاعر عزت کی نظر سے دیکھتا اور ان کی عظمت کا دل سے معترف تھا۔

ایک چیز جو ہم نوجوانوں کے لئے ناقابل فہم تھی، وہ مقام اجلاس کا انتخاب تھا۔ اکبر

---

• بصد شکریہ، اردو ڈائجسٹ، لاہور، اپریل ۱۹۶۷، بحوالہ رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ، ص 357-362۔

مرحوم نے الہ آباد کے مسلمانوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں یوں ظاہر کیا ہے۔ ؎

اب الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

اور واقعی وہاں مسلمانوں کا کوئی قومی لیڈر تھا ہی نہیں۔ اس کے برخلاف گنگا اور جمنا کے سنگم کی وجہ سے یہ شہر ہندوؤں کا کعبہ سمجھا جاتا تھا اور ہندوستان کے ہر حصے سے زائرین لاکھوں کی تعداد میں اشنان کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ دوسری چیز آنند بھون تھی۔ یہ جواہر لال نہرو کے والد موتی لال نہرو کا شاندار محل تھا جسے انہوں نے گاندھی کے زیر اثر آنے کے بعد قوم کے لئے وقف کر دیا تھا اور اب ''سوراج بھون'' کہلاتا ہے۔ ہندوستان میں کانگریس کا یہی سب سے بڑا مرکز اور سب سے مضبوط گڑھ تھا۔ گاندھی جی یہیں ٹھہرا کرتے تھے اور یہیں بیٹھ کر ہندو اقتدار کی چالیں سوچی جاتی تھیں۔ تیسرا مرکز یونیورسٹی تھی جس پر برہمن ابتداء ہی سے قابض تھے۔ صرف تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر شفاعت احمد خاں مسلمان تھے۔ ان کی مثال بتیس دانتوں میں زبان کی سی تھی۔ لیکن وہ چومکھی لڑتے تھے، نہ کبھی برہمن اقتدار کے آگے سر جھکاتے اور نہ آنند بھون طواف کرتے۔ اردو کم جانتے ہوئے بھی اپنی مادری زبان کے حامی اور اسلامی تعلیم سے نابلد ہوتے ہوئے بھی الہ آباد میں مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر اور جداگانہ انتخاب کے موید تھے۔ مراد آباد کے حلقے سے صوبائی کونسل کے ممبر تھے اور آئینی مسائل کی گہرائیوں میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ سر تیج بہادر سپرو جیسے مقنن بھی ان کی تعریف کرتے تھے۔ اپنے جیب خرچ سے ایک ہفتہ وار اخبار سٹار نکالتے تھے جس کے عملے میں صرف ایک ایڈیٹر رحم علی الہاشمی تھے، باقی مضامین وہ خود ہی لکھتے تھے۔ خبروں کا انتخاب اور ترتیب میرے ذمے تھی۔ میں اس زمانے میں ان کے ماتحت شعبہ تاریخ میں ریسرچ سکالر تھا اور کچھ طبعاً، کچھ حکماً تحقیقات سے زیادہ سیاسیات میں حصہ لیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب سٹار کو ہم دونوں کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن تشریف لے گئے اور مسلم لیگ کے جلسے کے انتظامات کی ذمہ داری اپنے چند رفقائے کار پر عائد کر گئے ہیں جن میں سرفہرست خان بہادر حافظ غضنفر اللہ ممبر کونسل اور ان کے بھائی تھے۔ نشر و اشاعت کا کام ہم لوگوں کے سپرد تھا اور جلسے کی تنظیم، مہمانوں کا استقبال اور

قیام وطعام کی ذمے داری خان بہادر اوران کے ساتھیوں پر تھی۔ ہم نے اخبارات، پوسٹر اور دستی اشتہارات کے ذریعے خوب پروپیگنڈہ کیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ کے نام اوران کے کلام کی عالمگیر مقبولیت نے جادو کا کام کیا اور ''شاعر اعظم'' کے استقبال کے لئے تمام شہر امڈ آیا جس میں مسلمانوں کی ترکی ٹوپیوں، عماموں اور پگڑیوں کے درمیان ہندوؤں کی فیلٹ ٹوپیاں بھی خاصی تعداد میں نظر آتی تھیں۔

الٰہ آباد کے بزرگ کہتے تھے ہم نے اپنی عمر میں اتنا جمع کبھی نہ دیکھا تھا۔ انسانوں کے اس بحر زخار میں ترتیب و تنظیم قائم رکھنا کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے لئے بھی شوار ہوتا، چہ جائیکہ یہاں شروع سے کوئی لیڈر تھا ہی نہیں۔ پلیٹ فارم، پل، مال گاڑی کے ڈبوں کی چھت، حتیٰ کہ سٹیشن کے باہر بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر شخص صرف ایک نظر دیکھنے کا متمنی تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اگلی صف میں پہنچ جائے۔ گہما گہمی نا قابل بیان تھی، لیکن اس جم غفیر کے باوجود بدنظمی بالکل نہیں تھی۔ یہ شاید علامہ مرحوم کا اعجاز تھا۔

ایک صاحب مال گاڑی کے ڈبے پر دوربین لئے کھڑے تھے۔ ان دنوں نہ ریڈیو تھا، نہ لاؤڈ سپیکر، نہ ریڈیو سے آنکھوں دیکھا حال نشر کرنے کی رسم شروع ہوئی تھی۔ وہ اردگرد کے ساتھیوں کو اپنی پاٹ دار آواز میں خیر مقدم اور خوش آمدید کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بتا رہے تھے اور لوگ ان کا بیان اس توجہ اور انہماک سے سن رہے تھے کہ اگر کوئی بیچ میں بولتا، تو اشارے سے اسے خاموش کر دیتے۔ پلیٹ فارم گاہے گاہے شاعر اعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگتا تھا۔

علامہ کے ساتھ چند لوگ اور بھی تشریف لائے تھے جن میں سے ہم صرف سر عبدالقادر کو ''مخزن'' کی وجہ سے پہچانتے تھے۔ باقی لوگوں کو نہ کوئی جانتا تھا نہ کسی نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں جب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے اس کا ذکر چلا تو معلوم ہوا کہ وہ علامہ کے ہمراہ تھے۔

الٰہ آباد کا قصاب طبقہ نہ صرف انتہائی منظم اور با اثر تھا، بلکہ قومی حمیت اور جوش میں بھی سب سے بڑھ کر تھا۔ یہ لوگ جلوس کے موقع پر لاٹھیاں لے کر ایک دستے کی شکل میں چلتے اور معمولی وقفے کے بعد کمال ہم آہنگی سے ان کو نعرہ تکبیر کے ساتھ اس زور سے سڑک پر مارتے کہ نہ فقط زمین دہل جاتی، بلکہ سننے والوں کے دل کی حرکت بھی ایک ساعت کے لئے رک جاتی

تھی۔گاڑی سے پلیٹ فارم پر اترتے ہی ان لوگوں نے نعرہ تکبیر کے ساتھ پورے پلیٹ فارم کو متزلزل کر دیا۔ چند لوگ جوان کی اس ادا سے ناواقف تھے، یکایک بھاگ کھڑے ہوئے اور مجمع میں وقتی طور پر ایک تلاطم سا برپا ہو گیا۔ علامہ قدرے مسکرائے اور جب دور بین والے مبصر نے اعلان کیا کہ شاعر اعظم مسکرا رہے ہیں تو لوگوں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ یہ علامہ کا دوسرا اعجاز تھا۔

یونیورسٹی مسلم ہوسٹل کے طلبہ نے خیر مقدم کے لئے ایک تہنیتی نظم لکھی تھی، اس جدت کے ساتھ کہ ہر شعر ایک جداگانہ رسم الخط میں لکھوا کر علیحدہ فریم کرایا گیا تھا اور پروگرام یہ تھا کہ ایک سرکاری تقریب میں شاعر مشرق کو خوش آمدید کہتے ہوئے ایک ایک شعر سنایا جائے گا اور گیارہ نوجوان شاعروں کی ایک ٹیم یکے بعد دیگرے یہ اشعار ان کی خدمت میں پیش کرے گی لیکن پلیٹ فارم پر اتنا ہجوم تھا کہ تمام شاعر منتشر ہو گئے اور سارا پروگرام القط ہو گیا۔

کچھ اسی قسم کی افتاد اسلامیہ سکول کے ان طالب علموں پر پڑی جنہوں نے شوق عقیدت میں چندہ کر کے ''چین وعرب ہمارا، ہندوستان ہمارا'' کے خالق اور اپنے محبوب شاعر کی خدمت میں چند تحائف پیش کرنے کا پروگرام بنایا تھا، لیکن ناواقفیت کی بناء پر اس کی اطلاع منتظمین کو نہ دی تھی۔ اس بے پناہ ہجوم میں ان کے لئے بھلا کہاں گنجائش نکل سکتی تھی۔ تحائف کے متعلق تو معلوم نہیں کہ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؛ البتہ دھینگا مشتی میں چند طلبہ کے بازو ٹوٹ گئے اور انہیں کئی ہفتے ہسپتال میں گزارنے پڑے۔

خیر مقدمہ کی طرح جلوس بھی نہایت کامیاب رہا۔ راستے میں سڑکوں، درختوں، چھتوں اور دیواروں پر اتنا ہجوم تھا کہ منتظمین کو بھی راہ ملنی مشکل ہو گئی۔ جن لوگوں نے علامہ کی ایک جھلک دیکھ لی، وہ عرصے تک اس پر فخر کرتے رہے اور جو محروم رہ گئے، وہ اپنی بدبختی پر دیر تک رویا کئے۔

(۲)

## تصویر کا دوسرا رخ

الٰہ آباد میں جلسے عموماً میوہال میں ہوا کرتے تھے جو شہر کے باہر ایک وسیع باغ میں واقع تھا۔ مسلم لیگ کا یہ اجلاس بھی وہیں منعقد ہونے والا تھا، لیکن یکایک معلوم ہوا جلسے کا انتظام شہر کے

اندر گرانڈ ٹرنک روڈ پر خسرو باغ کے نزدیک ایک حویلی میں کیا گیا ہے جو بالکل غیر معروف جگہ تھی۔ ہال کوئی نہ تھا، اندرونی صحن، جس میں بمشکل دوسو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوگی، اس تقریب کے لئے موزوں سمجھ لیا گیا تھا۔ مقامی طور پر بھی بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ یہاں جلسہ ہونے والا ہے اور عوام تو غالباً قطعی لاعلم تھے۔ اس تبدیلی کی دو جہیں بتائی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ مقامی گروہ بندی کے سبب مخالف جماعتوں کی طرف سے مظاہرے اور تصادم کا احتمال تھا۔ دوسرے، وقتی سیاست کو دیکھتے ہوئے گمان غالب یہی تھا کہ بہت کم لوگ اس میں شرکت کریں گے۔ باہر سے آنے والے مندوبین اور مہمانوں کے بارے میں دوسو کا تخمینہ لگایا گیا تھا لیکن یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ ان کی تعداد دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔

دوسری مایوسی اس وقت ہوئی جب جلسہ گاہ میں پہنچ کر حاضرین پر نظر پڑی۔ اول تو ہال میں گنجائش ہی کتنی تھی۔ اس پر بھی نصف کرسیاں خالی پڑی ہوئی زبان حال سے قوم کی بے حمیتی کا شکوہ کرتی نظر آتی تھیں۔ دو قطاروں پر کچھ تہمد پوش حضرات قابض تھے جن کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ نہ انگریزی کا ایک لفظ جانتے ہیں نہ ان میں سیاسی مسائل کو سمجھنے کی اہلیت ہے (بعد میں معلوم ہوا یہ لوگ اس جلسے کو مشاعرہ سمجھ کر علامہ کا کلام سننے آئے تھے) شہر میں عمائدین اور دانشور اول تو تھے ہی بہت کم اور جو تھے ان میں سے بھی خال خال ہی نظر آ رہے تھے، لے دے کر مسلم ہوسٹل کے طلبہ کی ایک ٹولی تھی اور وہی غالباً اس صورت حال کی وجہ سے سب سے زیادہ مایوسی کا شکار تھی۔

علامہ کا خطبہ صدارت انگریزی میں چھپا ہوا تقسیم کیا گیا۔ کہنا تو نہیں چاہئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ تو اس کا سر پیر ہی معلوم نہ کر سکے اور انہوں نے نہایت اطمینان سے اس کو ایک طرف رکھ دیا، جو بعد میں طالب علموں کے کام آیا۔ کچھ نے پڑھنے کی کوشش کی، مگر سمجھ نہ سکے اور آخر تک پہلا ہی صفحہ کھولے بیٹھے رہے۔ بعض پہلا صفحہ پڑھ کر کسی افسانے کا انجام معلوم کرنے کے سے انداز میں فوراً ہی آخری صفحے پر پہنچ گئے۔ طالب علموں کے علاوہ بمشکل پچیس تیس حضرات ایسے ہوں گے جنہوں نے علامہ کی تقریر کے ساتھ ساتھ خطبے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس کی باریکیوں اور موشگافیوں کو سمجھا۔ سٹیج پر سے اگر کسی نے تالی بجا دی تو مجمع نے بھی داد دے دی، ورنہ ایک مبہم سی خاموشی اور بے ‌‌‌‌کیفی‌‌‌ سا سکوت طاری رہا۔ دوسرے کارکنوں کے متعلق تو

معلوم نہیں، ہمارا یہ حال تھا کہ شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے...... علامہ جیسی قابل قدر ہستی کو پنجاب سے بلایا گیا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت سونپی گئی، اتنا شاندار استقبال اور جب اس کا موقع آیا کہ وہ حالات کو سدھارنے کے لئے کوئی لائحہ عمل پیش کریں، تو قوم نے سر مہری اور نا اہلیت کا مظاہرہ کیا۔

جلسہ شروع ہوا، شاعر کی آنکھ بڑی تیز ہوتی ہے۔ علامہ نے ایک ہی نظر میں صورت حال کا جائزہ لے لیا۔ حاضرین کی تعداد دیکھ کر مایوسی کا ہلکا سا سایہ ان کے سنجیدہ چہرے پر نمایاں ہوا، لیکن نوجوان طالب علموں کی ایک جماعت دیکھ کر قدرے اطمینان بھی ہوا۔ خودستائی کہئے احساس برتری۔ ہمارا خیال ہے خطبہ صدارت پڑھنے کے دوران میں کسی اہم نکتے پر وہ ہماری طرف ضرور متوجہ ہوتے تھے اور ہمارا جتھا بھی ان کا ایک ایک لفظ سمجھنے میں مصروف تھا۔

علامہ خطبہ پڑھتے جاتے اور جگہ جگہ رک کر کبھی کسی تشریحی جملے سے، کبھی کلام پاک کی آیت اور کبھی حدیث سے مطالب کی وضاحت فرماتے جاتے تھے۔ شروع میں اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کر کے اس کا موازنہ عیسائیت کی کلیسائی تنظیم سے کیا اور بتایا کہ اسلام میں خدا اور نظام کائنات، مادیت اور روحانیت، مذہب اور سلطنت ایک دوسرے میں مد اور ہمارے ہاں روحانیت کے لئے ترک دنیا ضروری نہیں، لیکن اس کے برخلاف یورپ روح اور مادے کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر کے دو عملی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے یورپ میں عیسائیت اور ہندوستان میں اسلام کا موازنہ پوری شرح و بسط کے ساتھ کیا۔

میرے سامنے کی نشست پر ایک بیرسٹر صاحب بیٹھے دیر سے پہلو بدل رہے تھے۔ آخر ان سے نہ رہا گیا تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"It is all Greek to me"

(میرے لئے یہ سب نا قابل فہم ہے)

حسن اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت علامہ نے خطبے سے یہ فقرہ پڑھا: ''مجھے امید ہے آ مجھے اس علمی بحث کے لئے معاف فرمادیں گے'' اس پر بیرسٹر صاحب ایسے خاموش ہوئے کہ آخر تک لبوں پر مہر خاموشی لگی رہی۔ ظاہر ہے جب پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال تھا تو دوسروں کی کیفیت ہوگی۔

جب علامہ نے اکبر اور کبیر کی ان ناکام کوششوں کا ذکر کیا جو انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے کی تھیں۔ تو مجمع میں سے کسی تحریک کے بغیر اللہ اکبر کے نعرے کی صدا بلند ہوئی اور علامہ کی تیوری پر چند بل پڑ گئے۔ کچھ وقفے کے لئے رکے اور خطبے کو میز پر رکھ دیا۔ ظاہر ہے ان کو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی ہوگی کہ حاضرین کی اکثریت ان کے خیالات کو سمجھنے کی اہل نہیں۔

جب اس فقرے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کے اندر ایک اسلامی سلطنت قائم کرنے کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے، تو ایک لمحے کے لئے رک کر انہوں نے تشریحاً ایک عجیب سیاسی اصطلاح استعمال کی جو اس سے قبل ہم نے کبھی نہ سنی تھی۔ انہوں نے فرمایا:

" An imperium in imperio:By this I mean"

ہماری زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ علامہ کا چہرہ دمک اٹھا اور گردن کے اشارے سے انہوں نے یہ داد قبول فرمالی۔

اس کے بعد قدرے بلند آواز سے آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی کے رزولیوشن کی تائید میں وہ تجویز پیش کی جس میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو یکجا کر کے برطانوی سلطنت کے اندر یا باہر ایک مضبوط اسلامی ریاست کے قیام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

یہی وہ تجویز تھی جو آگے چل کر تخیل پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی لیکن اس وقت حاضرین میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہو، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا جو داد علامہ کو کسی ایک شعر پر مل جاتی تھی، اس معرکتہ الارا تجویز پر اتنی بھی نہ ملی، چنانچہ خود ہمارے ایک سربرآوردہ لیڈر نے، جو اس جلسے میں شریک نہ تھے، نہایت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''تعجب کا مقام ہے کہ جب مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ صدائے جرس بلند ہوئی، تو کسی نے اس پر توجہ نہ دی اور نہ کسی نے جلسے میں اس تجویز کے متعلق کوئی رزولیوشن پیش کیا۔''

آخر میں خطبے کو سورہ مائدہ کی اس آیت پر ختم کیا جس کا مفہوم یہ ہے: ''مسلمانو، اپنی حفاظت خود کرو، جب تک تم سیدھے راستے پر ہو کوئی گمراہ تم کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا''۔

اس وقت تک جلسہ گاہ کی تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں اور جن لوگوں کو جگہ نہ مل سکی تھی، وہ دائیں بائیں یا پیچھے صف بستہ کھڑے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اقبال کو صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے اور اسی نظر سے انہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ابھی وہ بیٹھے بھی نہ تھے کہ ایک عجیب مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی۔ حاضرین نے یک زبان ہو کر مطالبہ کیا، کوئی غزل سنائیے، دراصل ان کا مطلب نظم سے تھا۔ علامہ اس موقع پر شعر خوانی کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ جب بہت اصرار ہوا تو بادل نخواستہ بہت تھکی اور پست آواز میں خودی کے متعلق چند اشعار سنائے جس سے مجمع کی تشنگی بجھ نہ سکی اور دوبارہ مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس وقت تک وہ بھی ہوشیار ہو چکے تھے۔ بہت پر خلوص لہجے میں کہنے لگے: ''اب میں ایک حدیث سناؤں گا اور اگر آپ لوگوں نے اس پر غور کیا تو قوم کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

(یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا)

اتنا کہہ کر علامہ بیٹھ گئے اور لوگوں نے دروازے کا رخ کیا۔ جلسہ خود بخود برخاست ہو گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ خود مجھے بھی معلوم نہ ہو سکا۔ اگلے دن اخبارات نے خطبے کی صرف چند سطریں شائع کر دیں اور بس بات رفت و گزشت ہو گئی۔ سٹار نے بہت تفصیل سے خیر مقدم، جلوس اور جلسے کا حال شائع کیا، لیکن اس کو پڑھنے والے تھے ہی کتنے! دو سو بھی اشاعت نہ تھی، اس لئے بیرونی دنیا کو تو بہت ہی کم علم ہو سکا۔

(۳)

اس واقعے کو ۳۶ برس گزر چکے ہیں، علامہ اقبال کی تجویز کو عملی جامہ پہنے بھی بیسواں برس ہوا لیکن جن لوگوں نے اس خطبے کو گہری نظر سے دیکھا ہے، وہ علامہ کی سیاسی دور بینی اور فہم و ادراک کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، مثال کے طور پر ہندو ہایت فخریہ کہتے ہیں کہ پنجاب کی تقسیم کا تخیل سب سے پہلے بھارت کے سابق صدر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب Indian Divided میں تقسیم ملک سے کچھ پہلے پیش کیا تھا، لیکن اس خطبے میں علامہ نے بالکل صاف الفاظ میں کہا ہے کہ انبالہ ڈویژن اور ملحقہ اضلاع غیر مسلم آبادی کی بناء پر پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے، پنجاب کا علاقہ دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ اسی طرح ہندوستان کو اس وقت تک نہ کوئی

برعظیم کہتا تھا نہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اتنا وسیع علاقہ ایک ملک نہیں بلکہ ایک چھوٹا براعظم ہے۔ علامہ نے اگرچہ یہ اصطلاح تو استعمال نہیں کی، لیکن دنیا کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی ہے کہ اس علاقے کے خیر و شر پر تمام ایشیا کے مستقبل کا دارومدار ہے اور یہ دراصل ایک برعظیم ہے، چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس صورت حال کو روس اور امریکہ بھی تسلیم کر چکے ہیں۔

سب سے بڑھ کر بھارت آج جس روش پر گامزن ہے اور جو افراتفری وہاں لسانی، نسلی اور علاقائی خودمختاری کے نام پر ہو رہی ہے، اس کو بھی علامہ کی دوررس نظروں نے دیکھ لیا تھا اور نہ صرف دیکھ لیا تھا بلکہ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کی آب و ہوا، نسلوں، مذہبوں اور معاشرتی نظاموں میں لامتناہی اختلافات کو دیکھتے ہوئے اس کے لئے ایک مستحکم آئینی ڈھانچہ صرف اس صورت میں تیار ہو سکتا ہے کہ زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفادات کی بناء پر چھوٹی چھوٹی خودمختار مملکتیں بنا دی جائیں، چنانچہ وہاں گاہے گاہے اس قسم کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ کبھی ناگا آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں، تو کبھی میزو آسام کے پہاڑی اضلاع میں اپنی جداگانہ ریاست تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔...... دکن کے دراوڑ، نسلی اور لسانی اختلاف کی بنیاد پر شمالی ہندوستان کے مقابلے میں جنوبی ہند کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ اگر پرتگال کے سابقہ مقبوضات میں عیسائی اپنی وحدت قائم رکھنے پر تلے ہوئے ہیں، تو سکھ پنجابی صوبے کے نام پر اپنی بانسری الگ بجا رہے ہیں، لیکن ابھی تک ہندوستان اس مسئلے کو علامہ کے زاویہ نظر سے دیکھنے کو تیار نہیں اور ہو بھی کس طرح۔ علامہ جیسی چشم بصیرت کہاں سے لائے۔ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❀❀❀

# فیضانِ اقبال●(۱)

اسد ملتانی

کچھ دن ہوئے میں اپنے متفرق مسودات کا جائزہ لے رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ان میں ایک ایسی تحریر مل گئی جس میں حضرت علامہ اقبال سے ایک ملاقات کا مفصل حال درج تھا۔ اسے دیکھ کر اس وقت کی یاد تازہ ہوگئی جب مارچ ۱۹۳۳ء میں وہ جامعہ ملیہ میں غازی رؤف پاشا(۲) کی ایک تقریر کے موقع پر جلسہ کی صدارت کرنے کے لیے دہلی تشریف لائے (۳) اور ڈاکٹر انصاری مرحوم (۴) کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ میں محترمی جناب امداد حسین صاحب اخگر مرادآبادی (۵) اور عزیز دوست مولوی محمد احمد ندوی (جو ۱۹۳۶ء میں عین جوانی میں فوت ہو گئے) کے ہمراہ ان سے ملنے گیا۔ ۹ بجے صبح سے کوئی بارہ بجے تک نہایت دلچسپ علمی صحبت قائم رہی۔ اسی روز وہ سر عبداللہ سہروردی مرحوم (۶) کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ جب ادھر سے ٹیلی فون پر ٹیلی فون آنے لگے تو بادل نخواستہ یہ مجلس ختم کرنی پڑی ورنہ جس توجہ سے وہ ہم سے گفتگو فرما رہے تھے اس کے پیش نظر ہم ابھی کچھ دیر اور ان کے ارشادات سے فیض یاب ہوتے رہتے۔

میں نے ملاقات کا حال غالباً اسی روز لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن افسوس کہ نا تمام رہ گیا اور کچھ عرصے کے بعد مسودہ ایسے کاغذات کے ساتھ غلط ملط ہو گیا کہ پھر اس کا خیال تک نہ رہا۔

اس ملاقات میں کچھ تو اہم علمی مسائل زیر بحث آئے اور کچھ عام باتیں ہوئیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جن کا بعض حضرات نے اپنی ملاقاتوں کے بیان میں ذکر کیا ہے لیکن جی نہیں چاہتا کہ اس کے سبب میں اپنے نامکمل بیان میں بھی قطع و برید کر دوں، لہٰذا بے کم و کاست

● بصد شکریہ، جعفر بلوچ، اقبالیات اسد ملتانی، بحوالہ جعفر بلوچ، مجالس اقبال، ص 193۔207۔

پیش کیے دیتا ہوں۔

حضرت علامہ سے بعض دوسری ملاقاتوں کے بھی کچھ حالات حافظے میں محفوظ ہیں۔ اگر کبھی توفیق ہوئی تو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔(اسد ملتانی)

## ۱۳ مارچ ۱۹۳۳ء

آج ۹ بجے صبح جناب اخگر مراد آبادی، مولانا محمد احمد ندوی اور میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دارالسلام واقع دریا گنج میں ڈاکٹر سر اقبال سے ملنے گئے۔

اخگر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شان میں ایک انگریزی نظم لکھی تھی جو ایک روز پہلے مولانا شفیع داؤدی کے حوالے کردی گئی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کل شام آپ کی نظم مولانا شفیع داؤدی نے مجھے دی۔ ابھی تک میری جیب میں ہے، دیکھ نہیں سکا۔

## زبان

اخگر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں، انگریزی ہماری زبان نہیں۔ ممکن ہے اس میں غلطیاں ہوں مگر اصل مقصد ان جذبات کا اظہار ہے جو آپ کی نسبت میرے دل میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے کہ مولانا! زبان کی کچھ پروا نہیں، زبان تو اہل فکر خود پیدا کرتے ہیں۔ اہل زبان کے متعلق تو اتنا سمجھتا ہوں کہ انھیں چکی چولہے کے الفاظ کافی تعداد میں معلوم ہوتے ہیں ورنہ علمی خیالات کے اظہار کے لیے اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو خیالات کے مطابق الفاظ تراشنے پڑتے ہیں۔ مرزا بیدل (۷) کی فارسی کو اہل زبان نے کبھی تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ محاورات تک نئے پیدا کر لیتے ہیں مثلاً ان کا مصرعہ ہے:

بر ہر قدمے خرام می کاشت

''خرام کاشتن'' فارسی میں کوئی محاورہ نہیں مگر جو خیال بیدل کے ذہن میں تھا، اس کو ادا کرنے کے لیے لازمی تھا کہ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے کیونکہ ان کے علاوہ اور کوئی الفاظ فارسی زبان میں اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جس طرح مذہب میں تقلید سے کام لیا جاتا ہے، اسی طرح ادبیات میں بھی تقلید کی جاتی ہے۔ مانا کہ محاورے میں کسی حد تک اہل

زبان کی پیروی مناسب ہے مگر لطف تو یہ ہے کہ ترکیب اور استعارے میں بھی اساتذہ کی سند طلب کی جاتی ہے۔ اگر یہ خیال رکھا جائے تو جدت واختراع کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔

## وضع الفاظ

میں نے کہا کہ بالعموم جدت ترکیب واستعارہ پر اعتراض نہیں ہوتا بلکہ اس امر پر کہ ایک غیر اہل زبان اظہار خیال کے لیے کوئی نیا لفظ یا محاورہ پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ اصل زبان میں اس کے لیے پہلے بھی لفظ یا محاورہ موجود ہوتا ہے۔ کہنے لگے، ہاں۔ جب زبان میں اچھا لفظ اسی مفہوم میں ادا کرنے کے لیے موجود ہو تو نیا لفظ تراشنا غیر ضروری ہے لیکن اگر کوئی ایسا کر بھی دے اور لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں بھی نہ ہو تو میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ البتہ یہ شرط ہے کہ وہ نیا لفظ کسی ہم جنس زبان کا ہو جیسے اردو میں عربی، فارسی، پنجابی وغیرہ کا لفظ کھپ سکتا ہے مگر لاطینی وغیرہ کا نہیں۔

## اقبال کی فارسی

میں نے کہا: "آپ نے فرمایا ہے کہ لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں نہ ہو۔ کیا سماعت کی اس تربیت کے لیے زبان کے بکثرت مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔" فرمایا "میں اس صفت کو ایک عطیۂ قدرت سمجھتا ہوں۔ فارسی میں میری رسمی تعلیم صرف میٹرک تک ہے یا اس سے پہلے کچھ مکتبوں میں پڑھی مگر اب جو میں فارسی میں لکھتا ہوں اور کسی محاورے کے متعلق شک گزرتا ہے اور اس وقت کوئی لغت یا کتاب پاس نہیں ہوتی تو اپنے کانوں پر بھروسہ کرتا ہوں۔ جو الفاظ کانوں کو بھلے معلوم ہوں، وہی رکھ دیتا ہوں اور ہمیشہ دیکھا ہے کہ بعد میں وہی محاورات درست ثابت ہوئے ہیں۔"

اس موقع پر اخگر صاحب نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ کے فارسی کلام پر بھی کبھی اہل زبان نے کچھ رائے ظاہر کی ہے؟ بولے کہ اعتراض کرتے ہوں گے لیکن مجھ تک کبھی نہیں پہنچے۔ البتہ بعض اہل زبان سے تعریف سننے میں آئی ہے۔

میں نے کہا کہ امیر خسرو (۸) پر بھی اہل فارس نے یہی اعتراض کیا ہے کہ وہ فارسی میں ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً ع

عالم بہ منت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

میں ''منت'' کا لفظ ان معنوں میں نہیں جن میں یہ فارسی زبان میں مستعمل ہے۔ بولے ''ہاں! مگر یہ بات بھی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی لفظ ہندوستان اور ایران میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے لفظ ''تنخواہ'' سے ہم کیا مراد لیتے ہیں اور وہ کیا۔''

## اردو میں پنجابی

اسی سلسلے میں فرمایا ''میرا ہمیشہ ایسا خیال رہا ہے کہ پنجاب میں طلبہ کے لیے جو اردو کورس ہوں، ان میں حسب ضرورت پنجابی کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ مثلاً مولانا آزاد(۹) نے اپنے قاعدے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ ''لیزم ہلاؤ'' دہلی میں تو یہ لفظ بچے بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں مگر پنجاب میں بچے تو کیا سمجھیں گے، استاد بھی اس کے معنی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس کے بجائے کوئی ایسا نام استعمال ہوتا جو اردو کا نہ سہی لیکن پنجاب میں عام ہوتا تو یقیناً زیادہ مفید رہتا۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے پنجاب میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ زراعت کی کتابوں میں بالخصوص پنجابی کے الفاظ بے تکلف استعمال کیے جائیں۔''

## مغرب کی تقلید

میں نے سوال کیا کہ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ہمیں مغربی تہذیب کی نقل نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس سے اس کی فضیلت کا عملی اقرار ہوتا ہے جس کے ہم اصولاً خلاف ہیں۔ ادھر ہم کہتے ہیں کہ مغربی علوم وفنون، تہذیب وتمدن کی بنیاد ہم نے رکھی۔ گویا ہم تمدن وترقی کو ایک خاص مقام پر پہنچا کر ٹھہر گئے۔ اہل مغرب نے وہیں سے لے کر اسے آگے ترقی دی۔ اب چند صدیوں کے ہم جو جاگے تو اہل مغرب کو کہیں سے کہیں پہنچا ہوا پایا۔ کیا اس وقت ہمیں اپنی قوت تخلیق سے کام لے کر اس مقام سے اپنی ترقی کی منزل شروع کرنی چاہیے جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا یا وہاں سے جہاں اسے اہل مغرب نے اس وقت پہنچا رکھا ہے؟ کیا مناسب نہ ہوگا کہ پہلے وہ سب کچھ حاصل کر لیں جو اہل مغرب معلوم کر چکے ہیں اور پھر اپنی قوت تخلیق کو بروئے کار لا کر آگے ترقی کریں؟ میرا خیال ہے کہ ترک اس وقت اسی چیز پر عمل کر رہے ہیں۔

## ترکوں کا رویہ

فرمایا کہ نقل اور اخذ میں بہت فرق ہے۔ ترک نقل کر رہے ہیں، نہ کہ اخذ۔ نقل سے قوت تخلیق کمزور ہو جاتی ہے مگر اخذ ترقی کے لیے لازمی ہے۔ مغرب نے جو نئی تخلیقات اور ایجادات کی ہیں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان کو فوراً اخذ کر کے اپنی مزید ترقی کی بنیاد رکھیں۔ ایک یہ امر بھی مدنظر رہے کہ تقلید اور نقالی علوم سائنس میں مذموم نہیں بلکہ ضروری ہے لیکن مذہب، اخلاق اور تمدن میں یہ زہر کا حکم رکھتی ہے۔ مثلاً ترکوں کو دیکھیے، انھوں نے (ہیٹ) Hat کو علامت ترقی سمجھ لیا ہے حالانکہ اصل چیز جو لازمہ ترقی ہے، وہ ہیٹ کے نیچے ہے۔

میں نے غازی رؤف بے اور ترکوں کے متعلق دریافت کیا تو بولے کہ غازی رؤف بے، مصطفیٰ کمال سے اختلاف کے باعث مدت سے فرانس میں رہتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال ان کو بارہا ترکی آنے کی دعوت دے چکے ہیں۔ یہ نہیں جاتے۔ ایک تو انھیں اعتماد نہیں۔ دوسرے اپنا وہاں جانا بے سود سمجھتے ہیں کیونکہ ترکی مجلس قومی میں حکومت کی مخالف جماعت کا کوئی وجود نہیں اور کوئی شخص مصطفیٰ کمال کے خیالات کے برخلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔

ترکی کی موجودہ حالت کے متعلق فرمایا کہ میں فوزی پاشا اور منیر بے ایسے بڑے بڑے آدمیوں سے ملا اور ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ترک مصطفیٰ کمال کی بدعات سے خوش نہیں ہیں۔ بلا مبالغہ تقریباً ۹۷ فیصد لوگ مصطفیٰ کمال کے مخالف ہیں۔ ایک آدھ دفعہ اس پر قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں اور کچھ زیادہ بعید نہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ترک زیادہ سے زیادہ اس کی زندگی تک اس کے استبداد کو ناچار گوارا کر لیں گے۔ اس سے زیادہ دیر تک ہرگز نہیں۔ ردعمل ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔(۱۱) ترک نوجوان اسے سلطان عبدالمجید (۱۲) سے بھی زیادہ مستبد سمجھتے ہیں۔ صرف اس کی خدمات کا خیال اور خانہ جنگی کا اندیشہ ہے جو ترکوں کو کسی جارحانہ اقدام سے باز رکھتا ہے ورنہ ترک ویسے ہی پکے مسلمان ہیں جیسے ان کے آباؤ اجداد تھے اور وہ تفرنج (مغربیت) کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مختصر یہ کہ ترکی کا مستقبل کسی صورت میں بھی مایوس کن نہیں ہے۔

## اسلام کا مستقبل

یہاں سے سلسلۂ کلام تہذیب مغربی اور اسلام کے تصادم کی طرف چل پڑا۔ فرمانے لگے کہ یورپ کے سفر کے دوران میں (۱۳) میں نے دیکھا ہے کہ یورپ میں خواص کے علاوہ اب عوام میں بھی اسلام کے متعلق دلچسپی اور تجسس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ادھر مشرق میں مغربی تہذیب کا اثر ترقی پر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامی تہذیبوں میں صلیبی جنگوں نے جو تفریق ڈال دی تھی، وہ اب دور ہونے والی ہے اور مشرق و مغرب پھر بغلگیر ہوں گے۔ میں نے کہا، اغلب ہے کہ ایسا ہو جائے مگر کیا اسلام مغربی تہذیب کو اپنا لے یا مغربی تہذیب اسلام کو جذب کر لے؟"

بولے ہاں عقلی طور پر تو دونوں صورتیں ممکن ہیں مگر ہمارے عقیدے اور اسلام کی گزشتہ تاریخ کی رو سے پہلی صورت ہی کی تائید ہوتی ہے۔ عقیدۃ توانا لہ لحفظون (۱۴) کا وعدہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اسلام ہی غالب آئے گا۔ ساتھ ہی اسلام کی تاریخ صاف صاف بتاتی ہے کہ اسلام کے مقابلے میں مختلف تہذیبیں آئیں مگر اسلام نے مقابلہ کیے بغیر ان کو اپنا کر ان پر ایسی مہر ثبت کی کہ وہ خود اسلامی تہذیب کا جزو بن گئیں۔ یونان اور ایران کی تہذیبیں دونوں اسلام میں جذب ہو کر گویا "مسلمان" ہو گئیں۔ اسی طرح اغلب یہی ہے کہ مغربی تہذیب بھی اسلام میں جذب ہو کر اسلامی ہو جائے گی۔ قیاس یہی کہتا ہے، آگے خدا کو معلوم کیا ہوگا۔ کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

## فلسفہ اور مذہب

یہاں پہنچ کر میں نے اپنی نظم "سوال بہ اقبال" (۱۵) یاد دلائی اور کہا کہ میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے انگریزی خطبات (۱۶) کا مطالعہ کیا۔ بعض نکات کچھ صاف ہو گئے مگر کچھ ابھی باقی ہیں۔ اس پر فرمایا کہ نہیں جو آپ کہتے ہیں کہ صاف ہو گئے ہیں وہ بھی صاف نہیں ہوئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا۔ فلسفے کا کام تو یہ ہے کہ آج چند مشاہدات پر بنیاد رکھ کر ایک خیال (Concept) قائم کیا جاتا ہے جو یقینی نہیں بلکہ صرف ممکن (Possible) ہوتا ہے۔ کل ماحول مختلف ہو جاتا ہے، نقطہ نظر بدل جاتا ہے تو ایک

دوسرا (Concept) قائم کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ انسان بڑھتا چلا جاتا ہے مگر کسی منزل تک نہیں پہنچتا۔ اگر فلسفہ انسان کی تسکین کر سکتا تو مذہب کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے مذہب کا وجود ہے۔ Religious Experience (حاسہ مذہبی) کم از کم فرد کی تسکین ضرور کر دیتا ہے۔ ہمارے صوفیاء کرام رحمہم اللہ نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ یہ حاسہ مذہبی معانقہ و توجہ سے ایک فرد سے دوسرے فرد میں منتقل کیا جائے۔ بالخصوص نقشبندیہ اور مجددیہ سلسلے کو اس میں کامیابی بھی ہوئی۔ میں نے پوچھا ''یہ آپ محض منقولات پر اعتبار کرتے ہوئے فرما رہے ہیں یا تجربہ درست سمجھتے ہیں؟'' بولے کہ ''ان کی صحت میں مجھے بالکل شک نہیں۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہوتا کیونکر ہے۔ ممکن ہے کہ علم نفسیات ترقی کر کے اس راز کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔''

میں نے سوال کیا کہ آخر اس حاسۂ مذہبی کے حصول کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ بولے ''آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے؟'' میں نے کہا ''بی اے کا۔'' بولے کہ اس کے لیے کتنا وقت صرف کیا؟ میں نے کہا: ''چودہ برس۔'' کہنے لگے ''تو کم از کم کچھ سال تو اس طرف بھی لگائیے۔ یونہی کیوں کر حاصل ہو سکے؟'' میں نے کہا، ''یہ تو بے شک درست ہے مگر ایسے شخص نظر نہیں آتے جو راہنمائی کر سکیں۔ آپ نے خود بھی تو صوفی کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ:

خبر منزل لیلیٰ نہ تو داری و نہ من''

## غیر معمولی انسان

مسکرا کر کہنے لگے کہ یہ من حیث الجماعت لکھا ہے اور واقعی اس وقت صوفیا کا یہی حال ہے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ Genius (غیر معمولی انسان) ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ کبھی زیادہ اور کبھی کم۔ آج کل بھی ایسے شخص ضرور ہوں گے اور ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب جماعت روبہ ترقی ہوتی ہے تو اس میں بکثرت Genius پیدا ہوتے ہیں اور انحطاط کے زمانے میں کم۔ ترقی پذیر جماعتوں میں اگر ایک غیر معمولی انسان اٹھ جاتا ہے تو فوراً اس کی جگہ پُر کرنے کو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے لیکن روبہ انحطاط جماعتوں میں ایک Genius اٹھ جانے سے وہ جگہ خالی ہی رہتی ہے۔

میں نے کہا کہ جماعت کی اصلاح Genius کی کثرت پر موقوف ہے اور بقول آپ

کے Genius بکثرت اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب جماعت رو بہ ترقی ہو تو یوں کہنا چاہیے کہ انسان کا اختیار کچھ بھی نہیں۔ قدرت جب چاہتی ہے جماعت کو ترقی دے دیتی ہے اور جب چاہتی ہے گرا دیتی ہے۔ یہ تو Fatalism (جبریت) ہوئی۔ بولے ''اس میں کیا شک ہے Fatalism سے قطعاً انکار نہیں ہو سکتا۔ سائنس بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے۔ اگرچہ وہ اس لفظ سے ڈرتی ہے کہ اس کی جگہ Predestination (مقدر) کا لفظ استعمال کرتی ہے، مگر بات ایک ہی ہے۔

Genius کی پیدائش کے متعلق ابھی تک انسان کچھ نہیں معلوم کر سکا۔ خبر نہیں قانونِ حیات کے اسرار کیا ہیں؟ ممکن ہے کہ آئندہ چل کر انسان کچھ زیادہ معلومات بہم پہنچا سکے۔ سردست تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سمندر کبھی کبھی لہروں کے ساتھ موتی اچھال کر کنارے پر پھینک دیتا ہے اسی طرح فطرت بھی کبھی کبھی Genius اچھال دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ زندگی بھی ''مقادیر برقیات'' Quantum کے مطابق قطع سفر کرتی ہے۔'' میں نے کہا ''یعنی اچھل اچھل کر چلتی ہے؟'' فرمایا ''ہاں! بالکل اسی طرح۔''

## عالم اسلام

عالم اسلام کے متعلق فرمایا کہ پچھلی چند صدیوں میں اسلام کا زمانۂ انحطاط رہا ہے۔ اس لیے اعلیٰ شخصیتیں بہت وقفے کے بعد پیدا ہوئیں۔ مثلاً امام غزالی (۱۸) مولانا روم (۱۹) اور شاہ ولی اللہ (۲۰) جیسی ہستیاں مگر کچھ عرصے سے رنگ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اعلیٰ ہستیاں پے بہ پے پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً سر سید احمد خاں (۲۱)، جمال الدین افغانی (۲۲)، قاضی اعظم جان (روس) (۲۳) مفتی محمد عبدہ، (۲۴) سعد زاغلول پاشا (۲۵) اور موجودہ زمانے میں امان اللہ خاں (۲۶)، رضا شاہ، (۲۷) مصطفیٰ کمال، (۲۸) ابن سعود (۲۹) وغیرہ یہ سب اس امر کی علامت ہیں کہ اسلام میں دوبارہ ترقی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور ممکن ہے بہت جلد کوئی غیر معمولی انسان پیدا ہو کر عظیم الشان انقلاب کا باعث ہو۔

## مرد منتظر

یہاں پہنچ کر میں نے سوال کیا کہ آپ کے اس خیال کے متعلق طرح طرح کے شکوک

ظاہر کیے جاتے ہیں کہ آپ اعلیٰ انسان کے منتظر ہیں جیسا کہ آپ نے ''اسرار و رموز'' میں بھی فرمایا ہے:

اے سوار اشہب دوراں بیا

اس سے کیسی شخصیت مراد ہے؟ کیا آپ پیغمبر ﷺ کے بعد کسی اور انسان کامل کی توقع بھی رکھتے ہیں؟ بولے ''ہرگز نہیں۔ میں دوسروں، بالخصوص اہل شیعہ کی طرح کسی خاص انسان کے انتظار میں نہیں اور نہ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی انسان کامل کی توقع ہو سکتی ہے۔ میں نے جس کی تمنا ظاہر کی ہے وہ یہی اعلیٰ قسم کی ہستیاں ہیں جو آ کر سوسائٹی کو بلند کر دیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک ہی ہستی ہو بلکہ ممکن ہے کہ ایک قوم کی قوم ہو۔'' میں نے کہا ''آپ کے مصرع مذکور سے تو ایک ہی انسان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔'' بولے ''نہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ ایک ایسی قوم کی توقع ظاہر کرتے ہوئے میں شاعرانہ زبان میں ان الفاظ کے علاوہ اور کیا الفاظ استعمال کر سکتا تھا؟''

## مکتوبات مجدد سرہندی

سلسلۂ گفتگو پھر تصوف کی طرف مڑا۔ فرمانے لگے کہ تصوف کا علم پرانا اور کسی قدر نکما ہو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ زمانۂ حاضر کے علم نفسیات کی روشنی میں اس کی پھر تجدید کی جائے۔ اس کام میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ (۳۰) کی تحقیقات بہت امداد دے سکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے مکتوبات و ملفوظات کا ایک منتخب ایڈیشن شائع کیا جائے۔ جو (مجموعہ) اس وقت موجود ہے اس میں بہت سی کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے کیونکہ انھوں نے اپنے معتقدین کے ہر قسم کے سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ بعض نہایت عام فقہی مسائل ہیں اور بعض نہایت اہم صوفیانہ نکات۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انھی صوفیانہ نکات کا انتخاب علیحدہ شائع کیا جائے اور پھر اس کی بنا پر موجودہ نفسیات کی روشنی میں جدید علم تصوف کی بنیاد ڈالی جائے۔

## مقصد حیات

اخگر صاحب نے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ بولے ''اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ویسے زندگی خود بخود کوئی نہ کوئی مقصد متعین کر لیتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرتی ہے۔''

# فہم قرآن

مولانا محمد احمد نے پوچھا کہ قرآن کس طرح پڑھنا چاہیے؟ میں نے ندوہ کا امتحان پاس کیا ہے اور مجھ پر قرآن شریف کی تعلیم کے متعلق کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں مگر حال یہ ہے کہ مختلف بزرگ مختلف راستوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً ترجمان القرآن ایک نقطہ خیال پیش کرتا ہے اور آپ کا کلام دوسرا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی راہ اختیار کی جائے؟ سن کر اخگر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "مولانا! یہ وہی آپ کی رباعی والا مضمون ہے:

تفسیر نے قرآں کو چھپا رکھا ہے (۳۱)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے بہترین ذریعہ اپنا ضمیر ہے۔ اس کے متعلق مجھے اپنے والد مرحوم کا قول یاد ہے بلکہ اسی قول نے میری زندگی پر بہت کچھ اثر بھی ڈالا۔ واقعہ یوں ہے کہ میں ابھی سکول میں تھا یا کالج کی پہلی جماعت میں، جب ایک صبح والد مرحوم میرے کمرے میں آئے۔ میں حسب معمول قرآن شریف کی رسمی تلاوت کر رہا تھا۔ پوچھنے لگے کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے کیا مطلب ہے جبکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ میں قرآن پڑھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ قرآن پڑھ رہا ہوں۔ کہنے لگے "ہاں! مگر قرآن شریف میں کیا پڑھ رہے ہو؟ کچھ سمجھتے بھی ہو یا یونہی پڑھتے چلے جاتے ہو؟" میں نے کہا "تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں اور کچھ نہ کچھ مطلب بھی سمجھتا ہوں۔" بولے "نہیں۔ قرآن شریف کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک یہ اسی طرح نازل نہ ہو جیسے رسول پاک ﷺ پر نازل ہوا تھا۔"

میں یہ سن کر متعجب ہوا کیونکہ اس فقرے کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکا لیکن یہ فقرہ میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا اور ایک عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی اس میں ایک بڑی رمز پنہاں ہے اور اب تو میں اس کی صداقت کا پوری پوری طرح قائل ہوں۔ یہی نقطہ خیال میری زندگی پر بہت کچھ اثر انداز بھی ہوا ہے۔ واقعی انسان کے ضمیر کی نشوونما اس قدر ہونی چاہیے کہ قرآن شریف کی حقیقت کو اسی طرح سمجھے جس طرح آنحضرت ﷺ محسوس فرماتے تھے اور ایسا معلوم ہو کہ قرآن براہ راست نازل ہو رہا ہے۔

❁❁❁

## حواشی از جعفر بلوچ

(۱) یہ مضمون پہلی بار ماہنامہ طلوع اسلام کے شمارۂ مئی ۱۹۴۱ء میں چھپا تھا۔ یہی مضمون جناب اختر راہی نے ماخذ کا حوالہ دیے بغیر بزم اقبال کے سہ ماہی مجلہ ''اقبال'' کے اپریل ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں شائع کرایا تھا۔ جناب اختر راہی نے مضمون کا عنوان بھی بدل دیا تھا اور اس کا نیا عنوان ''اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق'' قائم کیا تھا۔ موصوف نے زیرِ نظر مضمون کے متعلق جناب اسد کا تمہیدی نوٹ بھی حذف کر دیا تھا اور متن میں جابجا ''اصلاحیں'' بھی دی تھیں۔ اب یہ مضمون طلوع اسلام کے محولہ بالا متن کے مطابق شائع کیا جا رہا ہے۔ البتہ حواشی میں جو اضافے جناب اختر راہی نے کیے تھے، ان سے بعض مقامات پر میں نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کے لیے میں جناب راہی کا ممنون ہوں۔

(۲) غازی رؤف پاشا کا اصل نام رؤف بے تھا۔ وہ ۱۸۷۱ء میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مظفر پاشا عثمانی بحریہ کے رکن تھے۔ چنانچہ رؤف بے کو بھی بحریات کی تعلیم دلائی گئی۔ تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد آپ جہاز ''مجیدیہ'' پر متعین ہوئے۔ جنگ بلقان کے دنوں میں آپ جہاز حمیدیہ کے سپہ سالار تھے اور دورانِ جنگ میں انھوں نے اعلیٰ فوجی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے کمتر وسائل کے باوجود یونان کی تباہ کن کشتیوں پر حملہ کیا اور انہیں درہ دانیال سے مار بھگایا۔ ''حمیدیہ'' نے دشمنوں کو ہراساں کر دیا تھا۔ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کے قبضہ کے بعد رؤف بے مجلس ملیہ (انگورہ) کے قیام میں شریک ہوئے اور مجلس ملیہ کی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۲ء کو حکومت ملیہ نے انھیں ''پاشا'' کا خطاب دیا۔ ترکی میں قومی حکومت بننے کے بعد بعض امور میں مصطفی کمال (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۳۸ء) سے ان کا اختلاف ہو گیا اور انھوں نے ملک چھوڑ کر فرانس میں سکونت اختیار کر لی۔ اوائل ۱۹۳۳ء میں آپ ہندوستان آئے اور جامعہ ملیہ دہلی میں توسیعی لیکچر دیے۔
مصطفی کمال نے جلاوطن ترک رہنماؤں کو وطن واپس آنے کی دعوت دی تو رؤف پاشا بھی وطن گئے اور وزارت بحریہ کے نگران مقرر ہوئے۔ بعد ازاں خرابی صحت کی بنا پر اس منصب سے علیحدہ ہو گئے

اور مجلس ملیہ کے رکن منتخب ہوئے۔ (ملخص از۔عبدالمجید عتیقی ،ترکان احرار،طبع ہشتم)

(۳) حضرت علامہ ۱۸ مارچ کی صبح کو دہلی پہنچے اور غازی رؤف پاشا کے لیکچروں کے سلسلے میں اٹھارہ اور بیس مارچ کو منعقد ہونے والے دو جلسوں کی صدارت فرمائی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں مکتوبات اقبال مرتبہ نذیر نیاز ایڈیشن ۱۹۵۷ء۔صفحہ ۹۶ تا ۱۰۱۔

(۴) ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء) مسلمانوں کے معروف قومی رہنما تھے۔وہ ضلع غازی پور کے ایک قصبہ یوسف پور کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ڈاکٹر انصاری نے بنارس سے ایف اے اور ریاستی کالج حیدرآباد دکن سے بی اے کیا۔لندن سے ایم اے کے سی اور آر سی پی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وہیں ایک بڑے ہسپتال میں ہاؤس سرجن ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں انگلستان سے واپس آ کر چاندنی چوک دہلی میں اپنا دواخانہ قائم کیا۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ایک طبی وفد تشکیل دیا جو انھی کی سربراہی میں بلقان کی جنگوں میں ترکوں کی امداد کے لیے ترکی گیا۔سید سلمان ندوی نے لکھا ہے کہ جب یہ وفد رخصت ہونے لگا تو علامہ شبلی نعمانی نے فرط محبت و عقیدت میں ڈاکٹر انصاری کے بوٹ چوم لیے۔ڈاکٹر انصاری نے مسلم لیگ کو منظم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا اور اس کے ۱۹۲۰ء کے اجلاس کی صدارت کی لیکن بعد میں کانگریس کی طرف ان کا جھکاؤ بڑھتا گیا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۷ء کے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت بھی کی۔ تحریک عدم تعاون میں بھی انھوں نے گاندھی کا ساتھ دیا اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں دوبارہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ گاندھی ٹوپی اور کھدر کے کُرتے کے ساتھ کھنچوائی ہوئی ڈاکٹر انصاری کی تصویر دیکھ کر حضرت علامہ اقبال نے ۱۹۳۳ء میں فرمایا تھا ''پُور (بیچارہ) انصاری۔''

i- S. Bhattacharya,A Dictionary of Indian History.

ii- سید سلیمان ندوی۔یادِ رفتگان۔

iii- مرتبہ سید نذیر نیازی۔مکتوبات اقبال

iv- اردو انسائیکلو پیڈیا۔فیروز سنز۔

(۵) امداد حسین اخگر مراد آبادی ؒخخانہ جاوید مرتبہ لالہ سری رام کی جلد اول پہلی بار ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔اس میں اخگر صاحب کے بارے میں یہ معلومات ملتی ہیں۔ ''منشی امداد حسین صاحب باشندہ مراد آباد۔ملازم گورنمنٹ پریس شملہ،شبیر علی خان تنہا کے شاگرد ہیں۔طبیعت موزوں پائی ہے۔

شعر برا نہیں کہتے۔ اکثر شعر و سخن کا مشغلہ اور صحبت رہتی ہے۔ کبھی کبھی شملے پر مشاعرہ بھی کیا کرتے ہیں۔ آج کل نیچرل شاعری کی طرف مائل ہیں۔ عمر تقریباً تیس سال ہوگی۔ طلوع اسلام کے ۳۹۔۱۹۳۸ء کے مختلف شماروں میں حضرت اخگر کی چند رباعیات شائع ہوئی ہیں۔ بطور نمونہ کلام ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے:

پھر عدل پہ مفتوں تری دنیا ہو جائے
پھر موتیوں سے پر ترا دیا ہو جائے
ہٹلر بھی ہیں بہتیرے مسولینی بھی
اللہ عمرؓ بھی کوئی پیدا ہو جائے

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے شمارہ جولائی ۱۹۴۲ء کے ایک نوٹ کے مطابق اخگر نے اپنے وطن مالوف مراد آباد میں دسمبر ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں مضمون از جعفر بلوچ اخگر مراد آبادی مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، شمارہ بابت جون ۱۹۹۶ء)

(٦) سر عبداللہ المامون سہروردی (۱۸۸۱ء۔۱۹۳۵ء) ڈھاکہ مدرسہ ڈھاکہ اور کنگز کالج لندن میں تعلیم پائی۔ پین اسلامک سوسائٹی لندن کے بانی سیکرٹری تھے۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۶ء تک بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک اسی کونسل کے ڈپٹی پریذیڈنٹ بھی رہے۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت کمیٹی کلکتہ کے صدر تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے اور اسی یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ۱۳ جنوری ۱۹۳۵ء کو وفات پائی۔
(پروفیسر احمد سعید "مسلم انڈیا۔ اے بیاگرافیکل ڈکشنری" ۱۹۹۷ء۔ صفحہ ۳۱۷)

(٧) مرزا عبدالقادر بیدل پیدائش ۱۰۵۴ھ بمقام پٹنہ۔ وفات ۱۱۳۳ھ بمقام دہلی۔ ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں "علامہ اقبال مرحوم کی مجلس میں ایک بار بیدل کے محاورہ "خرام کاشتن" کا ذکر چھڑ گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کا فلسفہ حیات حرکی (Dynamic) ہے اور ان کے مقابلے میں مرزا غالب کا مائل بہ سکون (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ارمغان ایران۔، صفحہ ۱۶۷)
بیدل نے متذکرہ بالا محاورہ اپنے بیٹے کے مرثیے میں استعمال کیا ہے۔ متعلقہ شعر یہ ہے:

ہرگہ دو قدم خرام می کاشت
از انگشتم عصا نجف داشت

(۸) مشہور مورخ وشاعر (۶۰۵ھ۔ذی قعدہ ۶۷۵ھ)

(۹) مولانا محمد حسین آزاد (۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء/۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ)

(۱۰) مگدر ہلاؤ۔

(۱۱) ترکوں کے جدید ذہنی رجحانات کے لیے ملاحظہ ہو خلیل حامدی، ترکی قدیم وجدید (روداد سفر)۔

(۱۲) سلطان عبدالمجید (م ۲۵ جون ۱۸۶۱ء) کو اصلاحات سے بہت دلچسپی تھی اور انہوں نے بہت سے یورپین طور طریقے رواج دیئے تھے۔ سلطان عبدالمجید کے آخری دور حکومت میں مختلف جنگوں میں خصوصاً جنگ کریمیا کی وجہ سے سلطنت کی مالی حالت ابتر ہو چلی تھی۔ خزانہ خالی تھا اور اقتصادی بدحالی اور مشکلات کی وجہ سے عوام میں بے حد بے چینی پھیل گئی تھی۔

(۱۳) علامہ دوسری گول میز کانفرنس (منعقدہ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) میں شرکت کے لیے انگلستان گئے تھے۔ اس سفر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو محمد حمزہ فاروقی۔ سفر نامۂ اقبال

(۱۴) بلاشبہ ہم اس کے محافظ ہیں۔ (قرآن)

(۱۵) "میں نے چند اشعار میں فلسفۂ خودی کے بعض متضاد پہلوؤں کے متعلق حضرت علامہ سے سوال کیے تھے۔ یہ اشعار رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے تھے۔" اسد ملتانی۔

(16) Reconstruction of Religious Thought in Islam.

(۱۷) پیام مشرق میں یہ مصرع اس طرح ہے۔

ہوس منزل لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

(پیام مشرق ایڈیشن ۱۹۴۲ء۔ صفحہ ۲۰۱)

(۱۸) ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

(۱۹) ترکی کے شہرۂ آفاق شاعر وصوفی (۶۰۴ھ۔جمادی الثانی ۶۷۲ھ)

(۲۰) ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۳ء میں فوت ہوئے۔

(۲۱) بانی علی گڑھ تحریک (۱۸۱۷ / ۱۲۳۲ھ تا ۱۸۹۸ / ۱۳۱۵ھ)

(۲۲) اتحاد عالم اسلام کے عظیم داعی (۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء شوال ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۷ء)

(۲۳) روس کے مسلمان مصلح۔

(۲۴) مفتی مصر و شاگرد سید جمال الدین افغانی (۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء۔ ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۶ء)

(۲۵) مصر کی قوم پرور اور سرفروش پارٹی ''حزب الوفد'' کے بانی (م۔۱۹۲۷ء)

(۲۶) سابق شاہ افغانستان (۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲۔۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء)

(۲۷) بانی خاندان پہلوی و والد محمد رضا شاہ پہلوی (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۷ھ۔ ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء)

(۲۸) جدید ترکی کے بانی ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱۔۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء)

(۲۹) بانی حکومت سعودی عربیہ ابن سعود عبدالعزیز عبدالرحمن ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰۔ ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء)

(۳۰) ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔

(۳۱) اس ملاقات سے چند روز پہلے کسی اور مجلس میں اخگر صاحب نے کچھ رباعیات سنائی تھیں جن کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اب اس کا مزید ثبوت یہ ملا کہ رباعی ڈاکٹر صاحب کو یاد رہ گئی تھی۔ (اسد ملتانی)

رباعیات اخگر (مرتبہ محمد احمد ندوی) میں مکمل رباعی یوں ہے:

اسلام کو فرقوں نے دبا رکھا ہے
تفسیر نے قرآں کو چھپا رکھا ہے
ننگا ہوں مجھے چاہیے کپڑا اخگر
اس وضع میں اس قطع میں کیا رکھا ہے

✿✿✿

# یومِ اقبال•

اسلم جیراج پوری

گزشتہ زمانوں میں بالعموم اہلِ کمال کو ان کے کمال کی داد ان کی زندگیوں میں نہیں ملتی تھی بلکہ مرنے کے بعد جبکہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ ان کا نام روشن ہوتا تھا۔ عرفیؔ نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے ؎

چہ دل کشاید از نیم کہ بعد ازیں گویند
کہ بودہ است فلاں دام اسمہ استاد
ازینکہ بعد بریدن تمام شانہ شود
گرہ کشادہ نگرد دز طرۂ شمشاد

لیکن آج ذرائع الحاق واتصال اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ساری دنیا بمنزلہ ایک گھر کے ہوگئی ہے اور جو کمال کسی میں ہوتا ہے فوراً ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کے اشعار کی محبوبیت اور مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر اسلامی ممالک تک بھی پہنچ چکی ہے اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کے دل میں ان کی عزت اور عظمت جاگزیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ''دی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہوڈ'' نے اس سال کے آغاز میں ۹ جنوری کو ''اقبال ڈے'' منانے کا فیصلہ کیا تا کہ دنیائے اسلام کے اس عظیم الشان شاعر کے حضور میں وہ اپنی طرف سے عقیدت کا رانہ اور تحسین کا خراج پیش کرے، ان طلبہ نے مجھے بھی اس جلسہ میں مدعو کیا اور نہایت اصرار

---

• بعد شکریہ، جوہر، اقبال نمبر، جامعہ ملیہ دہلی، 1938 بحوالہ، صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 225-220۔

کے ساتھ۔ اس لیے میں ۹ جنوری کو دہلی سے لاہور پہنچا، دن صرف ایک تھا اور پڑھنے والے بولنے والے، نظمیں اور مضامین سنانے والے بہت یعنی تقریباً تین سو کی تعداد میں۔ اس وجہ سے پروگرام بہت طویل ہو گیا تھا اور تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح ساڑھے ۹ سے رات کے ۹ بجے تک رکھی گئی تھیں۔ پہلی نشست میں مسٹر گوکل چند نارنگ صدر جلسہ تھے۔ ہمارا دہلوی قافلہ ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ اس لیے ہم اس نشست کے آخر میں شریک ہو سکے اور بعض مقالات اور نظمیں سننے سے محروم رہے۔ دوسری نشست ڈیڑھ بجے زیر صدارت سر شیخ عبدالقادر صاحب (۱) ممبر انڈیا کونسل منعقد ہوئی۔ اس میں متعدد مقالے نہایت عمدہ تھے، خاص کر خواجہ غلام السیدین صاحب، ایم ای ڈی پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا انگریزی مقالہ بہت گرانقدر تھا۔ مولانا عابد علی صاحب عابدؔ ایم اے کی تحریر بھی نہایت دلچسپ تھی اور حفیظ جالندھری کی شاعری اور موسیقی دونوں داد کے قابل تھیں۔ نیز صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسمؔ ایم اے نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو کامیابی سے نمایاں کیا تھا۔

تیسری نشست جو ساڑھے ٦ بجے شام کو ہوئی۔ اس میں علامہ عبداللہ یوسف علی (۲) صدر تھے۔ اسی نشست میں بیگم شاہنواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ ان کے شوہر نے دس مربعے زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام اسی اقبال ڈے کے سلسلے میں منتقل کر دی ہے۔ اس اعلان نے اس یادگار کو ایک مادی قوت بخشی اور حاضرین نے اس پر نہایت خوشی اور شکریہ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو بٹھا دیا اور خود چلے گئے۔ پروفیسر محمد عمر فاروق ایم اے اور پروفیسر منیر الدین صاحب ایم ایس سی نے انگریزی زبان میں پرمغز مقالے پڑھے، کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں جن میں سے مولانا اسد ملتانی کی نظم خصوصیت (۳) کے ساتھ دلچسپی سے سنی گئی۔ آخر میں چودھری غلام احمد صاحب پرویزؔ نے اپنی تقریر "اقبال اور قرآن" پر شروع کی جو اس قدر پسند کی گئی کہ خاتمہ کے وقت بار بار لوگ درخواست کرتے تھے کہ کچھ اور اضافہ کیجیے مگر چونکہ وقت زیادہ گزر چکا تھا اس لیے میں نے جلسہ کو ختم کر دیا اور حسب ذیل تقریر کی۔

"ڈاکٹر اقبال کے کلام میں اس وقت سے سلسلہ وار مطالعہ کر رہا ہوں جب کہ آج سے ایک تہائی صدی پیشتر شیخ عبدالقادر کا رسالہ مخزن لاہور سے نکلتا تھا جس میں ان کی نظمیں چھپا

کرتی تھیں۔ زمانۂ مابعد میں ڈاکٹر صاحب کی مثنویوں اسرارِ خودی، رموز بے خودی اور پیام مشرق نیز جاوید نامہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے شعر اور ادب کی جس قدر خدمت کی ہے اس سے کہیں زیادہ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔

ادھر صدیوں سے مسلمانانِ ہند کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ قرآن سے ان کو لگاؤ نہیں رہا ہے اور ان کا دینی رشتہ اس کی تعلیمات سے ٹوٹا ہوا ہے، وہ صرف ان خیالات کے پیرو ہیں جو سر تا سر انسانی ہیں جن کو ملاؤں نے فرقہ بندی اور باہمی افتراق کا ذریعہ بنا کر ملت کے اجتماعی شیرازہ کو ایسا درہم برہم کر رکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں ان کی حالت دیکھ کر خود اسلام اور قرآن کی طرف سے بے اعتنائی اور بدگمانی پیدا ہوگئی جو اس صورت میں ہر عقل مند اور صاحب فہم کے دل میں پیدا ہی ہونی چاہیے تھی، ایسی حالت میں ڈاکٹر اقبال نے جو خود تعلیم جدید کے ایک درخشندہ آفتاب ہیں، اپنی خداداد قابلیت اور اندرونی روشنی سے شاعری کے ساز پر وہ دیپک کا راگ چھیڑا جس سے مسلم نوجوانوں کے افسردہ دلوں میں قرآن کی محبت کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے اس کی عظمت اور اسلام کی حقیقت کو پہچانا۔

بھولے ہوئے راستہ کی طرف قوموں کو مائل کرنا اور ان کے دلوں کو ہدایت کی طرف موڑنا وہ کام ہے جس کے لیے ہمارے نبی ﷺ سے قبل گزشتہ زمانوں میں انبیائے کرام آیا کرتے تھے، وہی کام قدرت نے ڈاکٹر صاحب سے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری سے لیا۔ مولانا گرامی مرحوم کا یہ قول کس قدر صحیح ہے ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبرئے کردہ پیمبر نتواں گفت

دوسری طرف ہماری شاعری بجائے خود اس قدر مہمل ہوگئی ہے کہ اس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے مدت ہائے دراز سے ٹوٹے ہوئے ہیں، شعراء خود نہیں سمجھتے کہ وہ کس ہذیان میں مبتلا ہیں اور کس لیے مبتلا ہیں، بس ایک پرانی لکیر ہے جس کو پیٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس صدی کے نامور شاعر اور قومیت کے مبصر مولانا حالی مرحوم نے کہا ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر
وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا
ہوا علمِ دیں جس سے تاراج سارا

ڈاکٹر اقبال نے اسی عام بدذوقی کی دنیا میں اپنی شاعری کا رشتہ زندگی اور بالخصوص اسلامی اور قرآنی زندگی کے ساتھ قائم کیا، یہ وہ چیز ہے جس کے لیے توفیق الٰہی اپنے کسی خاص ہی بندے کو چُنتی ہے۔ چنانچہ آج بھی جبکہ ان کے کلام کا اتنا نمونہ ہمارے شعراء کے سامنے موجود ہے، کوئی ان کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چلنے کے قابل نہ ہوسکا۔ بعضوں نے صرف لفظی نقالی کی کوشش کی مگر زندگی کی ان برقی لہروں کو نہیں دیکھ سکے جو ڈاکٹر صاحب کے شعروں کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہیں۔

اسلامی زبانوں میں سے کم سے کم تین زبانوں عربی، فارسی اور اردو کے اکثر بڑے بڑے شعراء کے کلام کا میں نے غور اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار ایسے دلکش، امیدوں سے ایسے بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اتنے لبریز ہیں کہ میں اُن کو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں، اس انتہائی زوال اور ذہنی پستی کے زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے لیے ان کا کلام قدرت کی طرف سے ایک موہبت کُبریٰ ہے جس نے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا ہے اور آئندہ کے لیے وہ ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ ملّی سرمایہ ہے۔"

ہر چند کہ یہ پہلا اقبال ڈے تھا اور طلبہ کی طرف سے تھا جن کے ابتدائی کاموں میں لازمی طور پر خامیاں ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی نہایت کامیاب رہا۔ مولانا عبدالحق صاحب سیکرٹری (۴) انجمن ترقی اردو، مولانا سید سلیمان صاحب (۵) ندوی، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے آنے کی بھی خبریں تھیں اور ان میں سے سوائے مولانا عبدالحق صاحب کے سب کے نام بھی پروگرام میں درج تھے لیکن یہ حضرات اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے، ورنہ اقبال ڈے اور بھی

زیادہ کامیاب رہتا۔

دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال ؒ سے ملے جو ہمارے منتظر تھے، ۹ بجے سے سلسلۂ گفتگو ساڑھے بارہ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل ہے، کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں، عملاً جب موقع اللہ دے بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں، ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوعِ سخن بدلنا پڑا۔ (۶)

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴ء...... ۱۹۵۲ء) مخزن کے ایڈیٹر اور علامہ کے بہترین دوستوں میں تھے۔

(۲) عبداللہ یوسف علی...... اسلامیہ کالج لاہور کے سابق پرنسپل، مشہور سکالر، علامہ کے مداحوں میں تھے۔

(۳) اسد ملتانی...... محمد اسد ۱۳ دسمبر ۱۹۰۲ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان کی وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے کے دوران انتقال فرمایا۔

(۴) مولوی عبدالحق...... ۱۸۶۹ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا، متعدد کتابوں کے مصنف تھے... مولوی صاحب کے نام علامہ کے سات خطوط اقبال نامہ مجلہ دوم میں اور ایک خط انوارِ اقبال میں موجود ہے۔

(۵) مولانا سید سلیمان ندوی...... پیدائش ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء پٹنہ...... ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو فوت ہوئے۔ سیرت النبی ﷺ کی تکمیل ان کا مشہور کارنامہ ہے۔ علامہ کے متعدد خطوط موصوف کے نام ہیں جو شیخ عطاء اللہ نے اپنے مجموعہ مکاتیب اقبال نامہ میں شائع کیے۔

# حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ سے سلسلۂ نیازمندی•

اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

مَیں نے پہلے پہل حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ کا نام (جنہیں اس وقت ڈاکٹر شیخ محمد اقبال رحمۃ اللہ کہا جاتا تھا) ۱۹۰۸ء میں سنا جب کہ انہوں نے ملی ترانہ (چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا) شائع کیا۔ یہ ترانہ کیلنڈر سائز کے خوش نما چارٹوں پر بھی چھاپا گیا تھا۔ یہ چارٹ ہر گھر میں آویزاں تھا۔ اسی زمانے میں مجھے ترانے کے کئی شعر حفظ ہو گئے تھے۔ میرا بچپن کا زمانہ تھا، یہ اشعار مجھے دوسروں سے سن کر یاد ہوئے تھے۔ اس وقت علامہ کے متعلق میرا کوئی تاثر نہ تھا۔

۱۹۱۹ء میں جب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا، میٹرک کے اردو کورس میں جس کا نام نصابِ اردو تھا، علامہ اقبال رحمۃ اللہ کی نظم ''نیا شوالہ'' اور ایک ''آرزو'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں یہ نصاب نویں اور دسویں جماعت میں دو سال میں ختم کرایا جاتا تھا۔ میں اس وقت اردو کے تمام بڑے اساتذہ کے دیوان پڑھ چکا تھا اور خود بھی غزلیں کہتا تھا۔ میر انیس کی کلیات پڑھنے کے بعد نظمیں بھی کہنے لگا جو اس وقت کے اخبارات میں چھپتی تھیں۔ اس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ جن اساتذہ کا کلام میں پڑھ چکا ہوں، اب ان جیسے اُستادوں کا جواب پیدا ہونا محال ہے۔ میں حالؔی اور داغؔ کو اردو کے آخری شعراء سمجھتا تھا۔ نصابِ اردو میں علامہ کا ''نیا شوالہ'' اور ''ایک آرزو'' اور مولانا اکبر الٰہ آبادی کی رباعیات اور قطعات جو اسی کورس میں درج تھے، دیکھ کر مجھے اپنا سابقہ خیال غلط نظر آیا اور اب میں نے تسلیم کر لیا کہ پچھلے اساتذہ کے مقابلے کے استاد اب بھی

• بصد شکریہ، ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، اپریل 1980، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین۔ ص36۔60۔

موجود ہیں، شاعری ختم نہیں ہوئی۔

میں نے علامہ کے مزید کلام کی تلاش شروع کردی۔ لاہور کی مرغوب ایجنسی نے علامہ کی بعض نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، قومی ترانہ، نالۂ یتیم، فریادِ اُمت، شمع و شاعر...... الگ الگ خوبصورت کتابوں کی شکل میں شائع کر رکھی تھیں، یہ سب نظمیں میں نے منگوالیں۔ بعد میں اسی طرح خضرِ راہ، طلوعِ اسلام اور لیکچر اقبال (مترجم مولانا ظفر علی خان) بھی شائع ہوئیں۔ میں نے یہ بھی منگوائیں اور سب کی ایک جلد بندھوالی جو میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ ان میں سے ''نالۂ یتیم'' اور ''فریادِ اُمت'' بانگِ درا میں درج ہیں۔ اسی دوران میں مَیں نے ماہنامہ مخزن، ماہنامہ صوفی منڈی بہاؤالدین، اخبار زمیندار، خم خانۂ جاوید جلد اوّل اور دیگر رسائل اور جرائد سے علامہ کا تمام اردو کلام ایک بیاض میں نقل کرلیا۔ اس بیاض میں مولانا ظفر علی خان اور دیگر قومی شعراء کا کلام بھی درج ہے۔ یہ بیاض بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

میں علامہ کے اردو کلام کا حافظ ہو گیا تھا۔ اب مجھے خیال ہوا کہ علامہ کا اصل پیغام تو فارسی میں ہے، میں نے سکول میں عربی پڑھی تھی۔ فارسی مجھے آتی نہ تھی۔ میں نے فارسی پڑھنی شروع کی۔ فارسی کسی استاد سے نہیں پڑھی بلکہ یہ کیا کہ علامہ کی مثنوی اسرار خودی پڑھنی شروع کر دی چونکہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان اور مولانا نیاز فتح پوری کی فارسی نما اردو نثر کا دلدادہ تھا، مجھے اسرار خودی اور پھر مثنوی رموزِ بےخودی کا مطالعہ مشکل نظر نہ آیا۔ فارسی گرامر کی ایک ابتدائی کتاب سرسری دیکھ لی تھی جس سے فارسی افعال کو سمجھنے میں مدد ملی۔ میں نے اسرار و رموز کے تمام مطالب سمجھ لیے بلکہ بہت سے اشعار حفظ ہو گئے اور میں خود بھی فارسی شعر کہنے لگا۔ پیشتر اس کے کہ میں علامہ مرحوم سے اپنی ملاقاتوں کی یادداشتیں بیان کروں، چند واقعات کسی منطقی ترتیب کے بغیر بیان کردوں۔

## اکبر الٰہ آبادی سے تعلق

۱۹۱۱ء میں سید اکبر حسین الٰہ آبادی نے علامہ اقبال کو الٰہ آباد سے لنگڑے آموں کا ایک ٹوکرہ تحفۃً بھیجا۔ علامہ رحمہ اللہ نے اکبر کو آموں کی رسید کے طور پر یہ شعر ارسال کیا جو علامہ کے اردو کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے ۔

جناب سیّد اکبر کا یہ اعجاز تو دیکھو!
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

یہ شعر لُدھیانے کے ماہنامہ اقبال میں شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ شہزادہ صابر درّانی نے علامہ اقبال کے نام پر لُدھیانے سے جاری کیا تھا۔

## چندے میں شعر

۱۹۲۱ء میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کی یادگار تعمیر کرنے کے لیے سرمایہ جمع کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ چندہ جمع کرنے والے لاہور میں علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور عطیہ طلب کیا۔ شاعر کا سرمایہ تو اس کے اشعار ہی ہوتے ہیں، چنانچہ علامہ نے یہ دو اشعار چندے میں دیے، یہ اشعار بھی علامہ کے اردو کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تُو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

## قطعۂ تاریخ

علامہ اقبال کی ایک بیگم لدھیانے کے نولکھا خاندان سے تھیں۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ علامہ کو بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے اس جانگداز حادثے پر فارسی میں قطعۂ تاریخ کہا جو لُدھیانے میں ان کی لوحِ مزار پر کندہ تھا۔ یہ قطعہ بھی علامہ کے فارسی کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے دریغاز مرگِ ہمسفرے
دلِ من در فراقِ اُو ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخنِ پاکِ مُصطفٰیؐ آورد

بہر سال رحیلِ اُو فرمود
بہ شہادت رسید و منزل کرد
۱۳۴۳ھ

## ذوالفقار گنج

گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ کے سامنے نواب سر ذوالفقار علی خان ممبر کونسل آف سٹیٹ کی کچھ اراضی تھی۔ نواب صاحب علامہ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے اس اراضی پر بہت سے دو منزلہ مکانات تعمیر کر کے خوشنما آبادی قائم کر دی جس کا نام ذوالفقار گنج رکھا۔ اس آبادی کے بلند و بالا محراب دروازے کے سنگِ پیشانی پر علامہ اقبال کا یہ قطعہ تاریخ کندہ تھا، علامہ کا یہ قطعہ بھی علامہ کے فارسی کلام کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

بانیٔ ایں خوش بنا سر ذوالفقار
سالِ تعمیرش ز ہاتف خواستند
از فلک ایں مصرع چوں شبنم چکید
بر زمیں خلدِ بریں آراستند
۱۹۲۴ء

## مُسلم آؤٹ لُک

پنجاب میں مسلمانوں کا کوئی انگریزی اخبار نہیں تھا، تحریک خلافت کے زمانے میں یہ کمی بہت بری طرح محسوس کی گئی۔ چند مسلم نوجوانوں نے لاہور سے مُسلم آؤٹ لُک جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ علامہ اقبال نے اس پر چند اشعار کہے جو علامہ کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہیں۔

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ
دل گراں، ہمت سبک، ووٹر فزوں روزی تنگ
لُک ودان(۱) کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو
اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے مُسلم آؤٹ لُک

کیا عجب پہلے ہی لیڈر میں یہ کر دے آشکار
کس طرح آیا کو لے کر اُڑ گیا صاحب کا کُک
قافیہ اِک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں!
کر دیا متروک دِلّی کے زباں دانوں نے ٹُک
ختم تھا مرحوم اکبؔر ہی پہ یہ رنگِ سخن
ہر سخنور کی یہاں طبع رواں جاتی ہے رُک

## عرشی کے جواب میں

۱۹۱۹ء میں جب پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپی اتحادیوں نے ترکی کے تمام مقبوضات اور عرب ممالک پر قبضہ کر کے پورے عالم اسلام پر اپنی سیاست قائم کر لی تو دُنیا بھر کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ برصغیر پاک و ہند میں تحریک خلافت شروع ہو گئی۔ ان دردناک حالات میں جناب محمد حسین عرشی امرتسری نے ایک فارسی نظم میں علامہ اقبال سے التجا کی کہ وہ موجودہ قیامت خیز حالات میں خاموش نہ رہیں، قوم کی رہنمائی کے لیے کچھ فرمائیں۔ عرشی کی نظم طویل ہے، آخری اشعار یہ تھے:

خیزو گلبانگ دہل در گنبدِ خضرا فگن
از قبور آئید خلقے شور صور آسا فگن
خیز و صوتِ خود بہ آہنگ رجز تبدیل کن
قطرۂ داری، بیاور، درشر تحلیل کن
خیز ازیں کنجِ متانت جلوۂ برما فگن
ہاں بیا ہمچو سنائی گوئے در میداں فگن

یہ نظم روز نامہ زمیندار مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی اور مولانا ظفر علی خان مرحوم اخبار زمیندار کا یہ پرچہ لے کر خود علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ نے عرشی امرتسری کے پیغام کے جواب میں جو اشعار مولانا مظفر علی خان مرحوم کے حوالے کیے وہ علامہ کے کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ میں یہ اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں ؎

دانی کہ چیست شیوۂ مردان پختہ کار
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست
دارم ہنوز از کرم ساقئ حجاز
آہِ درد نہ تاب کہ خیز دز سینہ مست
از شاخسارِ فطرتِ من می دمد ہنوز
آں لالۂ کہ موجِ بیے دلش نہ خست
لیکن شنیدۂ کہ دمِ گردش شراب
پیر عجم چہ گفت بہ رندان مے پرست
دانا کہ دید شعبدۂ چرخِ حقہ باز
ہنگامہ باز چیدو درِ گفتگو بہ بست

علامہ کا مطلب یہ تھا کہ اب کام کرنے کا وقت ہے، باتیں کرنے کا نہیں ہے۔

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں
انہیں مذاقِ سُخن نہیں ہے

علامہ کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے دوسرے روز مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کہا۔

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی
پیرِ فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج
پیہم اتر رہی ہے کہ ظلم کو دے شکست
مانا کہ ان کو جو نظر آتے ہیں سر بلند
چرخِ ستیزہ کار کرے گا زبون و پست
لیکن نہ قولِ سعدئ شیراز بُھولئے
چھوٹا نہیں جو ہاتھ سے سررشتۂ است
رفتن بہ پائمردئ ہمسایہ در بہشت
حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است

حکیم طغرائی امرتسری نے بھی علامہ کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے ایک نظم کہہ ڈالی جس کے آخری دو شعر یہ تھے ؎

گیرم کہ گنجِ فلسفہ و حکمت است کس
اِتاچہ سود، مہر سکوت ازبش بہ بست
بپذیر اعتذار زطغرائی حزیں
دانی کہ اوز بند الم ہیچ گہ نہ رست

آخر علامہ نے عرشیؔ، امرتسری، مولانا ظفر علی خان مرحوم اور حکیم طغرائی امرتسری کے اسرار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور مولانا ظفر علی خان مرحوم کو بتایا کہ انہوں نے ایک نظم شروع کر دی ہے، جس کا مطلع یہ ہے ؎

شعلہ در آغوش دارد عشقِ بے پروائے من
برنہ خیز دیک شرار از قِسمت نازائے من

یہ نظم بھی جس کے چند اشعار میرے پاس محفوظ ہیں، علامہ مرحوم کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے۔

## پہلی بار زیارت

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مجھے پہلی بار علامہ کی زیارت نصیب ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہِ برطانیہ کے حکم کے تحت ہندوستان کے تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا تھا۔ ۲۵ دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگریس کے سالانہ جلسے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں مشترکہ طور پر ہو رہے تھے۔ اس مشترکہ جلسے میں کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو (والد پنڈت جواہر لال نہرو) اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم تھے۔ ۲۶ دسمبر کو مولانا محمد علی جوہر چھنڈواڑہ جیل سے اور مولانا شوکت علی بتویل جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ ہم چند طالب علم بھی بلاٹکٹ لدھیانے سے اسی گاڑی میں سوار ہو گئے اور امرتسر پہنچ گئے۔ علی برادران جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو مسلم لیگ کا اجلاس شروع تھا جو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ دوبارہ جلسہ شروع ہوا تو حکیم اجمل خان صاحب نے اعلان کیا کہ اب ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر

محمد اقبال علی برادران کے خیر مقدم کے طور پر چند اشعار پڑھیں گے جو انہوں نے فی البدیہہ لکھے ہیں۔ حضرت علامہ تکبیر کے پُرجوش نعروں میں کھڑے ہوئے اور ترنم کے ساتھ ذیل کے اشعار پڑھے جو بانگِ درا میں ''اسیری'' کے عنوان کے تحت درج ہیں ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مُشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بُوند ہے
مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام وقفس سے بہرہ بند
شہپر زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

آخری شعر حضرت خواجہ حافظ شیرازی کا ہے جسے علامہ نے تضمین کیا ہے۔ علامہ اس اجلاس میں سٹیج سیکرٹری تھے۔ مجھے علامہ کی زیارت کر کے اور ان کا کلام سن کر بہت خوشی ہوئی، گویا کوئی بیش بہا خزانہ ہاتھ آ گیا۔ لوگوں نے ''مکرر ارشاد'' کہہ کہہ کر یہ اشعار کئی بار پڑھوائے اور مجھے وہیں حفظ ہو گئے۔

## بارگاہِ اقبال میں باریابی

مجھے ۲۱-۱۹۲۰ء میں دوستوں سے ملنے کے لیے لاہور جانے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ میں اس زمانے میں اخبار زمیندار کی نامہ نگاری بھی کرتا تھا۔ کبھی کبھی بعض بزرگوں کے ہمراہ علامہ کی بارگاہ میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوتی تھی۔ چونکہ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا، مجھے علامہ اقبال کے تبحر علمی اور دینی تقدس کی وجہ سے بے حد عقیدت تھی، کچھ احساسِ کمتری اور کچھ شرم اور پاسِ ادب بھی دامنگیر تھا، اس محفل میں فرش پا انداز میں جگہ مل جانا بھی بے حد مسرت کا باعث تھا۔ وہاں مجھے عرصہ تک لب کشائی کی جراُت نہیں ہوئی۔

بات کرنے کی جراُت کب ہوئی، یہ بھی ایک داستان ہے۔ جب میں ۱۹۲۵ء میں اردو مرکز

لاہور سے وابستہ ہوا تو فرصت کا وقت دفتر زمیندار میں گزرتا تھا۔ وہاں علامہ کبھی کبھی مولانا ظفر علی خان سے ملنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کے کمرے میں زمیندار کا ایک ۱۹۱۱ء کا فائل تلاش کر رہا تھا، کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ یکایک علامہ تشریف لے آئے۔ میں کمرے کے ایک کونے میں فائلوں کے ایک اونچے ڈھیر کے پاس کھڑا فائل دیکھ رہا تھا، میں کچھ گھبرایا لیکن جرأت کر کے سلام عرض کر دیا۔ علامہ نے سلام کے جواب کے بعد پنجابی میں فرمایا ''مولانا نوں کتھے لکو رکھیا اے؟'' میں نے پنجابی میں عرض کیا کہ وہ ابھی اٹھ کر ایک لالہ جی کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ علامہ نے فرمایا ''ایہہ لال ٹوپی تاں پئی ہوئی اے۔'' یہ مولانا کی ترکی ٹوپی کی طرف اشارہ تھا جو میز پر پڑی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ شاید ننگے سر ہی چلے گئے ہیں۔ (اس زمانے میں شرفاء کا ننگے سر بازار میں نکلنا معیوب تھا) علامہ یہ سن کر بیٹھ گئے، شاید یہ خیال کیا کہ چونکہ ننگے سر گئے ہیں تو دور نہیں گئے۔ اتنے میں مولانا اختر علی آ گئے۔ علامہ کو دیکھ کر سلام عرض کیا اور کڑک کر بابو مولا داد (منیجر زمیندار) کو آواز دی کہ علامہ کو حُقّہ پیش کرو۔ اِدھر بابو مولا داد نے حُقّہ بھیجا اور اُدھر کھٹ سے مولانا ظفر علی خان نے کمرے میں قدم رکھا اور علامہ کے پاس بیٹھ گئے۔

اس دن میں نے پہلی بار آفتاب و ماہتاب کو ایک بُرج میں جلوہ آرا دیکھا اور علامہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اس اثناء میں مَیں نے فائل تو تلاش کر لیا تھا لیکن فائل لے کر وہیں بیٹھا اس کی ورق گردانی کرتا رہا۔ میرے کان ان بزرگوں کی باتوں کی طرف تھے جو قومی اور سیاسی امور کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس دن سے میرا احساس کمتری اور شرمساری گھٹنے لگا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اور بعض دیگر اصحاب علامہ کے دولت کدے پر اکثر جاتے تھے۔ میں بھی اُن میں سے کسی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جانے لگا۔ اس عرصے میں علامہ کا پہلا مجموعۂ کلام پیامِ مشرق شائع ہو چکا تھا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی جب کسی سے میرا تعارف کراتے تو میرا نام بتانے کے بعد کہتے ''یہ اقبال کا فدائی ہے۔''

## شعر اقبال کی تضمین

مئی ۱۹۲۷ء میں مثنوی اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوئے میں نے علامہ

اقبال کی یوں مدح سرائی کی۔

حضرتِ اقبالؒ آں بحرِ علوم ‏ چشمِ او مستِ شرابِ پیرِ رُوم
بے خبر از مدعا بودیم مَا ‏ از حرم نا آشنا بودیم مَا
زد سرِ انگشت برتارِ حیات ‏ آشکار اکرد اسرارِ حیات
مسلمِ پر وردَہ باغِ سروش ‏ بود در ہندوستاں زنار پوش
داد اُو را عشقِ لیلائے حجاز ‏ ناز ہا افروخت از خاک نیاز
دینِ فطرت را بلند آوازہ کرد ‏ گلشنِ ہندوستاں را تازہ کرد
از خمِ عرفاں شرابِ ناب داد ‏ قلب را بے تابیٔ سیماب داد
جلوۂ طیبہ قرارِ جانِ اُو ‏ مدحِ ختم المرسلینؐ ایمانِ اُو
فکرا دور مثنوی دُر سفتہ است ‏ درثنائے مصطفیٰؐ خوش گفتہ است
"در شبستانِ حرا خلوت گزید ‏ قوم و آئین و حکومت آفرید"
کارِ ختم الانبیاءؐ ایں بود و بس ‏ ہستی اش را مدعا ایں بود و بس
ساز خت ازا قوام یک قومِ گراں ‏ یک دل و یک اعتقاد و یک زباں
دین و دنیا رابہ آئیں چوں بہ بست ‏ آدمِ کم مایہ شد بیضا بدست
علم و حکمت رابہ قرآں رابط داد ‏ درجہاں از شعلہ ہا فردوس زاد
لُطف او گیرندۂ ہر سر زمینؐ ‏ زیں سبب شد رحمت للعالمینؐ
ضربِ الاّ اللہ زوچوں صبح دم ‏ قوم شد بیدار از خوابِ عدم
دہر از آئینِ حق تسخیر شد ‏ قیصر و کسریٰ تہِ شمشیر شد
ہیبت روما فرِ ایراں نہ ماند ‏ ہیچ قانونے بجز قرآں نہ ماند
"در شبستانِ حرا خلوت گزید ‏ قوم و آئین و حکومت آفرید"

میری یہ نظم مقصودِ رسالت ﷺ کے عنوان سے روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی اور پرچہ علامہ اقبال کی خدمت میں پیش ہوا۔ علامہ نے ایک صاحب سے پڑھ کر سنی اور اظہارِ خوشنودی فرمایا۔

## نذرِ اقبال رحمۃ اللہ

پھر ۱۹۲۷ء میں ''نذرِ اقبال رحمۃ اللہ'' کے عنوان سے میں نے ایک فارسی نظم کہی جو روزنامہ انقلاب مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ نظم یہ تھی ؎

سوزِ الفت در رگِ جانم نہ بود ۔۔۔ ماہ و پرویں زیرِ دامانم نہ بود
بے خبر از جلوہ لیلیٰ بدم ۔۔۔ از مآلِ خویش بے پروا بدم
غافل از رسمِ تپیدن جانِ من ۔۔۔ خندہ زن الحاد بر ایمانِ من
غرضِ عصیاں بندہ لات و منات ۔۔۔ ناشنیدہ حرفِ مقصودِ حیات
نغمۂ غفلت فزا در سازِ من ۔۔۔ ساقیانِ ماہ وش دم سازِ من
دور تر خاکسترم از تابِ عشق ۔۔۔ درجہاں بیگانہ از اربابِ عشق
در چمن اقبالؒ چوں سازے نواعت ۔۔۔ از غبارم یک جہانِ عشق ساخت
جانِ من از دامہا آزاد شت ۔۔۔ دل ز نقشِ لا الہ آباد گشت
گِل بدم از سوزِ اُو آدم شدم ۔۔۔ از رموزِ زندگی محرم شدم
فکرِ او برمن درِ جنت کشاد ۔۔۔ عشق در جانم بنائے خود نہاد
برق ہا گردید گرد حاصلم ۔۔۔ کعبہ ہا تعمیر شد اندر دلم
دررہِ الفت شدم چوں یارِ اُو ۔۔۔ جستم از گفتارِ اُوا سرارِ اُو
اے نسیمِ صبح از گلشن بہا ۔۔۔ ازرہِ الطاف سوئے من بہا
مہربان شوبرِ دلِ ناکامِ من ۔۔۔ تابہ گوشِ اُو رساں پیغامِ من
اے کہ عالم مست شداز ہوئے تو ۔۔۔ ''جلوہ ہا خیز دوہر پہلوئے تو''
''انتظارے غمگسارے تا کجا ۔۔۔ جستجوئے رازدارے تا کجا''
اے کہ سینا ذرّہ ازتابِ تو ۔۔۔ نعرۂ ارنی زنم برباب تو
آرزو دارم کہ غمخوارت.. شوم ۔۔۔ در مصافِ زندگی یارت شوم
''تابہ جان من سپاری ہوئے خویش ۔۔۔ بازبینی در دل منِ روئے خویش''
خیر داز چنگم نوائے سازِ تو ۔۔۔ من بایں دوری شدم ہمرازِ تو
اے کہ بام تو زماہ و خور بلند ۔۔۔ لطف کن برمن در خود را بند

مدیر انقلاب نے یہ نظم شائع کرتے ہوئے اس پر یہ نوٹ لکھ دیا "اَرِنی کی را متحرک ہوتی ہے۔ خدا جانے نظیر صاحب نے ساکن کیوں باندھی۔"

میں نے اس اعتراض کے جواب میں مدیر انقلاب کو غیاث اللغات کے حوالے سے ایک شعر سند میں لکھ بھیجا جس میں اَرِنی کی را ساکن باندھی گئی تھی لیکن مدیر انقلاب نے ۲۸ ستمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں لکھا:

"۲۴ ستمبر کے انقلاب میں جناب اصغر حسین خان صاحب نظیر لودھیانوی کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس کے ایک شعر میں اَرِنی بہ سکون را باندھا گیا تھا۔ اس پر ہم نے اظہار تعجب کیا کیونکہ ہمارے نزدیک عربی الفاظ کو محض ضرورتِ شعری کی وجہ سے اس طرح بگاڑنا کہ ان کی حرفی ونحوی صورت برقرار نہ رہے، مستحسن نہیں۔ اس پر حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔"

"ڈیئر سالک! ٹیک چند بہار نے ابطالِ ضرورت میں رب اَرِنی پر مفصل بحث کی ہے۔ افسوس ابطالِ ضرورت کا کوئی نسخہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں۔ بہرحال یہ صحیح ہے کہ اساتذۂ عجم نے رب اَرِنی کی رائے ثانی کو بہ سکون بھی استعمال ہے۔ سالک لاہوری سالک یزدی کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

مرغ اِرنی گوز شوق لن ترانی پرزند
پیشِ موسیٰ خار خارِ وادی ایمن گل است

اصغر حسین خان صاحب کے شعر میں کوئی غلطی نہیں۔ والسلام: محمد اقبال"

حضرت علامہ کے بعد اصغر حسین صاحب نے بھی صاحب غیاث کی یہ عبارت نقل کر کے بھیج دی۔ رب اَرِنی در فارسی بہ سکونِ رائے مہملہ نیز آمدہ چنانچہ در مخزنِ اسرار مولوی نظامی گفتہ ؎

موسیٰ دجام تہی دید دست
شیشہ بکہ کہ پایۂ ارنی شکست

حضرت علامہ اگر محض سالک یزدی کے شعر ہی پر اکتفا کرتے تو کوئی بات نہ تھی لیکن اب کہ حضرت نے خود اپنی رائے بھی ظاہر فرمادی کہ اصغر حسین صاحب کے شعر میں کوئی غلطی نہیں

توہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ حضرت کے فیصلے پر سر تسلیم خم کردیں۔

(روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۷ء)

## خطاب بہ اقبال

جنوری ۱۹۲۹ء میں میں نے علامہ اقبال رحمۃ اللہ سے خطاب کرتے ہوئے ایک اور نظم کہی جو روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی۔ اسی نظم میں میں نے عرض کیا ؎

جان و دل از نوائے خود گداز — آشیاں در گلشنِ اقبال ساز
آں چمن آرائے اسرار و رموز — آسماں پیمائے اسرار و رموز
خیمہ زن در وادیٔ طورش کلیمؑ — شعرِ اُو تفسیر قرآنِ حکیم
حاصل خم خانہ ہا زیب برش — مے بہ تاک اندر نہاں در ساغرش
حشر ہا از فکرِ اُو در کائنات — چشمِ اُو بینندۂ رازِ حیات
حُسن از تحسینِ او سفاک تر — عشق از تعلیم اُو بے باک تر
چوں خیال مصطفیٰؐ ایمانِ اُو — برق می گیرد تپش از جانِ اُو
درجہان عشقِ محمدؐ عام کرد — خاک بازاں را شرر آشام کرد
در تنِ ماگر رواں بینی از وست — آنچہ در ہندوستان بینی از وست
ذرّۂ از آتشِ او سوز ماست — حاصل صد دوشِ اُو امروزِ ماست
کور ذوقاں داستاں ہا ساختند — وسعتِ ادراکِ او نشناختند

## اِلتجائے دُعا

۱۹۳۱ء میں گورداس پور میں میری چار سالہ لڑکی طاہرہ خانم فوت ہوگئی۔ چونکہ وہاں ہم میاں بیوی اکیلے تھے۔ دونوں نے کبھی کسی عزیز کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ہم دونوں بہت ہراساں ہوئے۔ احباب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مل جل کر بچی کو سپرد خاک کیا۔ رات کو میری والدہ مرحومہ اور بڑے بھائی صاحب کی اہلیہ اور دیگر اعزہ [لودھیانے] سے آگئے۔ میری بھابھی کی گود میں چار سالہ لڑکا تھا۔ جو کچھ علیل تھا، وہ گورداس پور پہنچتے ہی مر گیا۔ اسے اگلے روز سپردِ خاک کیا گیا۔ دوروز میں دو موتیں ہو گئیں۔ ان دونوں بچوں کی قبریں گورداس پور میں پہلو بہ

پہلو بنیں۔ ان کے سرہانے سنگِ مرمر کی تختیاں لگائی گئیں جن پر علامہ کی مثنوی کے اشعار کندہ تھے۔ طاہرہ خانم کی تختی پر اس کے علاوہ مثنوی کا یہ شعر کندہ تھا ؎

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

میرا دل ان بچوں کی موت سے بہت متاثر ہوا اور دلی صدمے کی وجہ سے سخت علیل ہو گیا۔ فروری ۱۹۳۲ء میں مَیں نے علامہ اقبال کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس میں اپنی علالت کی طوالت اور تفصیل بیان کر کے ان سے دعا کی التجا کی۔ علامہ نے میرے خط کے جواب میں جو خط لکھا اس کی نقل ذیل میں درج ہے:

لاہور ۲۹ر فروری ۱۹۳۲ء

جنابِ من!

السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ کی علالت کا حال معلوم کر کے بہت افسوس ہوا۔ خدا تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے میں آپ کو صحت عاجل کرامت فرمائے۔ آپ کے حسنِ ظن اور اپنی بے بضاعتی سے میرا دل بہت متاثر ہوا۔ میں کیا اور میری دعا کیا۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تکمیل میں دریغ نہ ہوگا۔

والسلام۔ محمد اقبال

اس گرامی نامہ کی یاد میں مَیں نے چند اشعار کہے۔ ان میں سے چار شعر نقل کرتا ہوں ؎

بخت نے وہ خوفناک ایام دکھلائے مجھے
جن کے ڈر سے لرزہ براندام ہے یوم النشور
شافیٔ مطلق ہے وہ مایوس کیوں ہو دل مرا
جان دی جس نے وہی تاب وتواں دے گا ضرور
جب اٹھا میرے لیے دستِ دعا اقبالؒ کا
کھل گیا بابِ اجابت صورتِ آغوشِ حور
میں گنہگار اس لیے کہتا ہوں، بے تقصیر ہوں
تری رحمت کے مقابل کچھ نہیں میرے قصور

## عاشقانہ مثنوی

۱۹۳۷ء میں مَیں نے ایک عاشقانہ مثنوی لکھنی شروع کی جو نامکمل رہ گئی۔ اب اس کی تکمیل محال ہے۔ اس کے شروع میں لودھیانے کے حضرت عنایت ولی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

ہو رہی تھی یوں غلامی میں بسر — سر بہ سر بیکار تھے فکر و نظر
جس نے نبضِ عشق کو گرما دیا — اہل دین کی روح کو تڑپا دیا
ہو گئے جب تنگ ظلم و جور سے — یک بیک اٹھی صدا لاہور سے
پھر ہوئی پیدا نوائے لا الہ — پھر سنی ہم نے صدائے لا الہ
سر اٹھایا سبزۂ پامال نے — تازگی بخشی ہمیں اقبال نے
پھر کیا عشق نبی سے آشنا — پھر کیا زور علیؓ سے آشنا
پھر پلایا ہم کو جامِ اہل بیتؓ — پھر دیا ہم کو پیامِ اہل بیتؓ
پھر اٹھایا پردۂ حسن و جمال — پھر دکھایا روئے سلمانؓ و بلالؓ
پھر ملا احساسِ پامالی ہمیں — مل گیا پھر سوزِ ابدالیؒ ہمیں

## حضرت علامہ کی علالت

اپریل ۱۹۳۶ء میں اخبارات میں یہ تشویشناک خبر شائع ہوئی کہ علامہ سر محمد اقبال علیل ہیں۔ گلے میں سخت تکلیف ہے۔ مسلمان علامہ کی صحت کے لیے دعا کریں۔ چنانچہ ہر شہر کی مساجد میں علامہ کی صحت کے لیے دعائیں کی گئیں۔ اس موقع پر میں نے ایک نظم لکھی جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔

حضرتِ اقبالؒ آں سالارِ قوم — آفتابِ مطلع انوارِ قوم!
در گلوئے اونوا ہائے خلیلؑ — قوم از آہنگِ اُو گرمِ رحیل
بہرہ یابِ مستی و عشق و نیاز — مایہ دارِ ذوق وشوق وسوز وساز
حشر ہا مستور در پہلوئے اُو — عاشقاں گرم عمل از ہوئے اُو
قطرہ از خم خانۂ بطحا چشید — دید آں رنگے کہ موسیٰؑ ہم نہ دید

ذرّہ از علم نبیؐ تحصیل کرد — فکر خود را شہپر جبریلؑ کرد
وانمود اسرارِ قرآنِ حکیم — داد اہل علم را ذوقِ سلیم
من کہ در زناریاں رقصاں بدم — بے خبر از جلوۂ یزداں بدم
جانِ من نا آشنا از تابِ عشق — خندہ زن برحالِ من اربابِ عشق
چوں نوائے او بہ گوشِ من رسید — در تنِ بے جانِ من جانے دمید
خفتہ بودم اُومرا ہشیار کرد — از نوائے لااِلٰہ بیدار کرد
ذکرِ پیغمبرؐ شنیدم من ازد — الفتِ حیدرؓ خریدم من ازد
پردہ از چشم کشید آئینہ اش — سوزِ سلماں دیدم اندر سینہ اش
آشنا باشبرؓ و شبیرؓ کرد — در دلِ من عالمے تعمیر کرد
از کلامش مردِ صاحب دل شدم — واقفِ اسرارِ آب و گل شدم
داد از شوق عمل عزت مرا — از جہنم برد در جنت مرا
چشمِ من محو رخ زیبائے اوست — دامنم معمور ازہ گہائے اوست
در جہاں با اہل دولت کارنیست — در کفِ من درہم و دنیا رنیست
خم نہ کردم پیشِ منعم گردنم! — از در و نطش فروزاں دامنم
زندگانی میکنم در خاروخس — فکرِ من از فیض او افلاک رس
از شبِ ہجراں نے ترسد جانِ من — نورِ اُو در کلبۂ احزانِ من
اے خُدا مثل خضرا دزندہ باد — درجہاں اقبالؒ ما پائندہ باد

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ علامہ نے یہ نظم مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا سے پڑھوا کر سنی اور اشعار کی تعریف کی۔ میں نے جولائی ۱۹۳۹ء میں ایک اور نظم کہی جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔ نظم یہ تھی ؎

حضرتِ اقبالؒ آں ممدوحِ ما — جانِ ماد رُوح مو نوحِ ما
شمعِ محفل روئے دل افروزِ او — دردلِ ماسوزِ عشق از سوزِ اُو
از پیامش موجزن عمانِ ما! — از کلامش قوتِ ایمان ما
از نوایش مست پہنائے حیات — حشر در آغوش لیلائے حیات

زندگانی رانگار عشق داد! این گلستاں را بہارِ عشق داد
آسمانِ زندگی را آفتاب بہرہ یابِ حکمتِ اُم الکتاب
کرد مارا باخبر از لعل و سنگ در ہجوم نازنینانِ فرنگ
اے صبا اے قاصد طرارِ من تابہ گوش اور ساں اشعار من
عرض کن کے رونقِ شہر علوم چشمِ تو روشن تراز چشمِ نجوم
برقِ رومیؒ درخم و مینائے تو چشمِ من سرمست از صہبائے تو
راہ تاریک و مہ روشن توئی پیر تو رومیؒ و پیر من توئی
"انتظار غمگسارے تا کجا جستجوئے راز دارِ تا کجا"
ناتوانم لیکن افغاں زادہ ام از فرازِ آسماں افتادہ ام
قطع استبداد کرد آبائے من ہندرا آباد کرد آبائے من
از سناں نقش و نگارے کردہ اند ایں زمیں رالالہ زارے کردہ اند
سوز و سازِ جان من بنگردمے دیدۂ تو در تلاش آدمے
در غلامی جام تو نوشیدہ ام آسماں زیر زمیں پوشیدہ ام
صبر از جانم ربود آئینہ ات شکل آیا دیدم اندر سینہ ات
سوزِ تو برجانِ من فرماں رواست من ندانم تیغ ابدالیؒ کجاست
مابہ ام جز مایۂ امید نیست درکفِ من لعل دھرواریدنیست
گرد نم در حلقۂ طوقِ گراں بے خبر جانِ من از آہ و فغاں
باکمالاں در جہاں خوارد ذلیل کمترنیاں وارثِ تیغ اصیل
شہ جہاں معدوم شد اکبر گزشت دور چغتائی ازیں کشورِ گزشت
ایں زمیں اہل سخن را کربلاست مستئ دور جہانگیری کجاست
سوئے من اے پیر صاحب دل نگر گلستانِ خویش را حاصل نگر

## علامہ کی وفات

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو نے علی الصبح یہ کربناک خبر سنائی کہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمہ اللہ آج صبح وفات پا گئے۔ میں آج تک کسی عزیز کی وفات پر نہیں رویا تھا۔ حضرت علامہ

کی وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا اور میری آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ مدارس اور سرکاری دفاتر میں چھٹی ہوگئی۔ ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ میں نے علامہ کی وفات پر حسب ذیل نظم کہی جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی ؎

اکبؔر جادو نوا ہے دیر سے خلد آشیاں — ہو چکی خاموش مدت سے گرامی کی زباں
سو رہا ہے جوہرؔ بے باک ارض پاک میں — حشر محوِ خواب ہے داتا نگر کی خاک میں
آج رخصت ہو گیا اس بزم سے اقبالؒ بھی — بن گئی تاریخ ماضی داستانِ حال بھی
آں حکیم ایشیا آں ترجمان دینِ حق — آں کلیم عصر نو آں شارح آئینِ حق
اس نوا پرداز آں دارائے اسرار و رموز — آں ملک پرداز آں بینائے اسرار و رموز
آنکہ رازِ زندگی بردیدۂ انساں کشاد — ملتِ مارا نویدِ زندگی تازہ داد
از نوایش روحِ من در جسم من بیدار شد — از جمالش دیدۂ من محرم اسرار شد
معنی حرف حیات و موت فہمیدم ازد — ہرچہ دیدم در سرائے آب و گل دیدم ازد
آتشِ عشقِ نبیؐ افروخت در پہلوئے من — شد چراغِ محفل عرفاں ضیائے روئے من
ملت ما راز زنجیر اجل آزاد کرد — رفت از مادہ کنارِ موت را آباد کرد
اب حیات و موت کے اسرار بتلائے گا کون — عظمتِ اسلام کی تاریخ دوہرائے گا کون
کون دوہرائے گا اب افسانۂ ضربِ کلیمؑ — کون بتلائے گا اب اسرارِ قرآنِ حکیم
کون دے گا اب ہمیں پیغام فاروقؓ و علیؓ — تو ہے فردوسِ بریں میں محو دیدارِ نبیؐ
کس سے اب جا کر سنیں ترک و عرب کی داستاں — کون دکھائے ہمیں شاں حجازی کے نشان
کون دے گا اب خبر غرناطہ و بغداد کی — اپنی دنیا تو نے گردوں سے پرے آباد کی
تیرے ماتم میں بسر کر دیں گے ماہ و سال ہم — روئیں گے صبح قیامت تک تجھے اقبالؒ ہم

## مدفنِ اقبال رحمۃ اللہ

فقیر کا جنازہ جب جاوید منزل سے نکلا تو اسے پنجاب کے چار وزیروں نے اٹھایا ہوا تھا۔ جنازے کے اگلے پائے سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ پنجاب اور لالہ منوہر لعل وزیر مالیات پنجاب نے اور پچھلے پائے میاں عبدالحیٔ وزیر تعلیم پنجاب اور سر چھوٹو رام وزیر تجارت وصنعت

نے تھامے ہوئے تھے۔ منوہر لعل گورنر پنجاب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو شاہی مسجد کے دروازے کے پاس دفن کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک وفد گورنر پنجاب سے اجازت لینے کے لیے گورنر ہاؤس گیا۔ گورنر نے وفد کو بتایا کہ وہ زمین حکومت پنجاب کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے بلکہ مرکز کے محکمۂ آثار قدیمہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ گورنر نے لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند سے ٹیلی فون پر اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ صبح کے سات آٹھ بجے کا وقت تھا لیکن وائسرائے سو رہے تھے۔ گورنر نے تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے کو پھر فون کیا اور علامہ کی وفات کی خبر سنا کر علامہ کو شاہی مسجد کی دیوار کے سائے میں دفن کرنے کی اجازت حاصل کی۔

جب میری اہلیہ پہلی بار میرے پاس فیروز پور آئی تو معلوم ہوا کہ اس نے لاہور نہیں دیکھا۔ چنانچہ ایک اتوار کو لاہور کی سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ لاہور پہنچ کر اسے چڑیا گھر، عجائب گھر، شاہی قلعہ، رنجیت سنگھ کی بارہ دری اور شاہی مسجد دکھائی اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور سر سکندر حیات کے مزاروں کی زیارت کرائی۔ ہم نے ان مزاروں پر فاتحہ پڑھی۔ رات کو فیروز پور واپس پہنچ کر میں نے سیر لاہور کے عنوان سے ایک نظم کہی۔ اس میں علامہ کے مزار کا ذکر یوں کیا ہے ؂

آئے پھر باچشم تر ہم مرقدِ اقبالؒ پر
اور بھی اک آسمان ٹوٹا دل پامال پر
جلوہ آرا مرقدِ شاعر پہ اس کی یاد تھی
وہ فضا اک نغمہ خاموش سے آباد تھی
کہہ رہا تھا مجھ سے اے دیوانۂ شعر و غزل
ہو گیا سنسان کیوں میخانۂ شعر و غزل
اب تری باتوں میں رنگِ بے نیازی کیوں نہیں
تیرے پیمانے میں صہبائے حجازی کیوں نہیں
تیری محفل میں نہیں ذکرِ خدائے لم یزل
آج پھر کیوں بن گیا تو بندۂ لات ذہبل
ہو گیا نا آشنائے جلوہ گاہِ طور پھر
دل کو چشمِ سامری نے کر لیا مسحور پھر

غنچہ و گل دشمنِ فصل بہاری ہو گئے
نوجواں تہذیبِ مغرب کے پجاری ہو گئے
دیکھ گردوں گیر ہے تہذیب مغرب کی کمند
گرگ کے پنجے سے کب تک بچ سکے گا گوسفند
فتنۂ باطل سے اے جانِ صداقت ہوشیار
مغربی جادو سے اے فرزندِ ملت ہوشیار
اے گفتارِ الم یکسر پیام عید ہو
رحمت حق سے کسی ساعت نہ بے امید ہو
بزم ہستی میں ترا نغمہ مسرت خیز ہے
میری صہبا سے تیری مینائے دل لبریز ہے

## نقشِ سویدا

انہیں ایام میں مَیں نے نقشِ سویدا کے نام سے ایک طویل قومی نظم لکھی جس کے ایک بند میں شاعرِ مشرق کو اس طرح یاد کیا ۔

ہوا روپوش اقبالؒ نو پرواز مدفن میں
عنا دل آج نوحہ گر ہیں ہر سو صحنِ گلشن میں
نچھاور ہو رہے ہیں شاعر مشرق کے رستے پر
مہکتے تھے جو گلہائے خیاں حوروں کے دامن میں
نثار اس نے کیے جو لتِ بیضا کی شوکت پر
سمندر میں گہر ایسے نہ دریا میں نہ معدن میں
حضور مصطفیٰؐ میں لے گیا وہ ساری امت کو
وہ نظارے دکھائے جو نہ تھے وادیٔ ایمن میں
شبابِ عشق مجھ پر پھٹ پڑا گلزارِ ہستی میں
سنی اس کی نوائے لا الٰہ جس دم لڑکپن میں

اسی کے نغمۂ جاں بخش نے پہلے پہل ڈالے
ریاضِ عشق کے گلہائے تازہ میرے دامن میں
اسی کے شعلہ ہائے شوق نے اے ہم نشیں ڈالا
شۂ کونین کا طوقِ غلامی میری گردن میں
اُسی کے فکر سے رازِ مسلمانی کو سمجھا ہوں
اُسی کے فیض سے اسرارِ قرآنی کو سمجھا ہوں

## تابوتِ افغانی مزارِ اقبال رحمۃ اللہ پر

مولانا سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ کی بلند و بالا شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے۔ آپ نے ترکی میں وفات پائی تھی اور ان کا تابوت مبارک وہیں دفن تھا۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں حکومت افغانستان نے سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ کا تابوت ترکی سے کابل لانے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۴ء کو یہ تابوت لاہور پہنچا اور شاہی مسجد میں فاتحہ خوانی کے بعد عوام کی زیارت کے لیے شاعر مشرق کے مزار کے پہلو میں رکھا گیا۔ اس موقع پر میں نے حسب ذیل اشعار کہے جو روزنامہ شہباز میں شائع ہوئے :

نظر آیا مزارِ شاعر مشرق کے پہلو میں
مجھے جس وقت تابوت جمال الدین افغانی
طلوعِ مہر و مہ ہے ایک ہی مطلع سے میں سمجھا
دو عالم ہو گئے جلوہ نما اک جا بآسانی
نواحِ عرش میں دونوں کی روحیں کل ملیں باہم
طے روئے زمیں پر آج دونوں کے تنِ فانی
کشش کتنی ہے خاکِ شاعر اسلام میں مسلم
کہ آئی خودبخود پروانہ بن کر شمعِ عرفانی
یہ کیا اعجاز ہے مردانِ حق مر کر بھی زندہ ہیں
ہے زیرِ خاک بھی ذوق محبت کی فراوانی

پیام زندگی دیتے ہیں ذرے خاکِ تربت کے
کہ مٹی کے یہ تودے ہیں خزینے علم وحکمت کے
صدا تابوتِ افغانیؒ سے میرے کان میں آئی
کہ اے اسلام کی شان گزشتہ کے تمنائی
کبھی سوچا بھی یہ، کیوں قوم کو ادبار نے گھیرا
ہوئی جلوہ گرِ اقوام میں کیوں تری رسوائی
نظر کو کر لیا محروم قرآں کے حقائق سے
حرم میں تو نے پیدا کر دیا رنگِ کلیسائی
کیا تھا ختم جس نے قیصر و کسریٰ کی شوکت کو
سپرد گوشۂ نسیاں ہے وہ شمشیر آبائی
مرے پیش نظر اس شاعرِ مشرق کا مدفن ہے
کہ چشم کور جس کی خاک سے پاتی ہے بینائی
گزشتہ عظمتوں کو یاد کرکے عمر بھر رویا
اُسے بھولی نہ دینِ مصطفیٰ کی عالم آرائی
سُنا تو نے پیام اس کا مگر سمجھا نہ راز اُس کا
مفسّر ہے کلام اللہ کا ہر تارِ ساز اُس کا

## مولانا حسین احمد رحمہ اللہ اور اقبال رحمہ اللہ

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے کسی تقریر میں کہا ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔'' اس پر علامہ اقبال نے فارسی میں وہ اشعار کہے جو برصغیر کے اسلامی حلقوں میں مولانا حسین احمد کی شہرت کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں تحریک پاکستان کے سلسلے میں مولانا حسین احمد اور دوسرے کانگریسی مسلمانوں نے پھر جغرافیائی وطنیت کا نعرہ بلند کیا تو علامہ کے وہی فارسی اشعار پھر اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ اشعار نوائے وقت میں بھی چھپے۔ میں نے علامہ کے ان اشعار کو تضمین کرکے مخمس بنایا۔ یہ مخمس جو درج ذیل ہے اس زمانے میں روزنامہ نوائے

وقت میں شائع ہوئی ؎

جو جانتا نہیں جینا وہ جانے کیا مرنا
حرم سے ٹوٹ کے دشوار ہے بسر کرنا
جہاں میں ہر کہیں رہنا عرب کا دم بھرنا
عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
حدودِ ہند و سمرقند و چیں سے ہے پابست
ہے فکر بادۂ جام کنشت سے سرمست
حرم کو چھوڑ کے بت خانے سے ہوا پیوست
سرور برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقامِ محمدؐ عربیست
روا نہیں ہے تمیز جمال و صورت و پوست
جہاں میں متحد اک لا الٰہ سے ہیں سب دوست
متاعِ فخر نہ دہلی نہ اصفہاں نہ خوست
بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باد نہ رسیدی تمام بو لہبیت

## اقبال رحمہ اللہ کا فیضان

میں نے اپنی زندگی میں برصغیر کے بہت سے علماء، فضلاء، صوفیا، شعرا، اور قائدین کو دیکھا۔ ان میں سے اکثر کا قرب بھی حاصل کیا لیکن شاعر مشرق علامہ اقبال رحمہ اللہ کو اپنے مشن کی تبلیغ میں بےلوث اور بےغرض پایا۔

مجھے ۱۸ برس (۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۸ء تک) علامہ کی خدمت میں بار ہا حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے دوسرے عقیدت مندوں سے ان کی باتیں سننے کا بھی دن رات موقع ملا۔ میں نے ان سے اور اُن کے کلام سے بےحد فیض حاصل کیا۔ دوست مجھ سے پوچھتے تھے کہ

تمہیں اقبال سے کیا ملا؟ میں کہتا تھا صرف دولتِ لا الٰہ الا اللہ۔ وہ دولت جو قرآن مجید کی بنا ہے۔ جو اسلام کی بنیاد ہے۔ جس دولت کو تقسیم کرنے کے لیے حضور رسالتِ دنیا میں تشریف لائے۔ جس دولت سے خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام مالا مال ہوئے۔ میں آج بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میں نے علامہ سے صرف دولتِ لا الٰہ حاصل کی۔ یہ دولت آج بھی اسی فراوانی سے موجود ہے کم نہیں ہوئی۔ لٹ نہیں گئی۔ یہ لٹنے سے اور بڑھتی ہے۔ میری یہ خواہش تھی کہ مجھے جو کچھ علامہ کے کلام سے حاصل ہوا اسے دوسرے بھی حاصل کریں۔ چونکہ علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی زبان میں ہے اور بعض لوگ فارسی نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں۔ میں نے ان کی سہولت کے لیے علامہ کی مثنویوں (اسرار و رموز پس چہ باید کرد اور مسافر) کا منظوم اردو ترجمہ ترجمانِ اقبال کے نام سے کر دیا۔ اس سے پہلے میں علامہ کی شہرہ آفاق مثنوی جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ کر چکا ہوں۔ اب یہ شائقین کا کام ہے کہ وہ اس کلام سے وہ گنجِ گراں بہا حاصل کر لیں جو مجھے حاصل ہوا۔ ترجمانِ اقبال میں اشعار کی کل تعداد ۲۹۴۲ ہے۔ ان میں ۶۹ اشعار میری جانب سے عرضِ حاصل کے طور پر آئے ہیں۔ باقی ۲۸۷۳ اشعار علامہ کے کلام کا ترجمہ ہیں۔

## علامہ کا مشن

علامہ کا مشن کیا ہے۔ وہی جو قرآن حکیم کا مشن ہے۔ جو اسلام کا مشن ہے۔ جو حضور رسالت مآب ﷺ کا مشن ہے۔ وہ دس بارہ نکات ہیں جو [انھوں] نے عمر بھر اپنے اردو اور فارسی کلام میں مختلف انداز، مختلف اسالیب اور مختلف حکایات اور تمثیلوں کے ذریعے بیان کیے ہیں۔ وہ نکات کیا ہیں؟ توحید و رسالت، اخوت (اتحاد بین المسلمین، فلسفۂ حیات و موت، خودی، عظمت آدم، نظریۂ قوم و وطن، جد و جہد (جہاد) دین و سیاست اور عظمت اسلام کی تبلیغ اور امتیازاتِ نسل و نسب و رنگ، فرقہ بندی، مغربی تعلیم و تہذیب، مغربی سیاست و جمہوریت اور اسلام دشمن نظریات کی مذمت۔

علامہ مغربی تہذیب و تمدن، فرنگی تعلیم کے مقاصد، یورپ کی لا دین سیاست اور جمہوریت سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے فرنگی نظریات کو اسلام کے منافی اور دین و ایمان کے دشمن قرار دیا ہے مگر افسوس ہے کہ پاکستان میں جو [انھیں] کا مجوزہ وطن ہے، ان کی تعلیم اور

ان کے مقاصد کے بالکل خلاف عمل کیا جارہا ہے۔انہوں نے جاوید نامہ میں مغربی تہذیب وتمدن کے دلدادہ مسلمانوں کو ''مسلمانانِ فرنگی مآب'' کہا ہے اور اپنے صاحبزادے جاوید (اور نژادنو) کو ان سے دور رہنے کی تلقین کی ہے اور انہیں ''دشمن دیں اور اہلِ کیں'' قرار دیا ہے مگر افسوس ہے کہ مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں مغربی تہذیب (مغربی فیشن) اور عیسائیت کی تقلید کررہے ہیں۔حتیٰ کہ اپنے قومی تہوار اور بچوں کی سالگرہ تک عیسائی طریقے سے مناتے ہیں اور اپنے نام تک عیسائیوں کے سے رکھتے ہیں۔

بعض علماء فرقہ بندی کو ہوا دے رہے ہیں۔ میں نے یہ تمام حالات اپنی ایک نعتیہ نظم ''عرض حال'' میں بھی بیان کیے ہیں جو ماہنامہ ضیائے حرم میں چھپی تھی۔ملک میں سال میں دوبار (۲۱اپریل اور ۹نومبر کو) یوم اقبال رحمۃ اللہ علیہ منایا جاتا ہے۔ جرائد ورسائل میں گراں بہا مضامین لکھے جاتے ہیں۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اقبالیات پر بہت کچھ کہا جاتا ہے مگر اقبال کے کلام کے اُس حصے سے دامن بالکل چھڑالیا جاتا ہے جو تہذیب مغرب کی مذمت کے بارے میں ہے جس میں مغربی تعلیم وتمدن یورپ کی لادین سیاست اور ''فتنۂ فرنگ'' کی قلعی کھولی گئی ہے۔

وائے ما اے وائے ما اے وائے ما (۲)

حواشی: از صابر کلوروی

(۱) Look With In۔

❁❁❁

# اقبال رحمۃ اللہ •

آغا حیدر حسن مرزا

پہلے پہل میں نے چوتھی جماعت میں اقبال رحمۃ اللہ کی نظم پرندے کی فریاد پڑھی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ اُستادوں کے نام ہدایتیں آئی تھیں کہ نہ کان پکڑوائیں نہ لڑکوں کو مرغا بنائیں، نہ اُٹھک بیٹھک کرائیں اور نہ ان کی انگلیاں قلموں کے شکنجے میں کسی جائیں، نہ کان مروڑے جائیں، نہ ہاتھوں پر بینتیں ماری جائیں اور نہ الٹے ہاتھ کر کے ان پر انگوٹھیوں کی مار پڑے بلکہ بچوں کو کھیل کھلائے جائیں اور نظمیں حفظ کرا کر ان کو گوایا جائے۔ میری بچپن میں آواز پپیہا سی تھی۔ میں نے پہلے پرندے کی فریاد حفظ کر کے اور گا کر سنائی۔ دوسری نظم بچے کی دعا یاد کی اور گائی۔ پہلی نظم کا میرے

• بصد شکریہ، آج کل ۱۵ اپریل 1947، بحوالہ، صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین۔ ص 3629۔ آغا حیدر حسن مرزا دہلی کی بیگماتی زبان کے ماہر، نرم نازک لہجہ اور دلکش اندازِ بیان۔ وہ ہر محفل میں طوطئ ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے۔ حیدر آباد کے اعلیٰ طبقے میں بے حد مقبول تھے، لوگ پکڑ کر لے جاتے اور اپنا مہمان بناتے۔ بے ضرر انسان تھے، ان کے منہ سے کسی کی برائی نہیں سُنی۔ امیروں کے علاوہ معمولی لوگوں سے بھی ان کا یارانہ تھا۔ ان کی زبان سے کسی کی غیبت نہیں سنی گئی۔ سر اکبر حیدری کے دوست تھے۔ آخری زمانے میں سر اکبر حیدری اور لیڈی حیدری ان سے کچھ بدظن ہو گئے تھے۔ علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کر کے تلاشِ روزگار میں حیدر آباد پہنچے تو سر راس مسعود نے ان کا تعارف سر اکبر حیدری سے کرایا۔ سر اکبر حیدری کی دلچسپی سے پہلے پولیس کے محکمے میں سب انسپکٹر ہوئے۔ سر راس مسعود نے انہیں نظام کالج میں لیکچرار مقرر کرا دیا اور لیکچرار کی حیثیت سے پنشن لی۔ انہیں نوادر جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ دکنی اُردو کے نایاب نسخے ان کے پاس تھے۔ آخری عمر میں کچھ عرصہ پیرس میں بھی گزارا۔ ۱۹۶۵ء میں ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ (بحوالہ یادوں کی دنیا از یوسف حسین خاں)۔

ننھے منے دل پر یہ اثر ہوا کہ لال پدڑیاں، بئے اور گُلدم پالنے کا شوق خاندانی تھا۔ میں نے پنجروں کی کھڑکیاں کھول کر سب اڑا دیئے اور گُلدموں کی پٹیاں اور پودے کھول کر ان کو بھی آزاد کیا اور ایسی اس فعل سے خوشی ہوئی کہ شاید کسی بادشاہ کو ملک آزاد کرنے سے نہ ہو گی۔ دوسری نظم جب میں نے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر گا کر پڑھی تو میرے ہاں کی تمام مغلانیاں اور مامائیں جو قدیم تھیں، چٹ چٹ بلائیں لینے لگیں اور میری دوا حسین خانم نے جھٹ کالا دانہ مجھ پر سے اُتارا۔ میں اپنے جی میں بڑا اِترایا کہ آج بھی اس اِتراہٹ کا خیال آتا ہے تو دل کا کنول کھل جاتا ہے...... ہاں یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کس کی نظمیں ہیں۔ پہلی دفعہ مخزن میں ان کا مرثیہ "سسلی" پڑھا اور معلوم ہوا کہ شیخ محمد اقبال کوئی پنجاب کے بیرسٹر ہیں، انہوں نے لکھا ہے۔ میرا گھرانہ زبان کے معاملے میں بڑا تنگ خیال اور کوتاہ نظر تھا۔ دِلّی میں اپنے سے اچھی اردو کسی کی نہ سمجھتے اور دِلّی سے اچھی اُردو کسی باہر والے کی نہ جانتے۔ مجھے اس مرثیہ کو پڑھ کر شوق ہوا کہ بغداد کے لیے بلبلِ شیراز کے نالے سنوں اور جہان آباد پر داغ کے خونیں آنسو دیکھوں۔ تلاش کر کے یہ چیزیں نکالیں اور اس طرح میری ادبی تحقیق کی ابتداء ہوئی۔ البتہ ابن بدرون نے جو غرناطہ میں فریاد کی تھی، اُس سے اب تک کان نا آشنا کیا رہے، آنکھیں محروم رہیں۔ جس دردِ دل سے انہوں نے معصوموں کے لیے دعا لکھی تھی ویسی ہی قبولیت اس کو روزی ہوئی...... زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری...... ایسی گھڑی میں مانگی گئی کہ قبول ہوئی اور اب اس کے شکریے میں گانے کو جی چاہتا ہے ع

کہ مثالِ شمع گزری میری ساری زندگانی

ان کا کلام رسالوں میں شوق سے پڑھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا، انگریزی پڑھے لکھوں کی ان کے کلام کے متعلق آرا سنتا۔ یہاں تک کہ علی گڑھ کی درس گاہ میں میری خوش قسمتی سے ایسے طالب علموں میں میل جول ہو گیا جو علی گڑھ کے گرانڈی سمجھے جاتے۔ ان میں سے ایک صاحب ملک غلام محمد تھے جو آج کل سَر غلام محمد ہیں ہیں اُن کو اس زمانے میں سارے ہندوستان کے مشاہیر کے حالات از بر تھے۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح ہر رہنما، قائد ملت، سیاس ادیب، شار، قومی شاعروں کی سوانح عمریاں موجود نہ تھیں۔ البتہ اخباروں اور رسالوں میں ان مشاہیر کے حالات لکھے جاتے، چونکہ یہ اخبار پابندی سے پڑھتے تھے ان کو ان سب کے حالات خوب یاد تھے اور اپنی اس ہمہ دانی کا رعب ہم سب پر خوب جماتے، انہی حضرت کی بدولت

اقبال میں کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ دِلّی میں اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے الفاظ میں الجھ کر رہ جاتے۔ اب اقبال کے درخشاں تخیل کے راستے میں الفاظ اس طرح پس کر ذرہ ذرہ ہو جاتے کہ اپنی جگہ پر وہ بھی آفتاب بن کر چمکنے لگتے۔ پھر جب درسگاہ کی زندگی ختم ہوئی تو رات دن نواب مسعود جنگ مرحوم کے ساتھ رہنا ہوا۔ ان کو استادوں کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ اقبال بھی ان کے دماغ میں محفوظ تھے۔ (اللہ ان کو غریق رحمت کرے) جوش میں آ کر خوب مزے سے سناتے تھے۔ ان کی وجہ سے شام کی نشست نواب سر حیدر جنگ کے ہاں ہوگئی تھی، وہاں اقبال مرحوم کا کلام مسعود مرحوم سنایا کرتے اور سب جھومتے۔ مسعود صاحب اقبال کی قدردانی میں بہت فراخ حوصلہ تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ سر محمد اقبال مرحوم کو عثمانیہ یونیورسٹی کی زینت بنائیں مگر ان کا دانہ پانی یہاں کا نہ تھا کیسے آتے۔ سر یمین السلطنت مرحوم سے خوب یاد اللہ تھی لیکن یہاں کھینچا نہیں۔ سر اکبر حیدری نے مولوی عبدالحق صاحب کو سنا ہے بلانے کو بھیجا، وہ لاہور گئے۔ باتیں جانے کیا ہوئیں، یہاں کا پیام کس طرح دیا اور وہاں کا جواب کن الفاظ میں لائے کہ اقبال تو یہاں نہ آئے، البتہ ہزار روپے ان کی پرورش کے خیال سے نواب صدر اعظم بہادر نے بھجوائے۔ روپے تو واپس آ گئے لیکن سر اکبر حیدری مرحوم کا نام ارمغانِ حجاز کی بدولت شاعروں کی غیرت مند دنیا میں غیر فانی ہو گیا۔ اسی ارمغان میں مسعود مرحوم کا بھی مرثیہ ہے۔

کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے تو کیوں کہوں

محبت اور احسان مندی بھرے دماغ کو لفظوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ آپ میں سے بہت سے حضرات ایسے ہوں گے جنہوں نے حضرتِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہے اور دیکھنا کیسا! بعضے تو ایسے بھی ہوں گے جو مدتوں اُن کے ساتھ رہے سہے ہوں گے، ان کے لیے میری باتیں ایسی ہی ہوں گی کہ نانی کے سامنے ننھیال کی باتیں...... کیوں کہ رہنا سہنا تو کجا یہاں اُن کی صورت بھی نہ دیکھی۔ اکثر پڑھنے والوں کو مجھ سے توقع ہوگی کہ میں اپنی طرز کو نبھانے، ان کا ناک نقشہ آپ کے سامنے لفظوں میں کھینچوں اور لفظوں کے جادو سے آپ کے کانوں کی آنکھوں کے سامنے ان کو پیش کر دوں، یہ مجھ سے ناممکن ہے۔

ہاں لیجیے، سنیے! پہلی دفعہ ۱۹۱۳ء میں لاہور گیا، ایک دوست تھے لاہور ہی کے رہنے والے حکیم احمد شجاع صاحب، ان سے ملنا تھا۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جاتے جو حضرت اقبال سے بھی

مل لیتا لیکن مجھے دوسروں کی بدولت اُن سے ملنا پسند نہ آیا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور رستے میں پڑا، لاہور کی سیر کو اُترا، کشمیر کے طفیل اور حضرتِ اقبال رحمہ اللہ کی زیارت، جی نے مکروہ جانا اور یہ ارادہ کیا کہ حیدرآباد سے دِلّی تک ریل میں جاؤں اور دِلّی سے پیدل ہو کر زیارت کی نیت باندھ کر پاؤں پاؤں چلتا ہوا لاہور پہنچوں۔ ان کی چوکھٹ پر بیٹھ کر ذرا سانس کو بحال کروں۔ اندر ادب سے داخل ہوں، ان کے ہاتھ چوموں اور اپنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاؤں۔ پوچھیں کون ہے؟ عرض کروں، جاہل زائر۔ فرمائیں کیوں آیا؟ عرض کروں، زیارت کے لیے۔ وہ کہیں کیوں دیکھ لیا؟ اور میں الٹے پاؤں واپس ہو کر دکن چلا آؤں۔ زبان کو کوکو لے جائے اور چپ لگ جائے۔ دل و دماغ باتیں کریں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ایک بار دیکھا، دوسری کی ہوس ہے۔ نہ دیکھا نہ آرزو پوری ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں پھر کشمیر کی ٹھانی اور لاہور اترنا ہوا۔ اب کی دفعہ جناب عبداللہ چغتائی صاحب سمجھا کر گھسیٹ کر اُن کی گلی تک لے گئے۔ گلی کے دونوں طرف کچے کھنڈر تھے۔ سامنے چوپہل پیل چوپایوں کا پھاٹک کھلا تھا، بن چمن کی انگنائی۔ اس کے بعد ایک برآمدہ، اس میں ایک چارپائی بچھی، پاس ایک پنجابی حُقہ رکھا۔ مُونڈھوں، کرسیوں پر کچھ آدمی بیٹھے۔ ایک صاحب تکیوں کا ٹیکا لیے آدھے لیٹے، چارخانے کا چادرا پڑا۔ صورت دیکھی ہو تو اللہ وہاں دیدار نہ دکھائے۔ اک دم اپنی بے ادبی کا احساس ہوا اور وہیں سے بندہ فوراً واپس۔ بہتیرا ساتھیوں نے روکا لیکن کشمیر کے طفیل اور حضرت اقبال رحمہ اللہ کی آستاں بوسی ایمان نے نہ مانا اور چلا آیا...... اس کے بعد وہ حیدرآباد تشریف لائے۔ نگر گھر کہوں یا ایوانِ مدینہ۔ آپ نے تو ٹاؤن ہال سنا ہوگا، بس وہیں جلسہ ہوا۔ سر یمین السلطنت مرحوم کے ہاں مشاعرہ ہوا، گھر میں چھپا بیٹھا رہا لیکن سنا کہ سب کی بولیاں سنا کیے اور چپ بیٹھے رہے۔ جن صاحب سے یہ روایت سنی البتہ اُن کے ایک شعر پر فرمایا، پھر پڑھیئے۔ ان ہی صاحب کا بیان ہے کہ انداز ایسا پُرمعنی تھا کہ وہ نہ سمجھ سکے کہ غلطی پر ٹوکے گئے ہیں یا تعریف ہے۔ میں نے تو اس دفعہ بھی کسی جلسے میں جانے کی کوشش نہ کی۔ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس آجائے تو سب کو اچنبھا ہوتا ہے، اس لیے گھر ہی سے نہ نکلا۔ اس جذبے کو تقویت شریمتی پدمجا دیوی نے اور دی، کہا ''نہ تم صورت دیکھو، نہ تم پڑھتے سنو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' یہاں جملہ شرعی تو پہلے ہی سے موجود تھا، یہ رائے اور ہاتھ آئی۔ پھر دیکھنا اور سننا ہی نصیب نہ ہوا۔

# صیقلِ اِدراک•

آفتاب اقبال بیرسٹرایٹ لاء(۱)

میں پوری صداقتِ دل کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جو نسبت ایک ذرہ بے مقدار کو آفتابِ عالمتاب سے ہے وہی نسبت مجھ کو اپنے عظیم المرتبت والد سے ہے۔ اگر کوئی تابندگی میری زندگی میں آپ کو نظر آئی تو اس کا سرچشمہ اور منبع وہی آفتابِ تاباں ہے جس کا میں ایک ذرہ ہوں۔ مجھ میں واقعی اگر کوئی خوبی ہے جس کا نہ مجھ کو علم ہے نہ دعویٰ تو وہ یقیناً میرے عدیم المثال والد کا ترکہ اور میرے بزرگوں کی دعاؤں کا صدقہ ہوگا۔

میں اپنی خداداد طبیعت کے بارے میں خدائے قدوس کا بے حد شکر گزار ہوں، میرے بزرگ دادا شیخ نور محمد صاحب نے مجھے بارہا نصیحت کی تھی کہ ایک خدا کا جاننے والا سوائے خدا کے کسی کے سامنے نہیں جھکتا اور نہ اپنے حسب نسب پر فخر کیا کرتا ہے، شکر ہے کہ آج تک نہ میں کسی انسان سے ڈرا اور نہ میں استخوانِ بزرگ فروش بنا۔ میں نے کبھی اپنے باپ کے نام کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ جنگِ زندگی میں نہ کسی سے کسی قسم کی مدد کا طلبگار ہوا کیونکہ یہ میرے والد بزرگوار کی تعلیم اور میری طبیعت کے سراسر خلاف تھا۔ والد مرحوم نے حسب ذیل اشعار میں جو اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ عکس میں اپنے اندر بھی ضرور دیکھتا ہوں۔

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر خاک میری طاقتِ پرواز
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ اِدراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک

• بصد شکریہ، ساغر کراچی 25 دسمبر 1967، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین ص 256-258۔

وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرق ناک

پھر کہا ؎

یارب یہ جہان گزراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہُنر مند
تو برگ گیا ہے نہ وہی اہلِ خرد را
او کشت گل و لالہ بہ بخشد بخرے چند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بیں و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ و ماوند
ہوں آتشِ نمردد کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند
پُرسوز و نظر بازو نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوق شکرخند
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا مُنہ بند

رہی میری پریشانیاں، ان کے لیے صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں ؎

میں کیوں کہوں کہ غمِ زندگی گراں گزرا
وہ ساتھ ساتھ رہے ہیں جہاں جہاں گزرا
رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

اقبال جیسے شاعر، مفکر اور لیڈر دنیا کی تاریخ میں خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کی اُن بڑی ہستیوں میں سے تھے جن کی عظمت وقت کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی مثال ایک ایسے عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہے جس کی بلندی اور عظمت کا صحیح اندازہ اس کے قریب کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتا۔ آنے والی نسلیں اقبال کو ہم سے بہتر سمجھ سکیں گی اور ان کی تعلیم ان کے لیے مشعلِ راہ ہو گی۔ میں جب دنیائے اسلام کی موجودہ حالت پر غور کرتا ہوں تو معاً مجھے ان کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے ؎

اندھیری شب ہے جُدا اپنے قافلہ سے ہے تُو
تیرے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) آفتاب اقبال...... علامہ کی پہلی بیوی کریم بی بی کی دوسری اولاد، ولادت ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۱ء میں لندن سے بیرسٹری کی، کلکتہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر بھی رہے۔ ۱۹۴۱ء تک اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں وکالت کا آغاز کیا۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کراچی منتقل ہو گئے اور تادمِ وفات یہیں پریکٹس کرتے رہے۔ آفتاب اقبال اور ان کی والدہ سے علامہ کے تعلقات کشیدہ رہے۔

# علامہ اقبال •

آقا بیدار بخت/ انٹرویو ثریا احمد

میں علامہ اقبال رحمہ اللہ کی علمیت، شخصیت، فضیلت اور علو مرتبت سے اس قدر مرعوب تھا کہ ان کی خدمت میں جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جب میں نے دار العلوم الشرقیہ لاہور کی بنیاد رکھی تو اپنے بہنوئی مولوی دین محمد مرحوم ایڈیٹر میونسپل گزٹ کا تعارفی خط لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اس درسگاہ کا افتتاح فرمائیں۔ حضرت علامہ نہایت شفقت سے پیش آئے مگر ناسازیٔ طبع کی بنا پر میری درخواست تو منظور نہ کر سکے البتہ اسی وقت دعا فرمائی کہ خدائے عز و جل اس درسگاہ کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور اس حقیقت کا میں بڑے فخر سے اعتراف کرتا ہوں کہ دار العلوم نے جس طرح کامیابی کے مراحل طے کیے وہ حضرت علامہ کی اس پر خلوص دعا کی برکت کا نتیجہ تھے۔

❁❁❁

• بصد شکریہ رسالہ کرن مجلہ لاہور کالج برائے خواتین، ۱۹۷۷، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین۔ ص 113۔

# میرے بچپن کی سنہری یادداشت •(۱)

اے رزاق (۲)

میرے بزرگ بھائی عبدالقادر صاحب بمبئی کے معزز میونسپل کونسلر تھے۔ کاروباری شغف کے علاوہ ادب اور گیان سے بھی تعلق تھا۔ وہ وسیع النظر انسان تھے اور اخلاق، مذہب اور انسانیت کے بلند اصولوں کے پرستار تھے۔ فلسفے سے ان کے شغف کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے اپنے کاروبار میں تار کا پتہ لفظ ''غالب'' رکھا ہوا تھا۔ یہ تمام حقائق ان کے مزاج کی گہرائی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسلامیات اور عربیات ان کی دلچسپی، ذوق وشوق اور توجہ کے مرکز تھے۔ ان کے اسی شغف ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہمارے ہاں تشریف لائے اور انہوں نے اپنے کلام میں سے یہ نظم ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا (۳)

ترنم سے سنائی۔ بھائی صاحب نے مجھے ان کی خدمت میں پیش کیا اور میں ان کے حضور باادب حاضر ہوا اور ان کی بزرگی سے متاثر ہوا۔ علامہ کی آواز گونجدار تھی اور جب وہ اپنے کلام کو ترنم سے سناتے تھے تو مجھے بے حد لطف آتا تھا اور میں ان کو بہت اچھا سمجھتا تھا۔

آج جب کہ وہ نہ صرف ہمارے پاکستان کے اُفق پر ایک سنہری ستارے کی طرح تاباں ہیں بلکہ اسلام کے اُفق کو بھی زینت بخش رہے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنے بچپن میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے جو مختصر مواقع ملے ہیں وہ میری زندگی کی تعمیر کے لیے نعمت

• بصد شکریہ، صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین۔ ص 23۔24۔

ہیں۔علامہ اقبال کا اثر ہر مسلمان کے قلب پر انفرادی طور پر ہے اور تمام مسلمانانِ عالم کی حیات پر مجموعی طور پر ہے جس طرح ہر مفکر کا فلسفہ اپنے پیروؤں کو متاثر کرتا ہے اقبال بھی آج ہمارے سارے عالم اسلام کو متاثر کرتا ہے۔

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) شائع شدہ، ساغر کراچی ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء

(۲) سیکرٹری آدم جی انڈسٹریز

(۳) علامہ کے یہ اشعار "ترانہ ملی" کے اشعار ہیں جو بانگ درا میں موجود ہے۔ یہ شعر یہاں درست طور پر نقل نہیں ہوا۔

# علامہ اقبال کے حضور......ایک عظیم ناول نگار •

ایم اسلم

لاہور میں علامہ اقبال کے جس خاندان سے مراسم بہت گہرے تھے وہ لاہور کا مشہور ''میاں'' خاندان ہے جو حسن اتفاق سے اقبال کے آبائی وطن...... کشمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ لاہور کے اس معزز خاندان کے ایک بزرگ میاں نظام الدین رئیس اعظم لاہور تھے۔ موصوف آنریری مجسٹریٹ اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اعزازی تاحیات صدر تھے۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے ایک مضمون میں میاں صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ رئیس شہر ہونے کے باوجود انتہائی سادہ مزاج ہنس مکھ، بے ریا اور کم گو تھے۔ دوستوں اور قوم کی فلاح و بہبود ان کا مقصد دلی تھا۔ علامہ سے دوستانہ تعلقات تھے وہ آموں کے موسم میں علامہ اقبال کو دعوت دیتے تو علامہ اپنے بعض نیاز مندوں مہر، سالک، چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وغیرہ کی معیت میں شریک ہوتے۔ علامہ ان لوگوں کو لے کر صبح ہی صبح میاں صاحب کے دولت کدے پر پہنچ جاتے وہاں باغ جانے کے لئے سواریوں پر بیٹھنے سے پہلے ایک ایک گلاس دودھ پلایا جاتا۔ باغ میں کنوؤں کے چوبچے قسم قسم کے آموں سے بھرے ہوتے علامہ کے لئے چارپائی بچھی ہوتی۔ میاں صاحب علامہ صاحب کے ساتھ بیٹھ جاتے اور سب لوگ آم کھاتے واپسی پر ہر ایک کے اہل خانہ کے لئے ایک ایک ٹوکرا آم بھجوادیتے۔ میاں نظام الدین مرحوم کے صاحبزادے مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس ایم اسلم ہیں انہیں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کے حقیقی بھانجے میاں صلاح الدین سے علامہ کی صاحبزادی منیرہ کی شادی ہوئی نیز انہیں بڑی کثرت سے علامہ کی

• بحوالہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ، ص 124-139۔

صحبت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔اس کے باوجود انہوں نے بعض وجوہات کی بناء پر اپنی یادداشتیں قلمبند کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ۱۹۷۱ء میں جام نو کراچی کا ''ایم اسلم نمبر'' شائع ہوا تو اس سے غالباً پہلی مرتبہ ہم ایسے لوگوں کو معلوم ہوا کہ علامہ اقبال سے ایم اسلم کے صرف خاندانی مراسم ہی نہیں ہیں بلکہ وہ علامہ اقبال کی شاگردی کے شرف کے حامل بھی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جنوری ۱۹۷۳ء کے آغاز میں برادر محترم عابد نظامی صاحب کی معرفت ایم اسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جنہوں نے کمال شفقت سے میرے سوالات کا جواب دیا۔ اس لئے میرے لئے یہ ممکن ہوا کہ میں علامہ اقبال کے بارے میں ان کی یادداشتوں کو مرتب کرسکوں۔ اس سلسلے میں مجھے اعتراف ہے کہ ماہنامہ جام نو کے مذکورہ نمبر میں شامل مضامین ''میں اسلم ہوں'' از ایم اسلم ''علامہ اقبال اور ایم اسلم'' از عابد نظامی ''ایم اسلم'' اور ''ایم اسلم ایک شاعر'' از پروفیسر خالد بزمی سے مجھے خاصی مدد ملی ہے۔

## علامہ اقبال پروفیسر کی حیثیت سے

میٹرک کرنے کے بعد ایم اسلم صاحب ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اسی زمانہ میں علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے تھے اور اس طرح ایم اسلم کو علامہ سے اکتساب علم کی سعادت حاصل ہوئی۔میاں صاحب کے بیان کی رو سے ان کی جماعت پچیس تیس طلبہ پر مشتمل تھی۔ اور انگریزی کا مضمون دو استاد پڑھاتے تھے۔ پروفیسر گلبرٹ (Gilbert) اور پروفیسر محمد اقبال۔ اول الذکر کے ذمے انگریزی کی تدریس تھی اور وہ سر والٹر سکاٹ (Sir Walter Scott) کا مشہور ناول ''اوان ہو'' Ivanhoe اور "The Roman Life in the Days of Cicero" پڑھاتے تھے۔ یہ کتابیں بہت دلچسپ تھیں لیکن ان کا پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ طلبہ جلدی اکتا جاتے تھے۔ پروفیسر اقبال کے ذمے انگریزی نظم پڑھانا تھا وہ ہفتے میں دو پیریڈ ایف اے کے لیتے تھے اور اونچی جماعتوں کو فلسفہ پڑھاتے تھے۔ ایف اے کے نصاب میں مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن (Tennyson) کے کلام کا انتخاب لاریٹ (Laureate) شامل تھا۔ ہر پیریڈ تقریباً پون گھنٹہ کا ہوتا تھا۔ علامہ اس زمانے میں ایک قومی شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر ابھر رہے تھے۔ اس لئے طلبہ ان کا بہت

احترام کرتے تھے اور وہ بھی استاد کی حیثیت سے بڑی محنت سے اپنا لیکچر تیار کر کے آتے تھے۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ کمرہ جماعت میں داخل ہونے کے فوراً بعد طلبہ کی حاضری لیتے اور اس کے بعد بڑی خوبصورتی اور صفائی سے نظم کا ایک بند (Stanza) پڑھتے اور بورڈ پر لکھتے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہر بند کے مختلف حصوں کے لئے ہم معنی اردو اور فارسی اشعار لکھ دیتے کبھی کبھی اپنے اشعار بھی استعمال کرتے اور کبھی کبھی عربی کا ایک آدھ شعر بھی لکھ دیتے سب سے پہلے ان اشعار کی اس طرح تشریح کرتے جس سے ان اشعار کی فنی خوبیوں پر بھی روشنی پڑتی تھی۔ اس مرحلے کے بعد زیر بحث انگریزی اشعار کی طرف متوجہ ہوتے اور ایسے دلنشین پیرائے میں ان کا مطلب بیان کرتے کہ تقریباً مکمل مفہوم اور شعر نزاکتیں واضح ہو جاتیں۔ طلبہ بھی لیکچر کے ضروری ضروری نکات ساتھ ساتھ نوٹ کرتے جاتے خصوصاً جو کچھ علامہ بورڈ پر لکھتے وہ لازماً طلبہ کی بیاضوں میں محفوظ ہو جاتا۔ یہ تمام لیکچر انگریزی میں ہوتا۔

علامہ اقبال کا یہ قاعدہ تھا کہ سبق تھوڑا پڑھاتے جو عام طور پر ایک بند (Stanza) سے زیادہ نہ ہوتا اور یہ بند خواہ چھ مصرعوں کا ہوتا یا نو مصرعوں کا۔ جب اپنا موضوع مکمل کر لیتے تو کمرہ جماعت سے چلے جاتے خواہ ابھی گھنٹی ہونے میں دس پندرہ منٹ باقی ہی کیوں نہ ہوتے۔ دوران تدریس وہ ہمیشہ سنجیدہ اور پروقار رہتے تھے۔ اور بعض اساتذہ کے طریق کار کے برعکس صرف اپنے موضوع ہی سے تعلق رکھتے۔ ادھر ادھر کی باتیں انہوں نے کبھی نہیں کیں اور نہ ٹرخانے کی کوشش کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ تیاری کر کے آتے تھے۔ انہوں نے شاید ہی کسی طالب علم کا آموختہ سنا ہو۔ وہ کتاب کی قراءت (Reading) بھی نہیں کراتے تھے بلکہ خود پڑھتے تھے۔ اسی طرح وہ ہفتہ وار یا ماہانہ آزمائشی پرچے لینے کے بھی قائل نہ تھے۔

ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا دلکش تھا کہ غالباً ان کے گھنٹے میں تمام اساتذہ کے مقابلہ میں زیادہ حاضری رہتی جو ان کی مقبولیت اور لیاقت کا منہ بولتا ثبوت تھا وہ پنجابی طلبہ کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف تھے اس لئے انگریزی الفاظ کی ادائیگی میں بہت احتیاط برتتے جس سے ایک ایک لفظ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ اتنا موثر ہوتا کہ سبق کلاس ہی میں یاد ہو جاتا۔

علامہ اقبال کی ایک دلچسپ عادت تھی کہ وہ کمرہ جماعت میں داخل ہونے کے بعد تختہ

سیاہ کے اس رخ کو جو پہلے سے طلبہ کی طرف ہوتا الٹا دیتے اور خود دوسرے یا الٹے رخ کو استعمال کرتے ممکن ہے کہ ان کے پیش نظر طلبہ کی سہولت ہو کہ اگر کوئی طالب علم پہلے گھنٹے کے نوٹس نہیں لکھ سکا تو مٹا دینے سے اس کا حرج نہ ہو۔ اسلم صاجب نے اس عادت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک روز ان کے آنے سے پیشتر تختہ سیاہ کی الٹی طرف مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن (Tennyson) کی ایک نظم بعنوان "And we kissed again with tears" کا منظوم اردو ترجمہ لکھ دیا۔ اس میں ایسے میاں بیوی کا ذکر ہے جو اپنے مرحوم بچے کی قبر پر جا رہے ہیں لیکن باہم ناراض ہیں اور ان کی ہر بات سے ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے لیکن جب بچے کی قبر پر پہنچتے ہیں تو ناراضگی کافور ہو جاتی ہے۔ اس نظم کا آخری بند اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے:۔

پہنچے جب گور پر اس طور سے دونوں باہم
ماتم لخت جگر میں تھیں نگاہیں پرنم
ابھی چند روز ہوئے ہم نے جسے کھویا تھا
چھوڑ کر ہم کو وہ اب قبر کی آغوش میں سویا تھا
اپنے بچے کی اسی چھوٹی سی پھر تربت پر
ہم نے کس پیار سے بوسے لئے پھر رو رو کر

علامہ آئے تو حسب معمول تختہ سیاہ کو الٹایا تو اس طرف اشعار لکھے دیکھ کر سنجیدگی سے صرف اتنا پوچھا "Who wrote this" اس پر اسلم صاحب نے کھڑے ہو کر ادب سے جواب دیا۔ "Sir I have written this" اس مختصر سے مکالمے کے بعد آپ سبق پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

اس دور میں گورنمنٹ کالج میں جو دیسی ارکان تھے ان میں سب سے زیادہ عزت و احترام کی نگاہ سے صرف علامہ اقبال کو دیکھا جاتا تھا۔ انہی لوگوں میں انگریزی کے ایک متعصب ہندو اسسٹنٹ پروفیسر مسٹر کھوسلہ تھے وہ ایف اے کے طلبہ کو ترجمہ کی مشق کراتے تھے ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ از راہ تعصب چن کردہ پیراترجمے کے لئے دیتے جس میں کسی نہ کسی پہلو سے مسلمان بزرگوں کی توہین اور مسلمانوں کی دل آزاری کا پہلو نکلتا تھا۔ ایک دن انہوں نے معمول سے زیادہ دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا طلبہ تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے اسلم صاحب نے فوراً کھڑے

ہو کر کہا۔ "Sir how long will you abuse our conscience" یعنی آپ کب تک ہمارے ضمیر کو کچوکے لگاتے رہیں گے۔

پروفیسر کھوسلہ نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں غیض و غضب کا اظہار کیا۔ "Get out" چلے جاؤ۔

اس پر تمام طلبہ کمرہ جماعت سے احتجاج کی صورت میں باہر نکل گئے اور لان میں جا بیٹھے۔ اگرچہ طلبہ نے کوئی ہنگامہ وغیرہ نہیں کیا تاہم اس طرح انہوں نے مسٹر کھوسلہ کے خلاف اپنے جذبات کا زبردست مظاہرہ کیا۔ دو دن تک یہ مقاطعہ جاری رہا۔ بعض سرکردہ طلبہ مثلاً خواجہ صادق وغیرہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے طلبہ کے دینی جذبہ کو سراہتے ہوئے ہڑتال ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ اگلے دن کالج کے پرنسپل مسٹر رابسن نے جو اپنی سخت مزاجی کے لئے مشہور تھے۔ طلبہ کو اکٹھا کیا۔ پیشتر اس کے کہ مسٹر رابسن کچھ کہتے اسلم صاحب نے کھڑے ہو کر کہا "Sir I beg to say......" ان کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی اس نے سختی سے کہا۔

"I give you one hour otherwise I shall expel you out"

یعنی ایک گھنٹے کے اندر اندر جماعتوں میں حاضر ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں کالج سے نکال دوں گا۔ بہر حال طلبہ تو علامہ اقبال کے مشورہ کے مطابق پہلے ہی پڑھنے پر آمادہ ہو چکے تھے وہ تو صرف اپنا مدعا پرنسپل صاحب تک پہنچانا چاہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر رابسن نے پروفیسر کھوسلہ کو بھی سخت ڈانٹ پلائی کیونکہ اس کے بعد ان صاحب نے پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔

## انقلاب انگیز مشورہ

ایم اسلم صاحب اسکول کے زمانہ ہی میں شعر و شاعری کا شغل اختیار کر چکے تھے اور خوشی محمد ناظر (علیگ) سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے تھے کالج میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کا یہ شغل رہا۔ گورنمنٹ کالج میں ہر سال، سالانہ امتحانات کے نتائج کے موقعہ پر تقسیم انعامات کی تقریب میں فطری شاعری کے لئے بھی ایک انعام مخصوص تھا جس کا نام "Prize for natural poetry" تھا۔ جس اتالیقی گروپ (Tutorial group) میں ایم اسلم تھے اس

کے نگران شعبہ کیمسٹری کے پروفیسر جونز (Johns.B.M ) تھے۔وہ ہمیشہ اس امر کے خواہش مند رہتے کہ زیادہ سے زیادہ انعامات ان کے فریق کے حصے میں آئیں۔ ۱۰۔۱۹۰۹ء میں شاعری کا جومقابلہ ہوا۔اس کے لئے مسٹر جونز نے ایم اسلم کوایک نظم لکھنے کاحکم دیا انہوں نے ''وسط ایشیا'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جب نظم تیار ہوگئی تو انہوں نے اپنے اتالیق کے سپرد کردی جنہوں نے اس کوعلامہ اقبال کی خدمت میں پیش کیا کیونکہ آپ اس مقابلے کے مستقل منصف تھے۔اس مرتبہ تقریباً تیس بتیس (۳۰۔۳۲) نظمیں پیش کی گئیں۔علامہ اقبال نے ایم اسلم کی نظم کواول قرار دیا یہ نظم تیس چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔چنداشعاردرج ذیل ہیں۔

پھر بلا لے اپنے ویرانوں میں وسط ایشیا
اب تو خاکہ ہند میں میرا گزارا ہو چکا
پھر چھپا لئے اپنے دامانوں میں ھندوکش مجھے
یاد پھر آتے ہیں منظر وہ ترے دل خوش مجھے
بات لیکن جو ترے سنسان ویرانوں میں تھی
صورت آبادی میں بھی اس کی نہیں ملتی کبھی
تھا جہاں صدق وصفاواں مکر ہے اور جھوٹ ہے
سچ کہا ہے میوہ اس ہندوستان کا پھوٹ ہے

تقسیم انعامات کے جلسے کی صدارت صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر نے کی۔اس تقریب میں کالج کے پروفیسروں،طالب علموں کے علاوہ شہر کے معززین بھی شریک تھے۔ایم اسلم کواول انعام دیا گیااوراسی محفل میں ایک ڈرامہ پیش کیا گیاجس کے بعدانہوں نے اپنی نظم ترنم سے سنائی علامہ اقبال کے خادم خاص علی بخش مرحوم کوبھی اس محفل میں ایم اسلم کی نظم سننے کااتفاق ہوا۔

ان دونوں علامہ اقبال بھاٹی دروازے کے ایک مکان میں فروکش تھےاسلم صاحب ہفتے میں ایک دومرتبہ ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔تقسیم انعامات کے جلسے کے اگلے روز کالج میں چھٹی تھی۔اسلم صاحب علامہ کے ہاں پہنچےتومشہور فارسی شاعراورنظام دکن کے استاد مولانا گرامی جالندھری بھی موجود تھے جو اکثر علامہ سے ملنے کے لئے لاہورآتے اورکئی کئی دن تک آپ کے ہاں قیام کرتے تھے۔گرمیوں کاموسم تھادونوں بزرگ اپنی اپنی چارپائی پردراز

تھے۔چھت میں لٹکا ہوا پنکھا علی بخش کھینچ رہا تھا۔اسلم صاحب نے حسب معمول بڑے ادب سے سلام عرض کیا۔دونوں بزرگوں نے شفقت سے جواب دیا۔تقریباً اسی وقت علی بخش نے پنجابی میں کہا۔"واہ اسلم جی! راتیں تسیں حد کر دتی" (واہ اسلم صاحب رات آپ نے کمال کر دیا) مولانا گرامی اونچا سنتے تھے۔انہوں نے علی بخش سے پنجابی میں دریافت کیا "کیہہ گل اے؟" (کیا بات ہے؟) علی بخش نے گزشتہ رات کی تقریب اور اسلم صاحب کی نظم کا ذکر کیا جو بہت پسند کی گئی تھی۔یہ سن کر مولانا گرامی نے فرمایا "او منڈیا کجھ سانوں بھی سنا" (اے لڑکے کچھ ہمیں بھی سناؤ) میاں صاحب نے چونکہ کبھی علامہ کی موجودگی میں شعر نہیں پڑھا تھا اس لئے وہ خاموش رہے۔مولانا گرامی نے غالباً اس خاموشی کو اپنی توہین خیال کیا اور گرج کر کہا "او منڈیا توں سنیا نئیں؟" (ارے لڑکے کیا تو نے میری بات نہیں سنی) اسلم صاحب نے علامہ کی طرف دیکھا جنہوں نے اجازت دی تو اسلم صاحب نے جھجکتے ہوئے ایک شعر سنایا ؎

قیس اڑائے نہ جنوں سے جو کبھی گرد و غبار
سرمہ پھر زیب وہ چشم غزالاں نہ رہے

یہ سن کر گرامی صاحب بولے "یہ تے تیرے استاد دا رنگ اے کجھ ہور سنا" (یہ تو تمہارے استاد کا رنگ ہے کچھ اور سناؤ) اس جملے میں استاد سے مراد علامہ اقبال تھے کیونکہ وہ اسلم صاحب کے کالج میں پروفیسر تھے ورنہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اسلم صاحب خوشی محمد ناظر سے اصلاح لیتے تھے۔لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا گرامی حضرت علامہ ہی کو اسلم صاحب کا استاد سمجھتے تھے بہرحال مولانا گرامی کے ارشاد کی تعمیل میں ایک شعر اور سنایا ؎

جس طرح سے بنے گزارا کر
اب زمانہ نہیں شکایت کا

اقبال اب تک خاموش رہے تھے یہ شعر سن کر انہوں نے فرمایا "پھر پڑھو" یہ علامہ کے داد دینے کا طریقہ تھا۔اسلم صاحب نے شعر دہرایا۔علامہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمانے لگے "اسلم شعر مت کہا کرو نثر لکھا کرو" اس ایک جملے نے اسلم صاحب کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔انہوں نے "شاعری" چھوڑ دی۔لیکن سوال یہ تھا کہ لکھا کیا جائے۔انہوں نے ایک روز علامہ سے اپنی الجھن کا ذکر کیا کہ نثر میں ناول اور افسانے ہی لکھے جا سکتے ہیں اور یہ اکثر بے

مقصد ہوتے ہیں اس کا کیا کیا جائے؟ اقبال نے فرمایا ''تم افسانہ لکھو یا ناول وہ بے مقصد نہیں ہونا چاہیے'' اسی طرح ایک روز فرمایا ''جو کچھ لکھو قومی نقطہ نظر سے لکھو''۔

میاں صاحب کے والد کو ان کے افسانہ نگاری کا شغل بالکل پسند نہیں تھا ایک دن علامہ اقبال ان کے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے اس کی شکایت کی اور کہا کہ وہ اسلم کو افسانے وغیرہ لکھنے میں وقت ضائع کرنے سے منع کریں اس پر علامہ نے مسکرا کر فرمایا۔

''میں نے اسلم کو ہدایت کر دی ہے کہ جو کچھ لکھے کسی مقصد کے تحت لکھے۔ مقصد کے تحت لکھنا برا نہیں'' ظاہر ہے یہاں مقصد سے قومی مقصد مراد ہے جس کے لئے خود علامہ اقبال نے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دی تھیں۔ بہر حال علامہ کی مردم شناسی اور اصابت رائے کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے اسلم صاحب کو جو مشورہ دیا وہ انہیں بہت زیادہ راس آیا۔ میاں صاحب نے پوری یکسوئی سے اس میدان میں کام شروع کر دیا اور جلد ہی غیر معمولی شہرت وعظمت کے مالک بن گئے۔ اگر وہ شعروشاعری ہی کرتے رہتے تو شاید اونچے شاعر نہ بن سکتے۔

## مسلم نوجوانوں کی تربیت

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ علامہ نے بعض طلبہ کے ذوق وشوق سے متاثر ہو کر یہ پروگرام بنایا کہ وہ اپنے دوست مرزا جلال الدین کی کوٹھی پر دس بارہ مخصوص طلبہ کو جمع کرتے اور ان کے سامنے اپنے اس کلام کی تشریح فرماتے جو انہوں نے انجمن حمایت اسلام وغیرہ کے اجلاسوں میں پڑھا اور کتابچوں کی صورت میں شائع کیا جا چکا تھا۔ اس محفل خاص میں ایم اسلم کو بھی شرکت کا موقع ملا یہ سلسلہ تقریباً ایک مہینہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد اچانک منقطع ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انسپکٹر جنرل پولیس (پنجاب) جو علامہ اقبال کا ذاتی طور پر قدر دان تھا ایک دن علامہ سے کہنے لگا کہ آپ کی محفل خاص کے شرکاء میں دو چار ہمارے (سرکاری) مخبر بھی ہیں تو علامہ نے اپنے کلام کی تشریح کا کام ختم کر دیا۔

## ''مرزا امینڈ کی'' سے ''مرزا جی'' تک

ایم اسلم صاحب نے ایک مرتبہ مشہور امریکی ادیب مارک ٹوین (Mark Twain)

کے ایک انشائیے "his jumping frog Jim Smiley" کا آزاد ترجمہ ''مرزا مینڈکی''
کے نام سے کیا جو اس وقت کے مشہور ادبی رسالے نیرنگ خیال میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک
روز اسلم صاحب علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے مسکراتے ہوئے یہ فقرہ
چست کیا ''لو مرزا مینڈکی آ گئے'' چودھری محمد حسین بھی پاس بیٹھے تھے انہوں نے کہا کہ ''علامہ
تمہارا ترجمہ پڑھ چکے ہیں'' چونکہ اس زمانے میں کانگریس کا بڑا زور تھا۔ علامہ نے اسی بناء پر
ارشاد فرمایا ''اسلم صاحب! جس انداز میں تم نے مرزا مینڈکی لکھا ہے اسی رنگ میں کانگریس کے
متعلق لکھو'' اس ضمن میں انہوں نے کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ علامہ اقبال کی تعمیل حکم میں ایم
اسلم صاحب نے مزاحیہ انداز میں کانگریس کے خلاف کئی مضامین لکھے جن میں ہندو نیتاؤں کی
کافرانہ ذہنیت اور کہیں کہیں ''شریمتی کانگریس بائی'' کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ پھر ان مضامین کو انہوں
نے ایک مجموعے کی صورت میں ''مرزا جی'' کے نام سے شائع کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ لیکن ''ہندو
جاتی'' اس پوسٹ مارٹم کی تاب نہ لا سکی۔ ہندو پریس نے اس کتاب اور مصنف کے خلاف طوفان
بدتمیزی برپا کر دیا۔ مشہور ہندو اخباروں، ٹریبون (لاہور) اور امرت بازار پتریکا (کلکتہ) نے بھی
خوب زہر اگلا حکومت سے مطالبہ ہونے لگا کہ ''مرزا جی'' کو فی الفور ضبط کیا جائے۔ مصنف پر
مقدمہ چلایا جائے وغیرہ۔ بہت سے اخباروں نے مطالبہ کیا کہ ایم اسلم کو پنجاب بدر کیا جائے۔
دوسری طرف مسلم پریس چپ سادھے ہوئے تھا۔ صرف ماہنامہ ساقی (دہلی) اور انگریزی
روزنامہ اسٹیٹسمین (کلکتہ) میں ایم اسلم کی حمایت میں کچھ شائع ہوا۔ اس پر اسلم صاحب اور خصوصاً
ان کے والد ماجد نظام الدین مرحوم بہت پریشان ہوئے۔ علامہ اقبال کو خبر ہوئی تو انہوں نے
میاں نظام الدین کو تسلی دی اور فرمایا ''میاں صاحب فکر نہ کریں انشاء اللہ اسلم کا بال تک بیکا نہ ہوگا''۔
ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر حکومت پنجاب کے سیکرٹری مسٹر گاربٹ نے حکم دیا کہ ایم اسلم
کی کتابوں میں ہندوؤں کے نقطہ نظر سے جو قابل اعتراض تحریریں ہوں ان کا ترجمہ پیش کیا
ئے۔ یہ صاحب بہت سخت گیر مشہور تھے لیکن انہیں کوئی قانون نہ مل سکا جس کی مدد سے وہ میاں
صاحب کی ان تحریروں پر انہیں سزا دے سکتا۔ آخر کار حکومت پنجاب کی طرف سے ایک پریس
ٹ شائع ہوا جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ایم اسلم نے خلافت پارٹی، احرار پارٹی اور کانگریس
رٹی کی سرگرمیوں پر مزاحیہ انداز میں تنقید کی ہے لہٰذا کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا۔ آخری الفاظ کچھ

اس قسم کے تھے:

"Book is humorous and harmless, there fore no action is needed"

اس طرح علامہ اقبال کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ "اسلم کا بال تک بیکانہ ہوگا"

## انقلاب اسلام

مئی ۱۹۳۴ء کی بات ہے اسلم صاحب کوہ مری جا رہے تھے۔ جانے سے ایک دو روز پیشتر آپ حسب معمول علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد آپ نے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر رکھی ہوئی دو چار انگریزی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی اس کتاب کا نام "The Political and Religious Revolution in Islam" تھا اور ایک آسٹریلین نو مسلم فیلکس ویلائی (Felex Vilai) نے لکھی تھی۔ علامہ نے یہ کتاب اسلم صاحب کو دی اور فرمایا "یہ کتاب لے جاؤ اور اسے اپنے انداز میں اردو میں منتقل کر دو" اسلم صاحب کتاب ساتھ لے گئے اور بڑی محنت سے ترجمہ کیا اور اس کا عنوان انقلاب اسلام رکھا۔ ڈھائی تین مہینے بعد جب مری سے واپس آئے تو ایک روز مسودہ اور اصل کتاب لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے علامہ نے مسودہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا "بڑی ہمت کی تم نے" اور مسودہ رکھ لیا چند دن بعد جب اسلم صاحب پھر ان کی خدمت میں گئے تو علامہ نے بہت تحسین و آفرین کی اور اسلم صاحب کی درخواست پر حوصلہ افزائی کے لئے پانچ سات سطریں بطور تبصرہ لکھ دیں مسودے پر کئی ایک جگہ اصلاح بھی فرمائی۔ اس سے علامہ کے احساس ذمہ داری کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک مقام پر مسٹر گاندھی کا بھی ذکر تھا حضرت علامہ نے مسودے کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھا تھا "گاندھی بین الاقوامی مساوات کا حامی نہیں فیلکس ویلائی کا خیال بالکل غلط ہے اور ہندوستان کی سیاست سے اس کی بے خبری کی دلیل ہے" اسلم صاحب اس کتاب کی اشاعت کی فکر میں تھے کہ ایک روز ایک ملنے والے جو بڑے علم دوست سمجھے جاتے تھے آ گئے۔ باتوں باتوں میں انقلاب اسلام کا ذکر آ گیا وہ دو ایک روز میں واپس کرنے کے وعدے پر مسودہ مستعار لے گئے لیکن پھر نہ وہ لوٹ کر آئے نہ مسودہ بھیجا۔ اسلم صاحب نے اس واقعہ کا ذکر علامہ

سے بھی کیا۔ اس واقعے کے تقریباً ۱۲ سال بعد گم گشتہ مسودہ اچانک مل گیا کوئی دوست امرتسر سے لے کر آئے تھے۔ استفسار پر فرمانے لگے کہ فلاں مقام پر یہ کتاب ردی کے بھاؤ بک رہی تھی میری نظر اس پر جا پڑی تو ردی کے حساب سے تلوا کر لے آیا۔'' اسلم صاحب بہت خوش ہوئے دوست کا شکریہ ادا کیا لیکن انہیں اس امر کا ہمیشہ افسوس رہا کہ کتاب پر علامہ اقبال کی تعریفی و تعارف تحریر والا صفحہ کہیں گم ہو چکا تھا۔ یہ کتاب اب چھپ چکی ہے اور غالباً نایاب ہے اس کا مطبوعہ نسخہ مجھے ایم اسلم کی مہربانی سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے آغاز میں اسلم صاحب کے مسودے کے ایک صفحہ کا عکس بھی شامل ہے جس پر علامہ اقبال کے ہاتھوں سے اصلاح کا نمونہ بھی ہے۔ اگر اصل مسودے پر علامہ اقبال کی اصلاحات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے علامہ کی شخصیت کے مطالعے میں خاصی سہولت پیدا ہو گی۔ بہر حال اس کتاب کے موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کو ۱۹۳۴ء میں اپنی وفات سے تین چار سال پیشتر بھی مسلمانوں کی بیداری کا کس قدر خیال تھا اور وہ اپنی ملت کے نوجوانوں کو ایسے علمی کاموں کے لئے ہمیشہ آمادہ کرتے رہتے تھے جو بعد میں ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنیں۔

ایم اسلام نے انقلاب اسلام (مسلمانان عالم کا سیاسی پس منظر) مطبوعہ دارالبلاغ لاہور کا پس منظر کتاب کے صفحہ نمبر ۳ تا ۵ پر ''بارہ سال بعد'' کے عنوان سے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے:۔

۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں کوہ مری جانے سے پیشتر ایک روز میں استاد مکرم حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ حضرت علامہ کرسی پر بیٹھے تھے پاس ہی ایک اور کرسی پر دو تین کتابیں رکھی تھیں۔ حضرت مرحوم و مغفور نے ان میں سے ایک کتاب دی پولیٹیکل اینڈ ریلجس ریوولیوشن ان اسلام The Political and Religious Revolution in Islam مصنفہ فیلکس ویلائی (آسٹرین نومسلم) اٹھا کر مجھے دی اور ارشاد فرمایا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کروں اور اگر ہو سکے تو اسے اردو میں منتقل کر دوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو ایک دو روز میں تبدیل آب و ہوا کے لئے کوہ مری جا رہا ہوں ارشاد فرمایا کہ ''کتاب ساتھ لے جاؤ'' کچھ دیر بعد میں اجازت لے کر واپس چلا آیا۔

پہاڑ پر آ کر میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا فیلکس ویلائی کی اس مشہور عالم

کتاب کا ترجمہ یورپ کی اکثر زبانوں میں بھی ہو چکا تھا۔ میں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق اسے اردو میں منتقل کر دیا اور کتاب اور ترجمہ پیش کر دیا آپ ترجمہ دیکھ کر ذرا مسکرائے اور فرمایا ''بڑی ہمت کا کام ہے'' مسودہ آپ نے دیکھنے کو رکھ لیا۔

چند روز بعد جب میں پھر حاضر ہوا تو حضرت ممدوح نے مسودہ مجھے واپس عنایت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کہیں دو ایک جگہ نوٹ لکھ دیا گیا ہے اب اسے جلد شائع کروا دو۔ میں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ اگر مناسب ہو تو کتاب کے متعلق اپنے دست مبارک سے کچھ لکھ دیں۔ قلم دوات کرسی کے پاس رکھی تھی جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے حضرت علامہ نے پانچ سات سطریں لکھ کر کاغذ مجھے دے دیا اور میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے حضرت علامہ کی تحریر بھی مسودہ میں شامل کر لی۔

میں نے واپس آ کر جب مسودہ دیکھا تو استاد مکرم نے بہت سے مقامات پر اپنے قلم سے کچھ اصلاح اور درستی بھی فرمائی تھی۔

اب میں یہ کتاب شائع کرنے کی فکر میں تھا کہ ایک روز ایک صاحب ملنے تشریف لے آئے۔ میں نے جب مسودہ کا ذکر کیا تو انہوں نے مسودہ پڑھنے کی خواہش ظاہر فرمائی اور دو تین روز میں مسودہ واپس کر دینے کا وعدہ کیا میں نام تو نہیں بتلانا چاہتا لیکن آدمی چونکہ بظاہر معقول تھے میں نے مسودہ دے دیا اور وہ نامعقول آدمی مسودہ لے کر ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کچھ روز بعد میں نے یہ تمام واقعہ حضرت علامہ کی خدمت میں عرض کر دیا اور آپ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے پورے بارہ سال گزر گئے نہ وہ صاحب خود تشریف لائے نہ مجھے مسودہ واپس ملا۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے اختتام پر ایک عجیب اتفاق سے مسودہ مجھے مل گیا۔ مسودہ ملنے کی تو جو خوشی ہوئی سو ہوئی لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی بے حد ہوا کہ حضرت علامہ کی تحریر غائب تھی آج اتنی مدت کے بعد مجھے اس تحریر میں سے صرف ایک فقرہ یاد ہے:

''یہ کتاب ہر پڑھے لکھے مسلمان کو پڑھنی اور اپنے ناخواندہ بھائیوں کو پڑھ کر سنانی چاہئے''

ان الفاظ کے بعد حضرت علامہ کے دستخط تھے۔

## قرآن کا احترام

میں نے متعدد مرتبہ قرآن مجید کو ان کے مطالعے کی میز پر دیگر کتابوں کے ساتھ پڑ

دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے ادب کے ساتھ انہیں اس طرف متوجہ کیا تو فرمانے لگے یہ کسی قیمتی اور خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر اور عطر میں بسا کر اونچی جگہ پر رکھنے والی کتاب نہیں بلکہ یہ تو انسان کے ہر وقت کام آنے والی کتاب ہے۔ چونکہ مجھے اکثر اس کے حوالے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے یہاں رکھی ہے۔" اس پر مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کی نگاہ میں قرآن مجید کی عظمت اور تقدس کا سبب اور معیار کیا تھا۔

## بقاءدوام

ایم اسلم صاحب نے اولاد سے محرومی کی بناء پر اپنی ہمشیرہ کی بچی لے کر پرورش کی۔ اس بچی کا نام اصغری تھا ایم اسلم اور ان کی بیوی اصغری کو بہت لاڈ پیار سے رکھتے تھے۔ ۲۸ اگست ۱۹۲۶ء کو یہ بچی اچانک فوت ہو گئی اس حادثہ جانکاہ سے اسلم صاحب بہت متاثر ہوئے اظہار غم کے طور پر ایک نظم "میرا بچہ" کے عنوان سے لکھی۔ علامہ کو جب اسلم صاحب کے رنج وغم کی شدت کا علم ہوا تو انہوں نے چار پانچ اشعار موت وحیات کے فلسفے پر لکھ بھیجے جواب دستیاب نہیں ہو سکے۔ علامہ نے انہیں روح اور زندگی کے موضوع پر لائبریری سے چند کتابیں بھی منگوا کر دیں ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد اسلم صاحب نے بقادوام کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو اہل نظر نے بہت پسند کیا۔ اس طرح علامہ اقبال نے شدید رنج وغم کے منفی جذبے کو تعمیری راہ پر ڈال دیا۔ ایم اسلم اس کے بعد بھی اس موضوع پر پڑھتے رہے اور کئی سال بعد انہوں نے اپنی تحقیقات کو موت کے بعد نامی کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

## ہرن کا گوشت

علامہ اقبال کو ہرن کا گوشت بہت پسند تھا اور اسلم صاحب جو شکار کے بہت شوقین رہے ہیں جب بھی شکار سے لوٹتے تو ہرن کا گوشت علامہ کی خدمت میں پیش کرتے جب زیادہ دن گزر جاتے تو پوچھتے "اسلم صاحب! ہرن کا گوشت کب کھلائیں گے"

## ختلاط مردوزن

ایک روز میاں صاحب کے گھر میں کوئی تقریب تھی میاں صاحب کے والد نے ان

سے کہا کہ جا کر علامہ سے عرض کریں کہ اگر ان کی بیگم صاحبہ بھی تقریب میں شامل ہوں تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔ میاں صاحب نے اپنے والد کا پیغام عرض کر دیا یہ سن کر علامہ خاموش ہو گئے کچھ توقف کے بعد فرمایا۔

''میاں صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کریں اور کہیں کہ میں عورتوں کا محفلوں میں مل جل کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا یہ ہمارے لئے مفید نہیں ہے''

## یونیورسٹی کا تعارف

ایک دفعہ مسلمانوں کا ایک وفد سر آغا خاں کی قیادت میں لاہور آیا ان دنوں اخبارات میں علی گڑھ یونیورسٹی کا بڑا چرچا تھا۔ سر آغا خاں کی صدارت میں برکت علی محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا اسلم صاحب بھی وہاں موجود تھے جلسہ میں حضرت علامہ نے ایک رباعی پڑھی۔

وہ رباعی یہ ہے:۔

باہر ہوئے جاتے ہو کیوں جامے سے
پوچھو کسی پنڈت سے نہ علامے سے
میں تم کو بتاتا ہوں یونیورسٹی کیا ہے
پتلون کی تکرار ہے پاجامے سے

❁❁❁

# ڈاکٹر اقبال کا بچپن●

بابا دینو/ انٹرویو منظور انور قریشی

اقبال نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات سیالکوٹ میں گزارے۔ بچپن کی آزاد فضاؤں میں ذمہ داریوں سے بے نیاز جب وہ ابھی علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی بجائے سیالکوٹ کے بچوں میں صرف ''بالا'' تھا۔ کھلنڈرا، شوخ مگر ذہین ''بالا''۔ اور میں اسی کھلنڈرے اور شوخ اقبال کی ٹوہ میں اس کے بچپن کے دوستوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ کئی دنوں کی تلاش کے بعد چند بوڑھوں کی زبانی مجھے ''دینو'' کا سراغ ملا۔ یہ وہ خوش نصیب انسان تھا جس نے پانچ سال تک شبانہ روز اقبال کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ پر پیچ گلیوں اور گھومتے ہوئے موڑوں کو طے کرنے کے بعد میں ''دینو'' کے ہاں پہنچا۔ ایک نیم پختہ پرانے مکان کے سامنے ایک بوڑھے پیپل کی چھدری چھاؤں میں بیٹھا ہوا سالخوردہ ''دینو'' نظریں جھکائے ہوئے حقہ پینے میں مصروف تھا۔ بجھی بجھی نگاہوں اور بے نور پیشانی پر ضعیفی کا سفید غلاف تہہ در تہہ چڑھا ہوا تھا۔ اس کی شریانوں میں زندگی کی حرارت آخری سنبھالے لے رہی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے حضرت علامہ اقبال کے بچپن کے متعلق اس سے کچھ ایسی معلومات حاصل کرنی ہیں تو اس نے ضعف پیری سے کانپتے ہوئے سر کو میری طرف موڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا'' آپ میرے پاس بیٹھ جائیے۔ کس کے گھر کا پتہ پوچھ رہے ہیں آپ؟''

''جی مجھے کسی کے ہاں نہیں جانا بلکہ میں آپ سے آپ کے بچپن کے ساتھی اقبال کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اقبال کا نام سن کر بوڑھے

● بصد شکریہ، نقاد، کراچی دسمبر 1950، بحوالہ جعفر بلوچ، مرتبہ مجالس اقبال، ص 325-330۔

''دینو'' کے زرد اور پچکے ہوئے گالوں میں زندگی کی بجلیاں لہرا اٹھی ہیں۔ اس کی نگاہوں میں مجھے ماضی کے چند دھندلے نقوش ابھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے اپنے اداس ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! اب سمجھا تو آپ ''بالے'' کے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں۔ اجی ہمارے لیے تو وہ نہ ڈاکٹر تھا، نہ سر تھا، نہ علامہ تھا اور نہ محمد اقبال تھا بلکہ ہمارے نزدیک وہ محض ''بالا'' تھا۔ اسے اپنے دوستوں سے والہانہ محبت تھی۔''

''آپ اسے کب اور کیسے ملے تھے؟'' میں نے دینو کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے سوال کیا۔

''جی یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ میں اقبال سے کب ملا کیونکہ یہ میرے لیے بہت مشکل سوال ہے۔ جس شخص کو زندگی کے بار مصائب نے اپنے حواس تک سے بیگانہ کر دیا ہو، وہ آپ کو کسی مخصوص آدمی کے پہلے روز ملنے کی تاریخ کس طرح بتا سکتا ہے اور وہ بھی بچپن میں۔ جب ہمیں یہ احساس ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہمارے ساتھ تالاب مولا بخش کے کنارے گرد و غبار سے اٹے ہوئے میدان میں ہر شام کو گلی ڈنڈا کھیلنے والا اقبال کسی روز اپنے لیے ایسا بلند مقام پیدا کرے گا کہ ہم سے اسے ملنے کی تاریخیں پوچھنے کی نوبت آ جائے گی۔ (کذا) ہاں البتہ میں آپ کو یہ بتا سکوں گا کہ سب سے پہلے اقبال کو میں کیسے اور کہاں ملا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز شام کو میں بازار سے گزر رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے ایک سادہ سے لڑکے سے یہ کہتے ہوئے میرا تعارف کرایا کہ یہ اقبال ہے اور بازار حکیماں میں رہتا ہے۔ مجھے پہلی ملاقات میں ہی اقبال کی غیر معمولی ذہانت اور معاملہ فہمی نے متاثر کیا۔ اس کے بعد اسی دوست کے ہمراہ گاہے گاہے اقبال سے ملاقات ہو جاتی۔ آخر ایک دن ایسا غیر معمولی واقعہ پیش آیا جس نے مجھے اور اقبال کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب کر دیا۔ اتنا قریب جیسے ہم مدتوں کے دوست تھے۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ اقبال کو کبوتر پالنے سے قدرتی لگاؤ تھا مگر پابندیوں کی وجہ سے وہ اپنا شوق پورا نہیں کر سکتا تھا۔ ان پابندیوں کی حدود میں رہ کر اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اقبال اور اس کے دوستوں نے کبوتروں کے دو جوڑے بازار کھٹیکاں کے ایک غیر آباد مکان میں رکھے ہوئے تھے۔ مسجد سے فارغ ہونے کے بعد وہ تمام دوست اسی مکان کا رخ کرتے اور گھنٹوں کبوتروں سے جی بہلایا جاتا۔ نہ جانے کس طرح اقبال کے استاد کو اس چوری کا علم ہو گیا اور ان کی تمام

سازش فاش ہوگئی۔ اب میرے گھر کا رخ کیا گیا اور وہ کبوتر میرے ہاں رکھے گئے۔ مجھے بچپن سے ہی والدین کی طرف سے اچھی خاصی آزادی تھی۔ اقبال مسجد سے فارغ ہوتے ہی اپنے ہمراز دوستوں کے ہمراہ میرے ہاں آجاتا اور گھنٹوں ٹھہرتا۔ اگرچہ بچپن ہی سے اسے سوچ بچار کی عادت سی تھی مگر کبوتروں کی ہر اڑان سے اس کی نگاہوں میں تازہ چمک پیدا ہوتی تھی۔ فضا میں جیسے کبوتروں کے ساتھ وہ بھی اڑ رہا ہے۔

مگر اقبال کے اس والہانہ شوق سے اس کی تعلیم پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ اپنے ہم جماعتوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ کبوتروں کا اتنا شوقین ہونے کے باوجود اسے اپنی تعلیم کا بے حد خیال تھا۔ وہ ہمارا نزدیکی دوست ہونے کے باوجود پڑھائی کے وقت یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اسے کھیل میں الجھایا جائے۔ ایک دفعہ چھاؤنی میں بڑے بڑے مشہور پہلوانوں کی کشتیاں تھیں۔ میں بیکار تو تھا ہی، دوستوں سے مشورہ کیا کہ دنگل دیکھنا چاہیے۔ سب دوست اکٹھے ہو کے اقبال کے ہاں جا رہے تھے۔ وہ راستے میں ہی مسجد جاتے ہوئے مل گیا اور جب ہم نے اپنی سکیم بتائی تو اقبال نے ہمارے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا بلکہ الٹا ہمیں نصیحتیں کرنی شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہم دنگل دیکھنے ہی نہ گئے بلکہ میں نے اس روز سے اقبال کے ساتھ مسجد جانا بھی شروع کر دیا۔ اقبال کو فارسی زبان سے بہت دلچسپی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں ہی اس نے گلستان و بوستان نہ صرف ازبر کر لی تھیں بلکہ وہ ہمیں اپنی قوت حافظہ کی بدولت فارسی کی ان دونوں کتابوں سے سبق پڑھا دیا کرتا تھا۔"

جب میں نے اقبال کے اس پرانے دوست سے پوچھا کہ کیا اقبال بچپن میں شعر کہا کرتے تھا یا اسے موسیقی سے کچھ رغبت تھی؟ تو اس نے گہری سوچ میں پڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو میں ٹھیک طور پر نہیں بتا سکتا کہ اقبال اس زمانہ میں شعر کہا کرتا تھا یا نہیں کیونکہ ہماری زیادہ صحبتیں کبوتر بازی اور گلی ڈنڈا کھیلنے میں ہی صرف ہوتی تھیں۔ البتہ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت جب ہمیں شعر کا صحیح مفہوم بھی معلوم نہیں تھا، اقبال ہمیں اردو اور فارسی کی نظمیں جھوم جھوم کر سنایا کرتا تھا لیکن گا کر نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے اپنی ملاقاتوں کے دوران میں اسے گاتے ہوئے نہیں سنا۔ اسے موسیقی سے دلچسپی ضرور تھی۔ خاص طور پر "ہیر" سننے کا بے حد شوق تھا۔ ہمارا ایک دوست تھا جسے ہیر کے کچھ اشعار زبانی یاد تھے۔ چاندنی راتوں میں جب ہر طرف

سکون چھا جاتا تو ہم ''تالاب شیخ مولا بخش'' یا ''پل لیگ'' کے کنارے اکٹھے ہو جاتے اور سب سے پہلا تقاضا اقبال کی طرف سے ہیر سننے کا ہوتا۔

''مگر آپ کو رات کے وقت گھر سے باہر جا کر ''ہیر'' سننے کی اجازت مل جاتی تھی؟''

''جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت تو سینما تھے اور نہ تھیٹر اور نہ کلب۔ جن کی موجودگی میں ہمارے والدین کو اخلاق بگڑنے کا خطرہ ہوتا بلکہ اس زمانے میں تو سمجھدار والدین بچوں کی صحت برقرار رکھنے کی غرض سے خود سیر کے لیے مجبور کیا کرتے تھے۔''

''اقبال کا بچپن کے زمانے میں عام لباس کیا ہوا کرتا تھا؟''

''وہ عام طور پر قمیص اور شلوار پہنا کرتا تھا کیونکہ اس زمانے میں یہی لباس زیادہ مقبول تھا۔ کبھی کبھی شلوار پر کوٹ بھی پہنے ہوئے میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس کے والد ایک پابند صوم و صلوٰۃ بزرگ تھے اور اسے شروع سے ہی دین دار لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ اس لیے اس کا لباس بالکل سادہ ہوتا تھا اور یوں بھی وہ لباس کے معاملہ میں بہت لاپرواہ تھا۔ اگر قمیص کا بٹن ٹوٹ گیا ہے تو کئی دن تک والدہ کے اصرار کے باوجود وہ ٹوٹا ہی رہتا تھا۔ اقبال کو اپنی والدہ سے اتنی محبت تھی کہ اگر وہ پرلطف سے پرلطف مجلس میں بھی بیٹھا ہوا ہوتا اور والدہ کا اندر سے پیغام آجاتا تو وہ فوراً تعمیل کرتا۔ ایک دن میں اقبال کے ہاں گیا۔ بچپن کے دوست اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے میں اندر چلا جایا کرتا تھا۔ اندر جا کر دیکھا کہ اقبال پر اس کی والدہ خفا ہو رہی ہیں اور اقبال نہایت صبر و سکون سے خاموش کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ والدہ کے دو دفعہ کہنے کے باوجود اس نے کپڑے نہ بدلنے پر اصرار کیا ہے۔ اقبال کی والدہ ایک بہت مشفق ماں تھیں، وہ جب انتہائی غصے کی حالت میں آتیں تو اقبال سے کہا کرتیں کہ جاؤ، میں تمہاری ماں نہیں اور اس روز میرے سامنے بھی انھوں نے یہ الفاظ غصے کی حالت میں کہے۔ اگلے روز جب میں پھر اقبال سے ملنے کے لیے دو ایک دوستوں کے ہمراہ حسب معمول پہنچا تو اسے سخت بخار میں مبتلا پایا۔ معلوم ہوا کہ جب بھی اسے والدہ یہ الفاظ کہتی ہیں، کہ جاؤ میں تمہاری والدہ نہیں، اس کی طبیعت پر اس قدر برا اثر پڑتا ہے کہ اسے فوراً بخار آجاتا ہے اور اقبال اکثر ہمیں خود کہا کرتا تھا کہ اگر میری والدہ مجھے چار پانچ دفعہ یہی الفاظ کہہ دے تو میں یقیناً مر جاؤں۔''

بوڑھے ''دینو'' کا دم پھولنے لگا اور اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا مگر تھوڑی دیر

کھانسنے کے بعد اس نے خود ہی اس موضوع سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہنا شروع کر دیا ''اقبال اپنے تمام بچپن کے دوستوں سے زیادہ نمازی تھا اور یہ اس کے والد کی تربیت کا اثر تھا۔ محلے کے لوگ اقبال کی ان باتوں سے یہ اندازہ لگایا کرتے تھے کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ضرور مولوی بنے گا۔ اس کے برعکس اقبال ایسی باتیں سن کر کہا کرتا تھا ''میں ہرگز مولوی نہیں بنوں گا۔''

ایک روز ہم اقبال کے گھر کے سامنے بازار میں اس کے منتظر کھڑے تھے۔ اس کے والد مکان سے باہر آئے اور بتایا کہ اقبال پاس کی مسجد میں شام کی نماز ادا کرنے گیا ہے۔ ابھی وہ یہی بتا رہے تھے کہ اقبال بھی مسجد کی طرف آ پہنچا مگر پاؤں سے ننگا۔ والد نے پوچھا، جوتا کہاں ہے؟ تو اقبال نے جواب دیا ''ابا جان، اب میں پکا نمازی بن گیا ہوں کیونکہ کسی نے مجھے نمازی سمجھ کر مسجد سے میرا جوتا اڑا لیا ہے۔'' ہمیں یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ ہم گھروں سے کتنا کتنا عرصہ غائب رہتے ہیں۔ گاہے گاہے ہم آس پاس کے کسی گاؤں میں چلے جاتے اور اقبال کو دیہات بہت پسند تھے۔ گاؤں میں پہنچ کر اسے ہوش تک نہ رہتا تھا کہ وہ شہر سے کتنی دور پہنچ گیا ہے۔ ایک دفعہ ہم حسب معمول سیر کے لیے ایک نواحی گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ہمیں بہت سے کبوتر اسی گاؤں کی طرف جاتے ہوئے ملے۔ کچھ لڑکے کہنے لگے، ان کبوتروں کو گاؤں میں جا کر دیکھنا چاہیے۔ ممکن ہے سفید کبوتروں کا ایک جوڑا مل جائے۔ ہم گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں کے کنارے ایک تکیہ تھا جس پر ایک فقیر بیٹھا تھا۔ یہ سب کبوتر اسی کے تھے۔ ہم نے اس سے سفید کبوتروں کا ایک جوڑا مانگا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ ہم سب میں سے اقبال کو اس کے انکار سے بہت زیادہ تکلیف ہوئی۔ راستے میں دو ایک دوستوں نے کبوتروں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس بات پر تو سب متفق تھے کہ کبوتر ضرور چرائے جائیں، صرف چوری کے طریقے کے بارے میں الگ الگ رائیں تھیں۔ اقبال خاموش تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو وہ ہم سب پر برس پڑا اور چوری میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ آخر ہم نے بھی چوری کا ارادہ ترک کر دیا۔

جب سب دوست گھروں کو چلے گئے تو لالو، شمے اور میں نے مل کر کبوتر چرانے کا ارادہ کیا اور کسی نہ کسی طرح کبوتروں کا ایک جوڑا اڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے دن اقبال جب میرے ہاں آیا تو کبوتروں کا یہ سفید جوڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اس وقت تو اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میرے والد نے مجھے مول لے دیئے ہیں لیکن کچھ روز کے بعد جب اقبال کو

اصل حالات سے آگاہی ہوئی تو اس نے ہمارے ساتھ ملنا جلنا چھوڑ دیا اور پورے دو مہینے ہمارے پاس نہ پھٹکا۔"

"اقبال جب لندن سے واپس آئے تو آپ سے اسی طرح ملے تھے جس طرح بچپن میں ملا کرتے تھے؟"

"ہاں بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تپاک سے۔ اسے کسی عزیز کی شادی پر سیالکوٹ آنا پڑا۔ میں ان دنوں بے روزگاری سے تنگ آکر چنگی کے محکمہ میں چپڑاسی ہو گیا تھا۔ سیالکوٹ پہنچتے ہی اقبال نے میرے گھر کا رخ کیا۔ میں نوکری پر تھا۔ گھر سے پتہ معلوم کر کے وہ سیدھا میرے دفتر پہنچا اور مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ چنگی کے محکمہ کے کلرک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اقبال تو اس وقت بھی بڑا آدمی تھا۔ لندن سے بیرسٹری کر کے آیا تھا لیکن کسی کو کیا خبر تھی کہ وہ اتنا بڑا آدمی بن جائے گا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اقبال پھر مجھ سے ملنے آئے اور بالکل بچوں کی طرح اصرار کر کے مجھ سے کہے "دینو آؤ بچپن کی باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے نا جب تم نے کبوتروں کا جوڑا اڑایا تھا تو میں نے کیا کہا تھا......؟"

دینو نے یہ کہہ کر حقے کی نے منہ سے ہٹائی اور چارپائی پر دراز ہو گیا اور میں اس سے رخصت ہو کر واپس آ گیا۔

# اِقبال رحمۃ اللہ علیہ......ایک تاثر •

بیگم محمودہ ریاض

منیرہ صلاح الدین کا گھریلو نام بانو ہے، رشتے داروں اور عزیزوں کے ہاں وہ بانو کے نام سے پہچانی جاتی ہیں مگر حضرت علامہ اقبال انہیں ہمیشہ منیرہ کہتے تھے۔ بانو پر گھر کے مذہبی ماحول کا خاصا اثر تھا۔ ایک دفعہ علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں لندن شرکت کے لیے تیار ہوئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے میرے نانا میاں نظام الدین کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے منیرہ کا ذکر بار بار کیا اور لکھا کہ میرے بچوں کی دیکھ بھال میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔ انھیں ہر قسم کی آسائش زندگی مہیا کی جائے۔ اس خط میں منیرہ کی تربیت کے بارے میں لکھا کہ اس کی پرورش خالص مذہبی اور اسلامی انداز میں کی جائے۔ علامہ منیرہ کے ساتھ انتہائی شفقت کا مظاہرہ کرتے، جب آپ لیٹتے بانو کو اپنے سینے پر بٹھا لیتے اور وہ بھی خوشی سے کودنے لگتی۔ وہ انہیں پیار کرتے، میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ منیرہ اپنے بھائی جاوید اقبال سے بہت چھوٹی تھی اور والدہ کے انتقال کے بعد حضرت علامہ پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہوگئی تھیں جن کو نبھانے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیا۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے ان کا کلام پڑھا تھا جس کا اثر آج بھی گہرا ہے۔ اب بھی اکثر اشعار مجھے ازبر ہیں ؎

حقیقت ازلی ہے رقابتِ اقوام    نگاہِ پیر فلک میں نہ میں عزیز نہ تُو

..........

رہے گا تُو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا    اُتر گیا جو تیرے دل میں لاشریک لا

• بصد شکریہ، اپنی زمین، بحوالہ صابر کلوروی، مرتبہ، اقبال کے ہم نشین، ص 261260۔

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) ڈورس احمد...... پورا نام ڈورس لینڈ ور (Doris Landwehr) ہے جو ڈاکٹر تاثیر کی سالی تھیں۔ جرمن نژاد خاتون جو علامہ کی اہلیہ کی وفات کے بعد گورنس کی حیثیت سے علامہ کے خاندان میں شامل ہیں۔

(۲) بیگم منیرہ صلاح الدین...... علامہ کی اکلوتی صاحبزادی ہیں جو لاہور کے مشہور سیاستدان صلاح الدین کی اہلیہ ہیں۔ (پیدائش: ۱۹۳۰ء) بیگم محمودہ ریاض منیرہ کے سسرالی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور میاں نظام الدین کی نواسی ہیں۔

یہ دونوں تاثراتی مضامین زرعی ترقیاتی سپلائی کارپوریشن کے رسالے اپنی زمین سے ماخوذ ہیں۔ یہ تاثرات انٹرویو کی شکل میں ریکارڈ کیے گئے تھے جسے ہم نے مضمون کا روپ دیا ہے۔

❁❁❁

# ابّا جی •

## بیگم مُنیرہ صلاح الدین

زندگی کی بے ثباتی، خوابِ ہستی کا وہ فریب ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیسے کیسے چاند مٹی میں جا ملتے ہیں کہ عقلِ انسان حیران رہ جاتی ہے۔ زندگی کا یہ جال کچھ اس طرح الجھا الجھا اور اتنا بکھرا بکھرا سا ہے کہ باوجود کوشش کے بھی، ہم اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ وقت اس طرح ذروں میں بٹ گیا ہے کہ بسا اوقات کاروبارِ حیات میں کھو کر کبھی کبھی انسان اپنے بارے میں بھی بھول جاتا ہے۔ یوں وقت کے سیلِ رواں میں بہتے ہوئے ہمیں یہ احساس تک نہیں ہو پاتا کہ کتنی حقیقتیں کب اور کس قدر خاموشی سے فسانہ بن گئیں۔ مشیت ایزدی پر مسلمان کا ایمان ہے، اس کے باوجود کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ کاش ابا جان میرے باشعور ہونے تک زندہ رہتے مگر خواہشات کا پورا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ آج بھی جب میں آنکھیں بند کرتی ہوں تو میرے سامنے ابا جی کا ہنستا مسکراتا چہرہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ابھرتا ہے۔ جہاں یہ بھولی بسری یادیں ذہن و دل کو پریشان کر سکتی ہیں وہاں اکثر تسکین قلب کا باعث بھی بنتی ہیں۔

حضرت علامہ کی وفات کے وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مسز ڈورس احمد(۱) جو ایک جرمن خاتون ہیں، میری والدۂ محترمہ کی وفات کے بعد انہوں نے ہی ہم دونوں بہن بھائیوں کو ایک مشفق ماں کی طرح پالا۔ ہماری دیکھ بھال کے علاوہ وہ تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیتی تھیں۔ ان کی حیثیت ہمارے گھر میں ایک فرد کی سی تھی۔ ایک دفعہ میں نے برجستہ انہیں کلمہ شریف سنانے کے لیے کہا، مسز ڈورس احمد نے نفی میں سر ہلایا، تب میری حیرانگی کو بھانپتے ہوئے ابا جان نے مجھے پیار سے اپنے پاس بلایا اور پیار کرتے ہوئے کہا ”ہاں ہاں منیرہ تم انہیں کلمہ شریف سناؤ“۔

• بصد شکریہ، اپنی زمین، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 259۔260۔

# علامہ اقبال سے ایک ملاقات•

پروفیسر حمید احمد خاں

گزشتہ ماہ رمضان کی ایک سہانی شام کو جب ہوا کے جھونکے گلابی جاڑے کی تازگی اور کیفیت سے بس رہے تھے، ہم علامہ اقبال سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے ساتھ میرے شعبۂ انگریزی کے رفیق پروفیسر عبدالواحد اور صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر سعید اللہ تھے۔ خزاں کا آغاز تھا، مگر موسم میں وہ جولانی تھی جو لاہور کا فرحت بخش آسمان بھی صرف کبھی کبھی زمین والوں کو عطا کرتا ہے۔ ساڑھے چار بج چکے تھے۔ سورج کے غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ فضا اجلی اور نکھری ہوئی تھی، مگر مغرب کی طرف ابر کی چند قرمزی اور نارنجی دھاریاں اُفق پر ایک لہریا سا بنا رہی تھیں۔ ہم امپرس روڈ سے ہوتے ہوئے اس چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے جو ریلوے کے بڑے دفتر کے جنوبی رُخ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ وہ سہ راہہ آیا جہاں یہ سڑک میوروڈ سے ملتی ہے اور ساتھ ہی ہم نے اس مختصر سے سفید مکان پر نظر ڈالی جہاں دورِ حاضر میں حقیقت کا سب سے بڑا ترجمان اپنی خاموش مگر ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا ہے۔ سڑک کے ساتھ صحن کی چھوٹی سی دیوار، اور اس کو پیچھے یوکلپٹس کے چار پودے جو ابھی اپنے پورے قدوقامت کو نہیں پہنچے، پھر سبزے کا ایک مختصر ساتختہ جس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے ہم مکان کی ڈیوڑھی کے پاس جا کر رُک گئے۔ اس ڈیوڑھی کی تین محرابیں اپنے ہشت پہلو ستونوں پر سڑک سے صاف نظر آتی ہیں۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ہی مکان کا برآمدہ ہے جس کے سفید پیل پائے طبیعت کو رعب و وقار کے بجائے حسن و لطافت کا اثر زیادہ دیتے ہیں۔ پرانا دوست علی بخش ہمیں دیکھ کر صحن کے

• بعد شکریہ۔ محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 117۔124۔

ایک بغلی حجرے میں سے نکلا۔ اس نے جا کر علامہ اقبال کو ہماری آمد کی اطلاع دی اور پھر فوراً واپس آ کر ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

برآمدے سے گزرتے ہی ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کا سامانِ آرائش بہت سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک تھا۔ رواق پر شاعر مشرق کی ایک تصویر، دو تین فٹ اونچی، فوراً نظر کے سامنے آ گئی۔ اسی کمرے سے ملحق بائیں ہاتھ کو علامہ اقبال کی خواب گاہ کی ایک کھڑکی برآمدے کی طرف کھلتی ہے، جس کے ساتھ ملا ہوا علامۂ ممدوح کا بستر بچھا رہتا ہے۔ اب ایک عرصہ ہو گیا تھا کہ ہم جب آتے تھے علامہ اقبال کو اسی بستر پر کبھی کبھی بیٹھے ہوئے مگر زیادہ تر لیٹے ہوئے پاتے تھے۔ لیکن وہ مجھے دن بھی یاد ہیں کہ میکلورڈ روڈ کے قیام کے دنوں میں حضرتِ علامہ اپنے خرمنِ فیض کے خوشہ چینوں کو کسی اور رنگ میں صلائے عام دیتے تھے۔ میں سڑک سے مڑتا تھا تو کوٹھی کے صحن میں داخل ہوتے ہی، اور بعد کے دنوں میں اس لمبی روش پر چند ہی قدم چل کر جو مکان تک پہنچاتی تھی، ہمیشہ برآمدے کے ایک مخصوص گوشے میں ڈاکٹر صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے دور سے نظر آ جاتے تھے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے علی بخش پہلے سے جمی ہوئی محفل میں حسبِ ضرورت ایک یا دو کرسیوں کا اضافہ کر دیتا تھا۔

آج ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہم کسی قدر ٹھٹکے۔ ایک یورپین خاتون ڈاکٹر صاحب کے بستر کے برابر کرسی پر بیٹھی تھیں اور ڈاکٹر صاحب کی بچی کو گود میں لیے ہوئے تھیں۔ ہم کو دیکھتے ہی وہ اٹھیں اور مقابل کا پردہ اٹھا کر مکان کے اندر چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے تکیے کے سہارے لیٹے لیٹے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ ہم تینوں بستر کے برابر کرسیوں پر بیٹھے ہی کو تھے کہ ڈاکٹر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے: ”کون صاحب ہیں؟“

یہ سوال سن کر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گاہ بہ گاہ حاضر ہوتے اب سات آٹھ برس ہو گئے تھے اور ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شفقت و عنایت سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا سوال میری سمجھ میں نہ آیا، اس لیے اپنے استعجاب کو چھپاتے ہوئے میں نے جواب دیا: ”جی میں ہوں حمید احمد خاں، سعید اللہ اور عبدالواحد“ اور یہ کہہ کر ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی کیفیت پوچھی۔ اس کے بعد تھوڑی

دیر تک سکوت رہا جس کو ڈاکٹر صاحب نے حسبِ معمول اپنی اُس لمبی اُستادانہ ''ہوں'' سے توڑا جس میں بالعموم گفتگو کے لاتعداد امکانات مضمر ہوتے ہیں۔ میں نے اُس تپائی پر نظر ڈالی جو بستر کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی۔ پانچ سات کتابیں اس کے اوپر تھیں اور دو ایک نیچے فرش پر پڑی تھیں۔ میں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ان کتابوں پر ڈالی اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! آج کل پڑھنے پر زیادہ توجہ ہے یا کبھی کبھی آپ کچھ لکھتے بھی ہیں؟'' ''پڑھنا کیسا! کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اگر کچھ دیکھ سکوں تو پڑھوں۔''

''نظر نہیں آتا؟'' ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ میں نے بے حد حیرت واستعجاب کے لہجہ میں دہرائے۔

''ہاں! جب آپ لوگ میرے کمرے میں داخل ہوئے ہیں تو میں آپ کو نہیں دیکھ سکا۔ اب تھوڑی دیر گزرنے پر آپ کی صورتیں کسی قدر دھندلی نظر آ رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ Senile Cateract (موتیابند) اُتر آیا ہے۔''

سعید اللہ: ''ان گرمی کی چھٹیوں سے پہلے آپ نے ذکر کیا تھا کہ Senile Cateract اتر آنے کا خطرہ ہے، مگر یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلد اتر آئے گا۔''

ڈاکٹر صاحب: ''جی ہاں۔ عام طور پر لوگوں کو دیر سے اترتا ہے۔ مجھے ذرا پہلے اتر آیا ہے۔ میرے والد مرحوم کو، جو سو سال سے کچھ زیادہ زندہ رہے، اسی برس کی عمر میں اترا تھا۔''

مَیں: ''اس کے علاج کی کوئی صورت تو آپ کر رہے ہوں گے؟''

ڈاکٹر صاحب: ''اب اس کا اپریشن ہوگا لیکن جب تک یہ پک نہ جائے اپریشن نہیں ہو سکتا۔ پکنے میں اسے پانچ مہینے لگ جائیں، پانچ سال لگ جائیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بہر حال لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہے، کیونکہ میری داہنی آنکھ تو شروع ہی سے بیکار تھی۔''

''شروع ہی سے بیکار تھی؟'' اب حیرت کے ساتھ اس فقرے میں ہمارا تاسف واضطراب بھی شامل تھا۔

''جی ہاں۔ دو سال کی عمر میں میری آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے ہوش میں مطلق یاد نہیں کہ یہ آنکھ کبھی ٹھیک تھی بھی یا نہیں۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ داہنی آنکھ سے خون لیا گیا ہے جس کی وجہ سے بینائی زائل ہو گئی۔ میری والدہ کا بیان ہے کہ دو سال کی عمر میں جونکیں لگوائی

گئی تھیں۔ تاہم میں نے اس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ ایک آنکھ سے دن کو تارے دیکھ لیا کرتا تھا۔ (اس کے بعد ایک ایسے تبسم کے ساتھ جو گویا تاریکی کی قوتوں کے خلاف پیغمبر امید کا نعرۂ خاموش تھا) اب اگر میں پڑھتا نہیں ہوں مگر پڑھنے کے بجائے سوچتا ہوں جس میں وہی لطف ہے جو پڑھنے میں۔ (پھر ذرا سرگرمی کے ساتھ تکیے سے سر اٹھا کر) عجیب بات یہ ہے کہ جب سے بصارت گئی ہے میرا حافظہ بہتر ہو گیا ہے۔''

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اس یورپین خاتون کا ذکر ہوا جو تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہمیں نظر آئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے بچوں کی گورنس ہیں اور علی گڑھ کے کسی پروفیسر کی سفارش پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں ملازم رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''بیچاری اپنے حالات کی وجہ سے مصیبت میں تھی۔ اور ہے بڑی شریف عورت۔ بہت اچھی منتظم ہے۔ بچوں کی تعلیم کے علاوہ اس نے گھر کا بہت سا اور کام کاج بھی سنبھال لیا ہے۔ ذرا فرصت ملتی ہے تو مکان کے جھاڑنے پونچھنے میں لگ جاتی ہے یا باورچی خانے میں جا کر ہاتھ بٹاتی ہے۔ میرا باورچی خانے کا خرچ اب ایک تہائی کم ہو گیا ہے۔ کبھی مجھے انگریزی میں خط لکھنا ہوتا ہے تو اسی کو لکھوا دیتا ہوں۔ اردو خط جاوید لکھ کر دیتا ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیفہ ہوا۔ میری لڑکی منیرہ اپنی گورنس کے ساتھ سیر کے لیے کسی طرح نہیں جانا چاہتی تھی۔ بہت دفعہ کہا مگر اسے گورنس کے ساتھ سڑک پر نکلنا بالکل منظور نہیں تھا۔ آخر کئی دن بعد یہ راز کھلا جب منیرہ نے کہا ''لوگ مجھے کہیں گے میم کی بیٹی ہے۔''

انہیں باتوں میں سوا پانچ بج گئے۔ علی بخش نے آ کر مہر صاحب اور سالک صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ دونوں صاحب تھوڑی دیر میں اندر داخل ہوئے اور ہمارے قریب ہی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان دنوں تھوڑا ہی عرصہ پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی میثاق کے چرچے تھے۔ مدیرانِ انقلاب کے آتے ہی گفتگو کا رخ سیاسیات کی طرف پھر گیا۔

اس اثنا میں افطار کا وقت قریب آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کے اپنے ملازم رحما کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ افطار کے لیے سنگترے، کھجوریں، کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو کچھ ہو سکے سب لے آئے۔

سالک صاحب ’’اُفو! یہ سب کچھ منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھوریں کافی ہیں۔‘‘

ڈاکٹر صاحب۔ (ایک ایسی شوخی سے جس میں طفلانہ معصومیت کا انداز جھلکتا تھا) ’’سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو جمادیں۔ کچھ نہ کچھ تو لائے گا۔‘‘

’’رحمے‘‘ نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کی لفظ بہ لفظ پابندی ضروری نہ سمجھی اور قریب قریب سالک صاحب کی خواہش کی پاسداری پر اکتفا کیا۔

ان سیاسی مباحث کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے توڑا اور کہا، ’’ڈاکٹر صاحب، گرمی کی چھٹیوں سے پہلے ہم حاضر ہوئے تھے تو آپ نے غالب اور بیدلؔ کے متعلق فرمایا تھا کہ آپ کی رائے میں غالبؔ نے بیدلؔ کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ بیدلؔ کا تصوف Dynamic (حرکی) ہے اور غالبؔ کا Static (سکونی)‘‘

مَیں: ’’جی ہاں۔ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟‘‘

ڈاکٹر صاحب: ’’بیدلؔ کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے۔ یہاں تک کہ اس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے۔ اس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان وسکون سے الفت ہے۔ بیدل نے ایک شعر لکھا ہے جس میں ’’خرام می کاشت 1‘‘ کی ترکیب استعمال کی ہے۔ گویا سکون کو بھی بہ شکل حرکت دیکھا ہے۔ مثالیں اس وقت یاد نہیں ہیں، لیکن اگر آپ بیدل کا کلام پڑھیں تو بہت سے اشعار ہاتھ آ جائیں گے۔ میں جن دنوں انارکلی میں رہتا تھا میں نے بیدلؔ کے کلام کو انتخاب کیا تھا۔ وہ اب میرے کاغذوں میں کہیں اِدھر اُدھر مل گیا ہے۔ نقشبندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدلؔ کی عقیدت کی بنیاد بھی یہی ہے۔ نقشبندی مسلک حرکت اور رجائیت پر مبنی ہے Dynamic and Optimistic مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے Pessimistic and Static۔ اسی وجہ سے چشتیہ سلسلہ کا حلقۂ ارادت زیادہ تر ہندوستان تک محدود ہے۔ مگر ہندوستان سے باہر افغانستان، بخارا، ترکی، وغیرہ میں نقشبندی مسلک کا زور ہے۔ دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے اس میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تصوف تقلید پر مبنی ہے۔ سیاسیات، فلسفہ، شاعری یہ بھی تقلید پر مبنی ہیں۔ لیکن نقشبندی سلسلے کے شعرا مثلاً ناصر علی سرہندی کو دیکھئے۔ ناصر علی کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ اسی لیے حرکت والی قوموں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ ہندوستان میں ناصر علی کی کچھ

زیادہ قدر نہیں ہے لیکن افغانستان اور بخارا کے اطراف میں لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں۔ بیدل کو بھی افغانستان کے لوگ بہت مانتے ہیں۔"

مَیں: "اس کے کلام کے حرکی عنصر کی وجہ سے؟"

ڈاکٹر صاحب: (مسکراتے ہوئے) "میرا خیال ہے کہ بیدل کے کلام کو سمجھنے میں انہیں مشکل پیش آتی ہے، اس لیے۔"

سعید اللہ: "اس کے متعلق آپ کا خیال ہے جو غالب نے شروع شروع میں بیدل کی طرح مشکل گوئی کی؟ کیا یہ صرف اس دعوے کے لیے کہ میں بھی مشکل لکھ سکتا ہوں؟"

اس موقع پر مہر صاحب نے سالک صاحب کی طرف دیکھا اور دونوں صاحبوں نے بہ اتفاق ڈاکٹر صاحب سے رخصت کی اجازت چاہی۔ چنانچہ قبل اس کے ڈاکٹر صاحب سعید اللہ کے سوال کا جواب دیں کہ

1۔ ڈاکٹر صاحب نے جس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے

ہر گہ دو قدم خرام می کاشت     از انگشتم عصا بہ کف داشت

"ہاں جوانی میں انسان طبعاً مشکل پسند ہوتا ہے" دونوں حضرات ڈاکٹر صاحب کی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم تک جا پہنچے تھے۔ ان کی رفت و برخاست کی وجہ سے گفتگو میں قدرۃً ایک اور وقفہ آیا۔

اس کے بعد سعید اللہ نے کہا: "آج کل ہندوستان کے نیشنل اینتھم (قومی ترانے) کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے۔ آپ کی اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر صاحب: "نیشنل اینتھم" تو اس صورت میں ہو کہ کوئی "نیشن" ہو۔ جب سرے سے "نیشن" ہی کا کوئی وجود نہیں ہے تو "نیشنل اینتھم" کیا ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے کہ ہندوستان کو کسی "نیشنل اینتھم" کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

سعید اللہ: "بندے ماترم" پر بڑا اعتراض ہے کہ ایک تو یہ بنگالی میں ہے دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر صاحب: (ذرا گرمی سی) "آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں؟ ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالیے کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔

ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثنا ہے رامائن، اور وہ بھی بعض بعض حصوں میں۔"

عبدالواحد: "مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے۔ قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب: "میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں۔ جس طرح منشیات سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کر لے۔"

عبدالواحد: "کیا آپ کا مطلب ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے؟ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہیوں کا میلہ ہوتا ہے۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ یک دم حال میں آ جاتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب: "ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک دستور بنا لیا ہے۔ یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے جوشِ جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے اور حال انہیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے۔ مسلمان جہاں جہاں پہنچے ہیں وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بُت بھی تھے جن میں قوت اور ہیبت کی ایک ایسی شان تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہوا

وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

''اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوائے شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیوؤں کا مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا!''

پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی تھی، دیوار پر ''ھوالغالب'' لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے، کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔''

اس کے بعد پھر تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا۔ یعنی تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آ گیا ہے اور دراصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لیے توازن قائم کرتا ہے۔''

سعید اللہ: ''دلی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔''

ڈاکٹر صاحب: ''وہ تو ایک بیگم ہے!''

ہم اس فقرے پر ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پر اسلامی تعمیرات کے متعلق یہ دلکشا بحث ختم ہوئی۔ اب شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے اور تین گھنٹے کی اس مسلسل نشست کو طول دینا کچھ ایسا مناسب نہیں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اُن ''مشورہ طلب'' نگاہوں سے دیکھا جنہیں ہم نے معمولاً ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے کا پیش خیمہ قرار دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول ہم سے کہا: ''اچھا! چلتے ہیں آپ؟'' اور اس کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

# اقبال میری نظر میں•

پروفیسر حمید احمد خاں/مرتبہ الطاف حسین قریشی

ہر بڑے آدمی کا نام ایک **طلسم** ہے جسے زبان پر لاتے ہی نظر کے سامنے ایک نیا جہان ابھر آتا ہے۔

محمد اقبال! یہ نام پچھلی صدی تک کسی خاص مفہوم سے آشنا نہ تھا۔ ہزاروں دوسرے ناموں کی طرح یہ بھی ایک نام تھا۔ غیر متحرک اور منجمد جیسے زید، بکر اور عمر! آخر کار صدیوں کی بے سروسامانی کے بعد خود ہمارے عہد میں اس نام نے حیات جاوید کا خلعت پہنا۔ اس کو زندہ کرنے کے لئے ایک مسیحا آیا اور یہ نام علامت قرار پایا فلسفہ زندگی کی ایک ہمہ گیر حرکت اور وسعت اور اضطراب کی۔ آنے والی نسلیں اس نام کے پیچھے صرف اسی حرکت اور وسعت اور اضطراب کی جھلک دیکھیں گی۔

لیکن موجودہ نسل جب اس نام کو سنتی ہے، تو زندگی کے اس طوفان انگیز تخیل کے پیچھے اسے ایک پر سکون اور عزلت پسند انسانی پیکر کی تصویر نظر آتی ہے۔ محمد اقبال، پیغمبر امید، پیغمبر ممات، بے شک، مگر اس سے پہلے ہماری طرح ہنسنے، بولنے والا، کھانے پینے والا ایک انسان! جب تک موجودہ نسل زندہ ہے یہ متحرک شبیہ اس کے تصور میں موجود رہے گی۔ لیکن اس نسل کے گزر جانے کے ساتھ عالم خیال کی یہ تصویر بھی گزر جائے گی۔

اقبال کے سراپا کی لفظی تصویر کھینچنا آسان نہیں۔ اگر انہیں کشیدہ قامت کہا جائے۔ تو یہ کچھ مبالغہ سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں میانہ قد کہنا صریحاً کوتاہی ہوگی۔ یہی حال ان کے ڈیل ڈول کا تھا۔ ان کا جسم بھرا بھرا تھا۔ مگر فربہی کے شبے سے پاک۔ چنانچہ جب گرمی

• بصد شکریہ، اردو ڈائجسٹ، اپریل ۱۹۶۴، بحوالہ رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، ص 338-343۔

کے موسم میں باتیں کرتے کرتے پنڈلی پر سے کپڑا ہٹا دیتے تھے۔ تو اہل مجلس کو تعجب سا ہوتا تھا کہ ان کی پنڈلیوں پر کچھ زائد گوشت کیوں نظر نہیں آتا۔ یہ اس لئے کہ ان کے پر رعب چہرے کا لحاظ کے دیکھنے والا قدرتی طور پر زیادہ پر گوشت اور بھری ہوئی پنڈلیوں کی توقع رکھتا تھا۔ ان کا رنگ گورا تھا جس میں سرخی کی جھلک آخری دنوں تک قائم رہی۔ مرض کی حالت سے قطع نظر، ان کے چہرے کی سرخی روشنی اور دھوپ میں خاص طور پر نمایاں ہو جاتی تھی۔ یہ گویا ان کے اس کشمیری خون کا اثر تھا جو ان کے شفاف خط و خال سے چھپائے نہیں چھپتا تھا۔

اقبال اپنے سر کے بال سنوارنے میں صرف یہ کرتے تھے کہ انہیں کنگھی سے سلجھا کر پیچھے ہٹا دیتے تھے۔ کم از کم میں نے ان کے بالوں میں کبھی مانگ نہیں دیکھی۔ باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنا ہاتھ اسی انداز سے بالوں پر پھیر لیا کرتے تھے۔ پیشانی اگرچہ کشادہ تھی۔ مگر جہاں سر کے بال شروع ہوتے تھے وہاں کچھ تنگ تنگ بلکہ ایک گوشہ بناتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ابرو بہت گھنے تھے اور اس لئے کچھ گھنے معلوم ہوتے تھے کہ ان کے نیچے آنکھیں گری بلکہ ذرا اندر کو دبی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی آنکھیں بڑی نہ تھیں، مگر گہری اور ذہین آنکھیں ضرور تھیں جن کے اوپر گھنے ابروؤں کے چھجے جھکے ہوئے تھے۔ گفتگو کرتے وقت ان کی صرف دائیں آنکھ کھلی رہتی تھی۔ دوسری آنکھ کو نادانستہ طور پر ذرا بند کرتے رہتے تھے۔ دراصل ان کی یہ آنکھ بینائی سے بالکل محروم تھی۔

اقبال ڈاڑھی عمر بھر منڈواتے رہے۔ لیکن مونچھیں رکھتے تھے۔ مونچھیں رکھنے کے بھی کئی فیشن ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں بعض حضرات صرف اپنی ''زوردار'' مونچھوں کے دم خم سے پہچانے جاتے ہیں۔ اقبال کا تعلق اس گروہ سے نہیں تھا، ان کی مونچھیں ذرا چھدری تھیں اور خاموش۔ مگر اس خاموشی کے باوجود جان دار معلوم ہوتی تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال کو مونچھوں میں اگر قیصر ولیم کی اکڑ نہیں تھی۔ تو چیمبر لین کی مونچھوں کا عجز و انکسار بھی نہ تھا۔

یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ جو لوگ اقبال کے پاس بیٹھتے تھے ان پر اقبال کی شخصیت کا مجموعی طور پر کیا اثر ہوتا تھا؟ ہم اپنی جان پہچان کے لوگوں میں سے ہر ایک کے ساتھ بالعموم ایک نہ ایک ایسی خصوصیت منسوب کر دیتے ہیں جو ہمارے نزدیک اس کی شخصیت کی امتیازی نشانی بن جاتی ہے اگر ایک شخص بالطبع خاموش ہے، تو دوسرا باتونی ہے۔ ایک کا کام دن رات ہنسی دل لگی ہے۔ دوسرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے، غرض کوئی نہ کوئی نمایاں صفت

ایسی ہوتی ہے جسے ہم اس کی شخصیت کا جوہر قرار دیتے ہیں۔ اقبال کو میں نے بارہا ہنستے دیکھا ہے اور کبھی کبھی غصے کی حالت میں بھی، لیکن ان کی شخصیت کا محور نہ ہنسی تھی اور نہ غصہ...... انسان پر بہت سی ذہنی اور جسمانی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی زندگی میں غور وفکر کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی وہ کسی اور کیفیت کو کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ خاموشی اور گفتگو، سکون اور اشتعال ہر رنگ میں ان کی اصل حیثیت ایک مفکر کی تھی، یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھے اور یہ محسوس نہ کرے کہ اقبال کی پوری ہستی کی بنیاد غور وفکر پر قائم ہے۔ گفتگو میں ذرا وقفہ آیا اور اقبال کا ذہن ایک جست میں کائنات کی حدوں کو عبور کر کے وہاں جا پہنچا جہاں ہمارا شور وشغب قدرت کے سرمدی سکوت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس وقت دیکھنے والے کو صرف ایک نظر بتا دیتی کہ یہ اپنے آپ میں سمٹا ہوا انسان سیاسی پلیٹ فارم کی تقریر شرربار اور منبر کے وعظ ستم اندوز کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ اس وقت اس کا پیکر خاک اسی عالم رنگ و بو میں موجود ہوتا، لیکن اس کی روح ستاروں کے نور سے الجھتی ہوئی، پاتال کے اندھیرے سے ٹکراتی ہوئی، کسی دنیا میں جا نکلتی۔

مگر اقبال کی اس حالت فکری کا ایک پہلو اور بھی تھا۔ اپنے ذہن کی اسی کیفیت کی وجہ سے اقبال عام انسانی تعلقات سے بے نیاز تھے، اپنے ملنے والوں سے ان کا تعلق معاشرتی تعلق نہیں تھا، فلسفیانہ تھا۔ میں برسوں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، لیکن مجھے پورے عجز کے ساتھ اعتراف ہے کہ انہیں مجھ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا۔ میں تو خیر ایک عقیدت مند کی حیثیت سے ان کے پاس جاتا تھا، ان کے مقربین بھی ان کے دلی تعلق سے غالباً محروم تھے۔ جب اقبال خلوص اور گرم جوشی سے بات کرتے تھے۔ تو اس لئے نہیں کہ ان کا مخاطب ان کے اس اخلاص کا مستحق ہوتا، بلکہ اس لئے کہ وہ تمام جوش اور خلوص انہیں اپنے اس خیال کے متعلق محسوس ہوتا جس کے اظہار سے انہیں غرض ہوتی۔ جن لوگوں سے اقبال بے تکلف تھے۔ وہ لوگ بھی روحانی طور پر ان کے لئے اشخاص نہیں تھے، بلکہ محض کھونٹیاں جن پر مختلف قسم کے خیالات بالکل مناسب طور پر لٹکائے جا سکتے ہیں۔ اقبال اس معاملے میں ہمیشہ تنہا اور آزاد رہے۔ روح کی اس تنہائی کے باوجود اقبال کو ایک مختصر حلقے کی گفتگو اور وہاں اپنے خیالات کے اظہار میں خاص لطف آتا تھا۔ وہ خود بھی خاموش رہ کر دوسروں کی بات سن سکتے تھے اور انہیں باتونی کہنا تو کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔ لیکن مختلف سوالات کے جواب میں اپنی تشریحات پیش کرتے ہوئے جو لذت انہیں ملتی

تھی۔ وہ ہر شخص پر ظاہر تھی۔ دراصل ان کی فطرت مشرقی وضع کے پرانے استاد کی فطرت تھی جس کا محبوب ترین مشغلہ اپنے شاگردوں کے درمیان بیٹھ کر بات بات میں نکتے پیدا کرنا تھا۔

آج وہ شمع خاموش ہے اور وہ محفل بھی باقی نہیں رہی۔ لیکن ہمارا تخیل اس مٹتی ہوئی تصویر کو ایک بار پھر زندہ کر سکتا ہے۔ آیئے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر اقبال سے ملنے چلیں۔ میکلوڈ روڈ سے مڑتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدے میں آرام کرسی پر بے تکلفی سے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اگر سردی کا موسم ہے، تو ڈاکٹر صاحب قمیض اور شلوار میں ملبوس ایک بادامی دھسہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ اگر گرمی ہے، تو قمیض کے ساتھ ایک دھوتی ہے اور قمیض کی بجائے کئی مرتبہ صرف بنیان ہی ہے۔ آرام کرسی پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھے ہیں اور کبھی کبھی اپنے پاؤں کے بے حد سفید تلوے کو سہلا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی آرام کرسی کے ساتھ ہی حقہ پڑا ہے۔ چلم بجھ جاتی ہے، تو ایک ایسے انداز میں، جو کبھی نہیں بدلا، آواز دیتے ہیں، علی بخش! اتنے میں ہم برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں اور سلام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لئے ادھر توجہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں "آؤ جی......صاحب!" جس شخص کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، اس کا خیر مقدم اسی جملے سے کرتے ہیں۔ جس شخص کو نہیں جانتے اس کے متعلق کبھی نہیں پوچھتے کہ یہ کون ہے۔ ناواقفوں کے لئے یہی کافی ہے کہ سلام کریں اور بیٹھ جائیں۔ اس کے بعد تکلف برطرف وہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں پوری آزادی سے شامل ہو جاتے ہیں۔

اب باتیں شروع ہوتی ہیں اور علم و حکمت کا چشمہ ابلنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دماغ سے ہر رنگ کی موج اٹھتی ہے اور اجنبی چہروں کا سامنا بھی ان کی گفتگو کی بیباک روانی کو تکلف کی کسی زنجیر کا پابند نہیں کر سکتا۔ ان کی تشریحات استادانہ ہیں۔ وہ سوالات کا جواب دینے سے تھکتے نہیں، بلکہ ایک ایک نکتہ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ کچھ سمجھاتے ہیں، تو ہاتھ کی صرف ایک انگلی ہی نہیں اٹھاتے۔ بلکہ داہنے ہاتھ کا پورا پنجہ حرکت میں آتا ہے۔ گفتگو ہمیشہ پنجابی میں ہوتی ہے۔ کبھی کسی علمی نکتے کے بیان میں انگریزی کے دو ایک جملے بھی بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں۔ اردو میں صرف اس وقت بات چیت کرتے ہیں جب بیرون پنجاب سے کوئی صاحب شریک مجلس ہوں۔ مذہب اور سیاست دو ایسے مضمون ہیں جن سے بحث کرتے ہوئے کبھی کبھی ان کا لہجہ پرجوش ہو جاتا ہے۔ جوں ہی کوئی ایسا موقع آتا ہے......ڈاکٹر صاحب کرسی پر

سیدھے ہو بیٹھتے ہیں۔ یہ میکلوڈ روڈ کے دنوں کی کیفیت ہے۔ میو روڈ کی کوٹھی کے زمانے میں امراض نے آ گھیرا ہے، بستر پر لیٹے رہتے ہیں اور ملاقاتیوں کو خواب گاہ ہی میں بلا لیتے ہیں۔ اسی حالت میں گھنٹوں تک پر لطف باتیں ہوتی ہیں لیکن جوں ہی ذرا گرمی پیدا ہوئی ڈاکٹر صاحب ایک دم اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے اور پھر اس وقت تک نہیں لیٹے جب تک وہ بات ختم نہیں ہو گئی۔

اب ہمیں ان کے اس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ہے۔ ہمارے سوالات ختم ہو چکے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کا ذہن بھی ایک اور پرواز کے لئے ذرا دم لیتا ہے، دونوں طرف خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب ایک اور ہی عالم میں ہیں۔ وہ کمرے میں موجود ہیں، مگر پھر بھی موجود نہیں ہیں۔ ان کی ظاہر کی آنکھیں کچھ بند کچھ کھلی ہیں، لیکن باطن کی آنکھ کسی اور سمت میں سراپا نگاہ ہو رہی ہے۔ اسی کیفیت میں کچھ وقت گزر جاتا ہے۔ ان کے خیالات کی موجیں انہیں کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ آخر کار حواس ظاہری کا دیدبان دفعتہً واپسی کا اشارہ کرتا ہے اور ان کا سفینہ خیال گہرے سمندروں کے سفر کے بعد پھر زندگی کے پرانے ساحلوں کی طرف رخ پھیرتا ہے۔ اس وقت وہ اپنا سر ذرا اوپر کو اٹھاتے ہیں اور انکے منہ سے کبھی ''یا اللہ'' اور کبھی فقط ''ہوں'' کی ہلکی سی آواز نکلتی ہے۔ یہ آواز اس بات کی علامت ہے کہ جہاز ساحل پر آ پہنچا اور اس کے لنگر کا قلابہ پھر ایک بار عالم اسباب کی مضبوط زمین میں پیوست ہو گیا۔ اس قسم کے وقفوں کے بعد بالعموم ان کی یہی لمبی اور پر سکون ''ہوں'' ان کے ذہن کی دور دراز اڑان سے ان کی بازگشت کی نقیب ہوتی ہے۔ پھر اسی پہلے انہماک سے باتیں شروع ہوتی ہیں، تا آنکہ سہ پہر کے سائے ڈھل کر شام میں غائب ہونے لگتے ہیں اور سورج غروب ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اپنی کرسیوں پر ایک بے معنی سی جنبش کرتے ہیں اور پھر اٹھ کر اجازت لیتے ہیں، تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، ''اچھا چلتے ہیں آپ؟'' اور پھر ہمارے سلام کا جواب ہاتھ اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ ان کا ہمیشہ سے معمول تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے جب رحلت کی، تو اہل لاہور کو جو ہر وقت ان سے شرف ملاقات حاصل کر سکتے تھے ایک ایسا شخصی نقصان پہنچا جس کی تلافی خود ڈاکٹر صاحب کا کلام بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے انتقال کے موقعے پر میں اتفاق سے لاہور میں موجود نہیں تھا۔ میرے ایک دوست نے جن کے ساتھ مل کر میں بارہا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے ایک خط لکھا جس میں لاہور کی زبان بن کر انہوں نے وہ جذبات قلم بند کر دیئے جو بہت سے دلوں کو بے تاب کر

رہے تھے مگر لب تک نہیں آسکتے تھے۔ انہوں نے لکھا۔

''ڈاکٹر اقبال چل بسے۔ افسوس کہ ہمیں آخری دنوں میں ان کا دیدار حاصل نہ ہوسکا۔ یہ حسرت ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اقبال مرا نہیں، کیونکہ اس کا کلام اسے زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے، لیکن میں اس سے متفق نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے کلام میں اس کی مکمل شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی نظم تو انسانی زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں سے موزوں (یعنی پر معنی اور متین) زبان میں بحث کرتی ہے۔ لیکن خود اقبال کی شخصیت کا ایک اور دلچسپ پہلو بھی تھا۔ یعنی اس کی خوش کلامی جو بعض دفعہ بذلہ سنجی سے جا ملتی تھی۔ اس کی نظم میں تو اس کا تخیل عرش بریں کو اپنی بلند پروازی کی پہلی سیڑھی سمجھتا ہے، لیکن کیا ہم نے اس کو اپنی زندگی میں بے علموں اور وہم پرستوں سے انہیں کی سطح پر نہایت انہماک سے بحثیں کرتے نہیں دیکھا؟ اس کے کلام سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ''دانائے راز'' سے ہم سخن ہونا مجھ جیسے ہیچمدان کے بس کی بات نہ تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں نے گھنٹوں اس کی صحبت میں بصیرت افروز باتیں سنتے ہوئے گزار دیئے، مگر اللہ کے بندے نے کبھی ایک دفعہ بھی اشارے یا کنائے سے یہ جتانے کی کوشش نہ کی کہ تمہاری تنگ نظری وبال جان ہو رہی ہے۔ اب ختم کرو۔ الغرض وہ اقبال جو لوگوں سے گویا پکار پکار کر کہتا تھا کہ آؤ میرے علم و فضل کے خزانے کھلے پڑے ہیں، جھولیاں بھر بھر کر لے جاؤ، مر گیا ہے۔ اقبال کا کلام برحق، لیکن ہم اپنے بظاہر لاینحل مسئلوں کو اب کس کے پاس لے جائیں گے تاکہ وہ ایک جنبش لب سے مشکل سے مشکل گتھی کو سلجھا دے۔ یہ اقبال مر گیا ہے۔ افسوس''

(بشکریہ فاران)

# کچھ اقبال رحمۃ اللہ اور ان کے استاد کے بارے میں •

پروفیسر محمد دین بھٹی (سیالکوٹ) / تحریر: منیر احمد منیر

۱۸۹۳ء میں سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میں نے تیسری جماعت کا امتحان پاس کیا تو اقبال رحمۃ اللہ انٹرنس (میٹرک) میں ضلع بھر میں اول آئے۔ ہیڈ ماسٹر ترنجن داس نے اس خوشی میں ایک روز کی چھٹی کر دی۔ میری اور علامہ کی عمر میں سات برس کا فرق تھا۔ وہ بڑے ہونہار طالب علم تھے۔ ساغر چند انسپکٹر سکولز تھے، وہ جب بھی سکول آتے تو مولوی میر حسن اقبال رحمۃ اللہ کو آگے کر دیتے، ساغر چند اقبال کے ریکارڈ پر اچھا لکھ جاتے۔

جب کوئی شخص بڑا بن جاتا ہے تو بہت لوگ اس سے اپنی قربت جتانے کے لیے ایسی ایسی فسانہ طرازیاں کرتے ہیں کہ تاریخ کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ اب اگر میں بھی اسی بات پر اتر آؤں تو اس سے میری بڑائی تو نہ ہوگی، تاریخ کی واقعاتی صحت کو ضعف ضرور پہنچے گا۔ کوئی کہتا ہے اقبال کبوتر بازی کے بہت شوقین تھے۔ گستاخی معاف، بعض لوگ تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اقبال رحمۃ اللہ ''کوٹھوں'' پر چلمیں بھرتا رہا۔ یہ کوٹھے کا واقعہ بھی سن لیں۔ مڈھی بازار میں ایک صاحب نتھو پہلوان تھے جو بیچارے بدقسمتی سے نتھو کنجر کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اقبال کا ان سے کیا تعلق تھا، ان کے اکھاڑے پر جاتے اور کشتیاں دیکھتے اور بس! کبوتر بازی کی بھی سن لیں، ایک صاحب احمد دین تھے، کاغذ سازی کا کام کرتے تھے اور ایموں نائی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ موصوف کبوتر بازی کے شوقین تھے۔ اقبال کبھی کبھار ان کے گھر چلے جاتے جہاں

• بصد شکریہ، ہفت روزہ زندگی، لاہور شمارہ بابت 6 تا 11 اگست 1973، بحوالہ جعفر بلوچ، مجالس اقبال، ص 42۔47۔

کبوتروں کو اڑتا دیکھتے۔ یہ اقبال کے لڑکپن کے زمانے کی باتیں ہیں۔

ان دنوں لوہی یا لوڑی کا تہوار ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا جس میں عیسائی، ہندو اور مسلمان برابر حصہ لیتے تھے۔ دو نوجوان سسی پنوں کا سوانگ بھرے اونٹ پر سوار ہوتے، پنوں آگے بیٹھتا اور سسی اس کے پیچھے، پنوں بیٹھے بیٹھے پنجابی میں دوہڑے پڑھتا، جواب میں سسی پنوں کے کندھوں کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی، وہ بھی دوہڑے پڑھتی۔ یہ سوانگ شہر کے ہر بازار اور ہر کونے میں بھرا جاتا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں ناچتیں ٹاپتیں، بھنگڑا ڈالتیں، بیت بازی ہوتی۔ زمانہ طالب علمی میں اقبال رحمہ اللہ بھی اس بیت بازی میں حصہ لیتے۔ چوک دروازہ میں محمد دین چٹھی رساں اور جانی سنار دوسری طرف اقبال اور جلوہ قصائی (یہ صاحب کچہری میں عرضی نویس تھے) کے درمیان معرکہ بڑے مزے کا رہتا، جلوہ بجا رنگت کا سیاہ تھا۔ بیت بازی کا ذریعہ فی البدیہہ شاعری ہوتی۔ جب اقبال رحمہ اللہ جلوہ پر حاوی ہو جاتے، ارد گرد کھڑے لوگ اقبال کو اس طرح خراج پیش کرتے:

جلوہ دا منہ کالا اقبال بالا بالا

اقبال کے والد کا نام نور احمد تھا۔ برقعوں کی ٹوپیاں بناتے تھے اور نتھو ٹوپیاں والا کے نام سے مشہور تھے۔ اقبال "اقبال نتھو ٹوپیاں والے دا" کی مناسبت سے پہچانے جاتے۔

ایک بار ٹیلی ویژن والوں نے مجھے لاہور بلایا تو پروگرام شروع ہونے سے پیشتر ایک صاحب مجھے کہنے لگے "بھٹی صاحب اقبال شراب بھی پیتے تھے۔" میں نے کہا "بھئی آپ کو زیادہ علم ہوگا۔ ہوسکتا ہے آپ اور وہ اکٹھے پیتے ہوں۔ ہم نے تو اقبال کو اس حالت میں دیکھا کہ والدہ انہیں اوائل عمر ہی میں قرآن پڑھا رہی ہیں اور مولوی میر حسن انہیں گھر پر عربی زبان سکھانے آتے رہے۔ اقبال کا کردار تو یہ تھا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اقبال رحمہ اللہ پر مولوی میر حسن صاحب کا اتنا اثر رہا کہ اپنی ہر تصنیف کی پہلی جلد اپنے استاد کی خدمت میں پیش کرتے اور مولوی صاحب بھی جب کوئی ان سے اصلاح لینے آتا تو اسے کہتے بھئی پہلے اقبال کو پڑھو، پھر شعر کہنا۔"

۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے واپس وطن آنے پر مولوی صاحب کے گھر پہنچے۔ حسب معمول میں میر صاحب کے ہاں موجود تھا۔ صف بچھی ہے۔ میں میر صاحب کے سامنے بیٹھا ہوں۔ اتنے میں کوٹ پتلون پہنے اور سر پر رومی ٹوپی اوڑھے اقبال تشریف لاتے ہیں اور میرے بائیں جانب بیٹھ جاتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو اس وقت دیکھا جب ستمبر ۲۹ء میں مولوی میر حسن کا انتقال ہوا۔ علامہ استاد کی موت پر لاہور سے سیالکوٹ پہنچے۔ پاؤں میں تلہ دار کھسہ، شلوار قمیص اور رومی ٹوپی میں ملبوس، چہرہ اترا ہوا ہے اور استاد کے جنازے کو کندھا دے رہے ہیں۔ بڑی عیدگاہ میں مولوی صاحب کا جنازہ ہوا۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ تدفین تک وہیں موجود رہے۔ علامہ استاد کی بہت قدر کیا کرتے جس کے ثبوت میں وہ مشہور واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۸ء (۱۹۲۳ء؟) میں انگریز حکومت نے علامہ کو ''سر'' کا خطاب دینا چاہا مگر انہوں نے تب تک یہ خطاب لینے سے انکار کر دیا جب تک ان کے استاد مولوی میر حسن کو ''شمس العلماء'' کا خطاب نہیں دیا جاتا۔ انگریز حکومت نے علامہ سے پوچھا ''مولوی صاحب نے کوئی کتاب بھی تصنیف کی؟'' علامہ نے جواب دیا: ''ان کی سب سے بڑی تصنیف میں ہوں۔''

یہ درست ہے کہ مولوی صاحب کی کوئی تصنیف نہیں لیکن وہ اپنی علمی فضیلت اور استادانہ عظمت سے شاگردوں کا کردار بنانے اور ان کی شخصیت سازی میں پوری دلچسپی لیتے رہے۔ وہ بھی کیا لوگ تھے۔ ان کی زندگی خلوص سے مستعار تھی۔ مجال ہے جو کسی معاملہ میں غرض کو شامل کریں۔ یہی وجہ ہے ہندو، سکھ اور عیسائی ان کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ ان کا ایک شاگرد ہرنام سنگھ تھا جو بعد میں جھنگ میں ڈپٹی کمشنر بھی رہا۔ مولوی صاحب اور میں، مولوی صاحب کے آبائی قبرستان (نزد شاہ مونگاری) سے واپس آ رہے تھے۔ مولوی صاحب اپنے گھر میں داخل ہو رہے تھے کہ ہرنام سنگھ ان کے پاؤں پڑ گیا۔ رونے لگا اور مٹھائی پیش کی۔ جب ایک بار فرسٹ اپریل کے موقع پر اپریل فول مناتے ہوئے ایک طالب علم محمد اسحاق درزی نے پرنسپل مرے کالج کو خط لکھا کہ مولوی صاحب فوت ہو گئے ہیں تو خط ملتے ہی جان گیرٹ فورڈ کار میں سوار ہو کر مولوی صاحب کے گھر گیا۔ آواز دی۔ اندر سے مولوی صاحب بولے ''آ رہا ہوں۔'' جان گیرٹ فوراً واپس کالج آیا۔ اس طالب علم کو کالج سے نکال دیا اور کہا ''اگر مجھے یہ کہہ دیا جاتا کہ تمہارا لڑکا

ولیم فوت ہو گیا ہے تو مجھے رنج نہ ہوتا۔'' یہ مولوی صاحب کا علم و فضل اور استادانہ رکھ رکھاؤ تھا جس کے ہاتھوں ہر کوئی گھائل تھا۔ آپ کو پتہ ہے ہندو، سکھ، مسلمانوں سے کس قدر تعصب سے پیش آتے تھے۔ یہ لوگ دولت مند ہونے کے علاوہ اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز تھے۔ ہندو کی پالیسی کا حصہ تھا کہ مسلمان صاحب جائیداد نہ ہونے پائے۔ اس لیے ہندو افسران کاغذات کی تصدیق بڑی مشکل سے کرتے جن کا تعلق جائیداد وغیرہ کی خریداری سے ہوتا۔ جنگ عظیم اول کے دنوں میں میں نے لہائی بازار میں دکان خریدنا چاہی تو یہی الجھن پیش آئی۔ اتفاق سے جس سکھ افسر نے میرے کاغذات تصدیق فرمانا تھے، وہ مولوی صاحب کا شاگرد رہا تھا۔ میں نے مولوی صاحب سے ماجرا بیان کیا کہ یہ صاحب حسب معمول تنگ کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے اس سکھ افسر کو اشارہ کیا تو اس نے پس و پیش کیے بغیر میرے کاغذات کی تصدیق کر دی۔

بھئی! یہ میں جو پرانے وقتوں کی سچائیاں سنا رہا ہوں۔ یہی ہماری متاع ہیں۔ آج وہ استاد ہی نہیں رہے جن کا نام مولوی میر حسن ہو تو پھر ترجمان حقیقت کہاں سے آئے۔ اقبال سے جتنا میرا تعلق تھا وہ میں اوپر بتا چکا ہوں۔ میری محفلیں مولوی صاحب مرحوم ہی کے ساتھ جمتی رہیں۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۹ء تک پورے اکیس برس دن میں دو بار مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اسی دوران میں میں نے فارسی میں ایم اے کیا اور مرے کالج میں لیکچرار رہا۔

مولوی صاحب حنفی العقیدہ تھے۔ ۱۹۱۲ء کے ماہ رمضان میں مولوی غلام حسن (اہل حدیث) نے مولوی صاحب سے کہا کہ نماز تراویح میں ہمارے پاس کوئی سامع نہیں۔ اس لیے آپ ہمارے سامع بن جائیں۔ مولوی صاحب آٹھ تراویح وہاں پڑھ کے آتے تو بارہ رکعتیں گھر پر آ کر ادا کرتے، مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک روز میں نے پوچھ ڈالا، یہ کیا آٹھ رکعتیں وہاں اور بارہ رکعتیں گھر؟ فرمانے لگے ''مولوی غلام حسن ہمارے دوست ہیں، اس لیے آٹھ تراویح ان کے ہاں پڑھتے ہیں، بارہ تراویح گھر پر اس لیے پڑھتے ہیں کہ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔''

ایک روز چندر بازار میں سے گزر رہے تھے۔ غلام حسین نامی لوہار انہیں آتا دیکھ کر اپنی دکان سے نیچے اتر آیا۔ کہنے لگا: ''مولوی صاحب رات میرے والد صاحب کہیں سے آ رہے تھے کہ راستے میں جنوں کی برات تھی۔ جنوں نے والد صاحب کو چاولوں کی ٹینڈ بھر دی۔ جب والد صاحب گھر پہنچے تو وہ فضلہ تھا۔'' مولوی صاحب کہنے لگے ''برا نہ منانا (ماننا؟) آپ کے والد

صاحب کو غلطی ہوئی، چاہے چاول دیکھنے میں اور چاہے فضلہ دیکھنے میں۔"...... ان کے چچیرے بھائی میر حسام الدین قادیانی تھے۔ میر صاحب ایک روز مولوی صاحب سے کہنے لگے "اوحسنا! آ تجھے مرزا صاحب کی کرامتیں دکھاؤں۔" مولوی صاحب نے جواب دیا "یہ کرامتیں آپ کو مبارک ہوں۔ میں سر سید احمد خاں کو مل چکا ہوں۔"

مولوی صاحب سر سید سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر تھے۔ اس کے سالانہ اجلاس میں برابر شریک ہوتے۔ کشمیر کا ایک شاعر غنی نامی اپنے شعروں میں پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ ایک روز کسی نے غنی کا یہ مصرعہ پڑھا:

دو کس بہ نام احمد گمراہ کنند بے حد

اور ساتھ ہی پوچھا "مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید دونوں میں سے اچھا کون ہے؟" مولوی صاحب نے برجستہ کہا "دونوں میں احمد مشترک ہے۔ ایک غلام ہے، دوسرا سید جو حیثیت غلام اور سید کی ہے، وہی ان دونوں کی سمجھ لو۔" ...... مولوی صاحب کو میں نے ایک بار ہی روتے دیکھا، جب سر سید فوت ہوئے۔ سر سید انہیں خطوں میں مخدومی کہہ کر پکارتے (مخاطب ہوتے)

کپورتھلہ کے مولوی مراد علی کی مولوی صاحب سے گہری دوستی تھی۔ مولوی مراد علی حج پر جارہے تھے کہ انھی دنوں سر سید نے کپورتھلہ میں لیکچر دیا۔ مولوی مراد علی نے حج کے لیے جمع کیا ہوا پانچ سو روپیہ علی گڑھ تحریک میں بطور چندہ دے دیا اور کہا: "یہ تو مجھے معلوم نہیں میرا حج قبول ہو یا نہ ہو لیکن علی گڑھ میں میرا روپیہ قبول ہوگا۔"

وزیر آباد ریلوے اسٹیشن کے پار ڈاکخانہ کے ساتھ ایک قبرستان ہے وہاں مولوی صاحب ہر سال عرس پر جاتے۔ وہیں پیسہ اخبار کے مولوی محبوب عالم اور وطن کے مولوی انشاء اللہ خان سے محفل جمتی اور مولوی صاحب عرس میں ایک روپیہ چندہ دیتے۔ علی گڑھ تحریک سے وابستگی کے سبب تہذیب الاخلاق بڑے اہتمام سے منگواتے۔ شیخ ظہور الٰہی وکیل نے ایک مرتبہ اپنے ملازم کے ہاتھ رقعہ بھیجا کہ تہذیب الاخلاق کا پرچہ دو گھنٹے کے لیے چاہیے، پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ اسی رقعہ کی پشت پر مولوی صاحب نے لکھا تہذیب الاخلاق میری معشوقہ ہے اور کوئی آدمی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی محبوبہ یا معشوقہ کسی غیر کے حوالے کر دی جائے۔"

۱۰۰ اروپے ماہانہ تنخواہ تھی، جس طرح خرچ کرتے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ساٹھ روپے گھر

کے خرچ کے لیے، بیس روپے بیٹے ذکی شاہ کو، ہر آٹھ روز بعد دو روپے کی ریزگاری منگواتے اور نواسوں، پوتوں میں دو پیسے فی بچہ کے حساب سے تقسیم کر دیتے۔ خط و کتابت (کذا) پر اٹھنے والا خرچ دس روپے ماہوار۔ ایک دن اصغر علی روحی ان کے ہاں آئے تو کہنے لگے "محمد دین مہمان آ گیا، آؤ بازار چلیں۔" عام طور پر بڑا گوشت کھاتے۔ اس روز چھوٹے گوشت کی دکان پر گئے۔ تین آنے کا گوشت خریدا، پھر جہاں علامہ اقبال کا گھر ہے، ان دنوں اس مکان کے پاس سڑک پر آرائیں عورتیں سبزی بیچا کرتی تھیں، وہاں سے تین پیسے کا ساگ خریدا اور اپنے پلو میں باندھ لیا۔ تین پیسے کا ساگ ڈھیر سارا آ جاتا تھا۔ میں نے کہا "حضرت جی! حکم دیں، میں اٹھا لوں۔" کہنے لگے "پیچھے ہٹ جاؤ، کھائیں ہم اور اٹھاؤ تم۔" میں نے کہا، آپ نے سودا وزن کے حساب سے نہیں، پیسوں کے حساب سے لیا ہے۔ کہنے لگے "محمد دین ہماری آمدنی نپی تلی ہے۔ ہم پیسوں کے حساب ہی سے لیتے ہیں۔"

مولوی صاحب کی دوسری بیوی (جو ان کے مرحوم بھائی کی بیوہ تھیں) بہت سخت گیر تھیں۔ میں نے ایک روز کہا "آپ ان کی ضرورت کے لیے ساٹھ روپیہ ماہوار بھی دیتے ہیں تو بھی وہ سختی سے پیش آتی ہیں۔" کہنے لگے "محمد دین خاموش رہو۔ یہ ٹھیک کرتی ہے۔ میرے نفس کو درست کرتی رہتی ہے۔" اور جب ان کا انتقال ہوا تو جنازے پر مسلمان تو تھے ہی، ہندو، سکھ اور عیسائی بھی موجود تھے۔ ۱۹۲۹ء میں فوت ہوئے اور تین برس بعد ۱۹۳۲ء میں مرے کالج میں ان کے نام سے میر حسن ہال کی بنیاد پڑی۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے وہ جو نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر نظم کہی تھی، اس کا یہ شعر مولوی میر حسن کے متعلق تھا:

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

❀❀❀

# ڈاکٹر اقبال رحمہ اللہ •

پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ملاقات کا شرف مجھے مارچ ۱۹۲۸ء میں حاصل ہوا۔ اس زمانے میں میں پریس کا کاروبار کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم پیام مشرق کا نیا ایڈیشن چھپوانا چاہتے تھے اور ایک دوست سیّد نذیر نیازی صاحب نے میرا تعارف اور میرے پریس کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے موقع غنیمت جانا اور لاہور چلا گیا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مکان میکلوڈ روڈ پر تھا۔ ویسے تو مکان کا پھاٹک بھی تھا اور اپنی الگ سڑک بھی تھی، لیکن پھاٹک چند ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑیوں کے بغل میں تھا اور اس پر جو بورڈ لگا تھا اس پر نہ زمین کی سیاہی باقی رہی تھی نہ حرفوں کی سفیدی۔ بس رنگ اور گرد کے بڑے بڑے دھبے سے تھے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سوا اور کسی کو ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسے بورڈ کو اپنے پھاٹک پر ٹنگا رہنے دے، پھاٹک کے اندر احاطہ خاصا بڑا تھا لیکن وہاں پہنچنے پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دیدار کے خیال نے نظر کو اِدھر اُدھر دوڑنے نہ دیا۔ میرے دوست نے ڈاکٹر صاحب کے ملازم علی بخش کو پکارا۔ وہ ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا مگر آواز کا جواب خود ڈاکٹر صاحب نے دیا۔

''آؤ جی نیازی صاحب۔''

ہم دونوں جلدی سے زینوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔ میرا تعارف کرایا گیا اور میں ادب سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تازی چلم بھروائی اور بے تکلفی سے باتیں

---

• بصد شکریہ، غلام دستگیر رشید، آثار اقبال، حیدر آباد دکن، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 107-113۔

شروع کردیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ حسن و عشق کے ذکر کا نہیں تو ردیف اور قافیہ اور بحر کے ترنم کا اثر شاعر کی صورت پر پڑتا ہے اور صورت میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہو تو ادا، انداز، آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی لرزش، کوئی نہ کوئی خصوصیت نظم کہنے والے کو ان لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے جو نثر سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی وجہ سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال کی صورت، شکل، وضع قطع، لباس اور گفتگو میں ان کی شاعرانہ عظمت کا پتہ دینے والی کوئی صفت نہیں۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا اور پہلی نظر نے اسے اور بڑھا بھی دیا۔ نیلی قمیص، شلوار نہ میلی نہ صاف، بال مٹیالے بھورے رنگ کے جنہیں حجام نے جیسے سمجھ میں آیا کاٹ دیا تھا۔ رنگت بے آب، آنکھیں دھوپ میں بیٹھے رہنے سے دبی اور دھنسی ہوئی، مونچھیں پتلی اور آگے کو نکلی ہوئیں، دہانہ چوڑا اور اس کے دونوں طرف گہری جھریاں، اس پر زبان ملی جلی اردو اور پنجابی، یہ شاعر کا سراپا نہ کہلائے گا اور دراصل یہ ڈاکٹر صاحب کی اصل صورت تھی بھی نہیں بلکہ شلوار اور قمیص کی طرح روزمرہ کی صورت جو ایک پردہ کی طرح اوپر پڑی رہتی تھی اور ان کی اصل صورت کو روزمرہ کے گرد و غبار اور اس میل سے بچاتی تھی جو سبھی کے جسم پر جما کرتا ہے۔ یہ اوپر کا پردہ اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد ہی اٹھ گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع کی، وہ تخیل اور ہمت کی اس پستی سے بیزار تھے جو مسلمانوں کو صنعت اور کاروبار، سائنس اور تجارت کے میدانوں میں قدم رکھنے سے روکتی ہے اور انہیں تاریخ اور ادب کی کتابیں چاٹنے کے سوا اور کسی لائق نہیں چھوڑتی، ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی کہ میں نے جرمنی جا کر پریس کا کام سیکھا تھا اور ان کی ہمت افزائی نے مجھے بھی اس کا موقع دیا کہ میرے دل میں ان کی جو عزت اور محبت تھی اُسے ظاہر کروں۔ پھر اگلے وقتوں کی باتیں چھڑیں، مسلمانوں کا حال تو آپ جانتے ہیں، تاریخ ان کے مکان کی چھت ہے اور وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ دیواریں کہیں اتنی کمزور نہ ہو جائیں کہ چھت کا بوجھ نہ سنبھال سکیں، کہیں ان کے سر سے سایہ نہ اُٹھ جائے، ان کا گھر ویران نہ ہو جائے۔ اگلے وقتوں کی باتیں چھڑیں تو ڈاکٹر صاحب کی صورت سے دوسرا پردہ ہٹا۔

ظاہر میں تو وہی ڈاکٹر اقبال اسی لباس میں اسی کرسی پر دھوپ میں بیٹھے حقے کے کش پر کش لے رہے تھے لیکن ان کی باتیں سنتے سنتے کبھی تو اُس کتب خانہ کی تصویر آنکھوں میں پھر

جاتی تھی جہاں علم کا سارا ذخیرہ جمع ہو، جہاں عالم اور شاعر اور فقیہ مل کر بیٹھتے ہوں، ان کے دل میں ایک خیال، زبان پر ایک بات، آنکھ میں ایک نشہ ہو اور ان کی صحبت نے ایک فضا پیدا کر دی ہو جو آدمی کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس کے دل میں وہی ایک خیال سما جائے، زبان سے وہی ایک بات نکلے، آنکھ اسی ایک نشہ میں مست ہو جائے کہ جس نے عالم اور شاعر اور فقیہ کی تین ہستیوں کو ایک شخصیت بنا دیا تھا۔ کبھی نظر ہر قید سے آزاد ہو جاتی تھی، مشرق سے مغرب تک دنیا ایک قالین کی طرح بچھ جاتی تھی اور دنیا کا وہ کاروبار جو تخیل کو عاجز کر دیتا ہے، آنکھ سے دکھائی دینے لگتا، کبھی جہالت کی تاریکی علم کی روشنی سے چھنتی، مشکل کی گرہ شوق کے ہاتھوں کھلتی، کبھی علم اور شوق کی پیاس جذبۂ دین کے اُبلتے چشموں میں بجھتی، کبھی منزل کی دوری ہمت کو ڈراتی، کبھی منزل پر پہنچ کر انسان زمین و آسمان پر اس طرح نظر ڈالتا ہوا دکھائی دیتا جیسے کسان اپنی زمین کو دیکھتا ہے۔ اس وقت بھی ڈاکٹر اقبال اسی لہجے میں، اسی انداز سے باتیں کر رہے تھے لیکن میرا سر جھکتا جا رہا تھا، آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

یہ دوسرا پردہ نہیں ہٹا، اس کے آگے میں اور کچھ نہیں دیکھ سکا، اس کے آگے اور کوئی جا نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں ڈاکٹر اقبال کی خلوت تھی جس کا ایک ہی دروازہ تھا، اور وہ آسمان کی طرف کھلتا تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں دو تین روز کے اندر کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے یہاں صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، دو ایک بار میں ایسے وقت بھی گیا جب وہاں اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور ان سے ڈاکٹر اقبال کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ بھی میں نے سنی۔ پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی شخصیت کو تہہ در تہہ کیوں رکھتے ہیں، لاہور کے شہری بن کے کیوں رہتے ہیں، ملت اسلامی کا آفتاب ہوتے ہوئے بادلوں کے نقاب کیوں ڈالے رہتے ہیں، میں سمجھ گیا کہ وہ بے پروائی جو شاعرانہ مزاج کے لوگ بکھرے بالوں اور بے ڈھنگے کپڑوں سے ظاہر کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس طرح سے برتی کہ اپنے آپ کو ہر امتیاز سے محروم کر دیا۔ وہ خوش مزاجی جو دوسرے اچھے کپڑوں، سلیقے کے رہن سہن، نفاست اور تکلفات میں تلاش کرتے ہیں۔ انہیں ملنساری، ہنسی مذاق اور دریائی پرند کی طرح پانی میں رہ کر پرواز کو خشک رکھنے کی صفت میں ملی۔ انہوں نے اس

ادنیٰ وضع داری کو نظر انداز کیا جس کی رسائی لباس اور آداب صحبت کے آگے نہیں اور اس اعلیٰ وضع داری کو اختیار کیا جو منجدھار میں چٹان کو قائم رکھتی ہے یا زمین آسمان کی گردش میں قطب ستارے کو وہ دنیا میں دنیا والوں کی طرح رہتے تھے، دل میں صاحب دلوں کی طرح گفتگو جلوت میں کرتے تھے، شعر خلوت میں کہتے تھے۔ وہ خود بالکل سچ فرما گئے ہیں کہ ؎

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
دَرجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

"جنوں کے اس زور میں بھی میرا گریبان کبھی چاک نہ ہوا۔ یہ ہر دیوانے کے بس کی بات نہیں کہ جنون میں بھی آپے سے باہر نہ ہو۔"

اُن کی ظاہری صورت دراصل ضبط کا ایک پردہ تھا اور اس میں خوبی یہ تھی کہ یہ پردہ قدرتی تھا، جیسے ہیرے کے لیے پہاڑ کا آنچل، موتی کے لیے سیپ کا سینہ ہوا کرتا ہے۔

یہ سوچ کر مجھے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کے دل میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کی بڑی قدر تھی، یہ شکایت کرتے تھے کہ ان سے مل کر وہ اس طرح محظوظ نہ ہوئے جیسا کہ ان کا کلام سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں بیٹھ کر ہر شخص ان کا جلوہ دیکھ سکتا تھا، ڈاکٹر اقبال نہ رہتے یا ان کا جلوہ نہ رہتا، ان کی صحبت دراصل صحبت میں بیٹھنے والوں کا امتحان تھا۔ وہاں جا کر دوسرے یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال کتنے بڑے آدمی ہیں، ڈاکٹر اقبال خود یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ ملنے والا کس ذہنیت اور مذاق کا آدمی ہے اور اسی کے لحاظ سے گفتگو ہوتی، ڈاکٹر اقبال کے اپنے ذہن میں بڑی لوچ تھی، وہ نہ عقاب کی طرح بلندی کے پابند تھے، نہ چوپایوں اور آدمی کی طرح پستی میں گرفتار۔ سچے شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال اپنی نظموں میں اپنے متعلق جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے، اب یہ ان کے قدردانوں کا فرض تھا کہ ان کی شخصیت کو سمجھیں، اس سے اثر لیں اور روزمرہ زندگی انہیں باتوں کے چرچے کریں جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے دل میں ان کے کلام میں رہتے تھے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا...... اور اس کا دکھ سب سے زیادہ خود ڈاکٹر صاحب کو تھا۔ ان کی مایوسی کا جو عالم تھا، وہ ان کی ان بے مثل نظموں سے ظاہر ہوتا ہے جن میں انہوں نے اپنی بے قدری اور تنہائی کی کیفیت بیان کی ہے اور اس کی پرچھائیں سی، میں ایک مرتبہ ان کے چہرے پر

دیکھ بھی چکا ہوں۔لوگوں نے انہیں سیاست میں الجھایا، ان کی بات نہیں سمجھے۔ان کی زبان سے اپنی بات کہلوانے کی فکر میں لگے رہے۔ان کی بڑی غرض کو اپنی حقیر اغراض کا روپ دے کر اسے رسوا کیا، ان کے بڑے کام کے بہانے سے اپنا چھوٹا کام نکال کرانہیں اور ساری دنیا کو دھوکا دیا۔ جنہوں نے یہ نہیں کیا وہ بھی عمل کا کام کر کے دکھانے کا، تحریکیں اٹھانے کا شور مچاتے رہے۔ڈاکٹر اقبال سے مطالبہ کرتے رہے کہ اپنی آنکھیں بند کر کے اور دل خاموش کر کے ان میں آ کر مل جائیں، اجالے سے فائدہ نہ اٹھایا، آفتاب کو اپنے پاس بلاتے رہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا بڑا دل چھوٹے کاموں میں لگ ہی نہ سکتا تھا اور کوئی مانے یا نہ مانے ان کا دل اپنا بڑا کام کر بھی گیا۔جس شخصیت کا وہ خواب دیکھتے تھے، اس کے اور ان کے درمیان بس موقع کا فرق تھا، جس عمل کو وہ سچا سمجھتے تھے، وہ غور کیجیے تو ان کے اپنے کارناموں کا بس دوسرا رخ ہے۔انہوں نے اپنے اندر وہ یقین پیدا کر لیا تھا جو دنیا میں ایمان پھیلاتا ہے اور زندگی کا سارا بوجھ سنبھالتا ہے اور ان کے ذہن میں انسانیت کا جو تصور تھا وہی ہے جس نے دنیا کو بار ہا ایک نئی دنیا بنا دیا ہے اور ان کے کلام میں ایک نئی دنیا بنی بنائی ملتی بھی ہے، انہوں نے بہتیرے بھید بوجھ لیے تھے جو یقین کی جان اور انسانیت کی آبرو ہیں اور ان میں وہ صفت پائی جاتی تھی جو سچے یقین، سچی انسانیت، سچے علم کی پہچان ہے یعنی ایک پوری ملت کے تمام گہرے اور مستقل اور زندگی کی شکل و صورت دینے والے جذبات سمٹ کر ان کے دل میں آ گئے تھے اور اسے ایک نمونہ بنا دیا تھا کہ جسے دیکھ کر تاریخ کہتی ہے کہ ہاں صحیح ہے، مذہب کہتا ہے کہ ہاں یہی چاہیے اور ہر زمانے کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آرزو ہے کہ ہم بھی ایسے ہو جائیں، چھوٹی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ احتیاط کا لنگر ہو، ہر دلعزیزی کا بادبان ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو اور چلتی رہے، ستانے اور پناہ لینے کے لیے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل قریب رہے۔تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں، وہ موج تو چیز ہی اور ہوتی ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں، ہوا کو للکارتی ہے کہ دَم ہو تو ذرا اپنا زور دکھا، آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اونچا ہو سکتا ہو تو ہو جا، اسے ساحل سے عداوت ہوتی ہے، وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے اسے کہیں جانا نہیں ہوتا، اس کے لیے اٹھنا اور تڑپنا بس ہے۔ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی ایک موج تھی اور اس کا سمندر عالم اسلام تھا، میں اس سمندر کا ایک گمنام قطرہ بھلا کیا بتلا سکتا تھا

کہ موج اٹھی اور اس نے سمندر کو تہہ تک ہلا دیا، تڑپ کر آسمان کا منہ چوما اور پھر بیٹھ کر سمندر بن گئی، تو اس میں موج اور موج کو پیدا کرنے والے کی کیا مصلحت تھی، وہ کچھ اور کیوں نہ تھی، اس نے کچھ اور کیوں نہ کیا، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ یہ موج نہ ہوتی تو کوئی نہ ہوتا جو مجھے اپنے پہلو میں لیتا اور اتنا اونچا اٹھا دیتا کہ سمندر کو دیکھوں، سمندر کے پھیلاؤ کو دیکھوں، دونوں جہان پر ایک نظر ڈالوں اور تھوڑی دیر کے لیے سمجھوں کہ قطرہ کی بھی کچھ ہستی ہوتی ہے۔

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) جامعہ ملیہ کے مشہور استاد

(۲) پیام مشرق کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ جامعہ ملیہ کے تحت شائع ہونے والا ایڈیشن دوسرا تھا جو غالباً ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

# علامہ اقبال رحمۃ اللہ سے ملاقاتیں •

پروفیسر بخشی علی انور/تحریر: پروفیسر انور مسعود

## پہلی ملاقات فروری ۱۹۳۶ء

میں ایف اے کر چکا تھا۔ دیہاتی ماحول کے پڑھے لکھے تھے۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست بھی تھا۔ ان دنوں ایم اے کرنے کے بعد Peon ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دونوں ملازمت کے سلسلے میں لاہور آئے۔ ریلوے اکاؤنٹس آفس کا ایک امتحان پاس کر لیا تھا۔ علامہ صاحب سے ملنے کا شوق تھا۔ علامہ صاحب ان دنوں میورو روڈ پر جاوید منزل میں رہائش پذیر تھے۔ چٹھی رسان سے علامہ صاحب کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ اس وقت علامہ صاحب صحن کے باہر کھڑے تھے۔ صرف ایک جھلک دیکھی اور آگے جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۸ یا ۵۹ سال تھی۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ سر پر ٹوپی پہنی تھی۔ وقت صبح آٹھ نو بجے کا تھا۔

## جون ۱۹۳۶ء

مجھے ملازمت مل چکی تھی۔ میرے بھائی بیرسٹر تھے۔ میں نے ان کے ہاں ہائیکورٹ کے نزدیک رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ میرے بھائی کا نام بخشی حضور علی عاشق تھا۔ شباب اردو میں ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔ میرے ہم نام بخش انور علی میرے ساتھ تھے۔ پچھلا پہر تھا، چار پانچ بجے تھے۔ ہم بھائی صاحب کی کار میں گئے۔ اندر سے علی بخش آیا۔ اس کی عمر ۴۰ سال کے

• بصد شکریہ، سہ ماہی، رسالہ، لاہور، اقبال نمبر، 1992 بحوالہ جعفر بلوچ، مرتبہ مجالس اقبال، ص 269-271۔

لگ بھگ تھی۔ اس نے کہا، اپنا نام لکھ دو۔ لکھ دیا کہ College Student ہیں۔ اس وقت میری عمر ۱۷برس تھی۔ اندر پہنچے تو علامہ نے کہا: "فرماؤ۔" ہم نے کہا "حضور آپ کی زیارت کرنے آئے ہیں۔" تھوڑا سا مسکرائے۔ مسکراہٹ یہ بتاتی تھی کہ وہ دوسرے پیروں سے بدظن ہیں۔ پھر ہم نے صحت کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا، تکلیف بڑھ گئی تھی۔ بھوپال چلا گیا تھا۔ علاج کروایا تے ہن کچھ Better آں۔ (عبدالسلام ندوی نے ہماری اس ملاقات کی طرف اشارہ کیا ہے) اس وقت کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم تھا اور ساتھ ایک سائیڈ روم۔ پلنگ پر (لیٹے) تھے۔ اٹھ کر علی بخش سے کہا، حقہ لاؤ۔ ایک شعر کے بارے میں استفسار کیا:

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

ہمارے درمیان موضوعِ بحث مگر حرفِ شیریں تھا۔ فرمایا "میں اپنے شعر دا مطلب کدی نئیں دسیا۔ جو کسے نوں سمجھ آجائے، اصل چیز عمل اے، عمل نئیں تے کجھ وی نئیں۔" ہم تقریباً پندرہ منٹ علامہ صاحب کے پاس رہے۔

## تیسری ملاقات

۱۹۳۷ء کی ابتدا تھی۔ سردیاں تھیں، چند ایک دوست مل کر مشاعرہ کروانا چاہتے تھے۔ سوچا صدارت کس سے کروائیں۔ یہی Request لے کر علامہ صاحب کے پاس پہنچے۔ ہم نے سوچا منت کریں گے اور منا لیں گے۔ مشاعرے کا ٹکٹ رکھیں گے۔ یہ Consideration تھی۔ کچھ دوست بھوکے تھے۔ انھی چالاکیوں میں رہتے تھے۔ جب علامہ صاحب کے ہاں پہنچے تو کہا، فرماؤ۔ ہم نے کہا، لاہور میں نوجوانوں کی ایک ادبی انجمن ہے۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں مشاعرے کی صدارت کے لیے بھیجا ہے۔ کہا "مینوں تے پتہ نہیں۔" پھر انگریزی میں شروع ہو گئے۔

**I have given up attending public meetings,particularly these mushaaras.**

(میں عوامی جلسوں خصوصاً مشاعروں میں شمولیت ترک کر چکا ہوں۔)

ہم نے عرض کیا ''نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔''

کہنے لگے:

But I don't want to encourage them in this matter.

(لیکن میں اس معاملے میں ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا۔)

ہم نے کہا، آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا لٹریری تقریبات نہیں ہونی چاہئیں۔

جواب میں کہا What is literacy (لٹریسی کیا چیز ہے؟)

لٹریچر کا اگر کوئی مقصد ہے، پھر تو ٹھیک ہے۔ اگر بغیر مقصد کے ہے تو محض تضیع اوقات۔

ہم نے کہا، کیا نوجوانوں کو ایسی تقریبات منعقد نہیں کرنی چاہئیں؟

فرمایا:

> I don't prevent them because they are doing something. When they go home, they will have nothing to do except yawning.

(میں انھیں روکتا نہیں کیونکہ وہ کچھ نہ کچھ کر ہی رہے ہیں۔ جب وہ گھر چلے جائیں گے تو ان کے پاس جماہیاں لینے کے سوا کوئی کام نہیں ہوگا۔)

## چوتھی ملاقات

پس منظر یہ ہے کہ میں ''اسرار خودی'' کا منظوم اردو ترجمہ کر رہا تھا اور چھپوانے کا ارادہ تھا اور ایک پبلشر یہ چاہتا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز کی بات ہے۔ ملاقات ہوئی، ہم ایک گپی آدمی ساتھ لے گئے تھے جو بات کر لیتا تھا۔ جب ہم نے ترجمہ کی بات کی تو کہا، میں اپنی کتابوں کے اردو ترجمے کا قائل نہیں ہوں۔ عرض کیا کہ لوگ فارسی سے آشنا نہیں۔ اس لیے اسرار خودی کا جتنا اثر ہونا چاہیے تھا، اتنا نہیں۔ فارسی کا ذوق ختم ہو رہا ہے۔ ہم لوگوں کو آپ کے خیالات سے آشنا کروانا چاہتے ہیں۔

جواب میں فرمایا: ''یہ عوام کے لیے نہیں لکھی۔''

This is not meant for common people.

(یہ (کلام) عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔)

"یہ خیالات لوگوں کے سامنے فلٹر ہو کر آنے چاہئیں۔"

پھر فرمایا۔ کچھ پڑھو۔ میں نے ترجمہ پڑھنا شروع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ منظوم ہے۔ کہنے لگے:

If it is in poetry then do not read it at all. I could my self write in Urdu poetry. I myself wrote 300verses and then I destroyed them.

Do not think so lightly about Urdu language.

(اگر یہ نظم میں ہے تو اسے مت پڑھو۔ میں تو خود اردو نظم میں لکھ سکتا تھا (بلکہ) میں نے تین سو شعر لکھے بھی تھے مگر انھیں تلف کر دیا۔ تم اردو زبان کو اتنا ہلکا مت خیال کرو۔)

فارسی نظم اور اردو نظم میں فرق صرف روابط کا ہوتا ہے۔ اس سے اتنا کیا فرق پڑتا ہے۔ جہاں فرق پڑے گا وہاں اصل مفہوم غارت ہو جائے گا۔

# حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ سے آخری ملاقات●

پرویز

۳۸ء اور ۳۹ء کی درمیانی شب، گزشتہ سال کی ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا، گزری ہوئی کہانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں جس طرح کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے سے گزرے تو وہ معلوم نہیں ہوتا کہ چاند دوڑ رہا ہے یا بادل! اسی طرح دن گزرتے جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا زمانہ! ڈائری کے اوراق سے بعض بھولے ہوئے افسانوں کی یادیں تازہ ہوتی جا رہی تھی جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف، کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ ابھی چند ورق اُلٹنے پایا تھا کہ ۱۰ جنوری کے صفحہ پر ایک ایسا واقعہ مندرج پایا جس نے نگاہوں کو وہیں روک لیا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی واقعہ کی یاد نہیں بلکہ ایک مضراب ہے جس نے بربطِ ہستی کے تاروں کو یوں چھیڑ دیا ہے کہ ان کے اندر سوئے ہوئے الہیہ نغمات پھر سے بیدار ہو رہے ہیں اور شعلہ ریز دیپک کے سُروں میں تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہیں۔

واقعہ کی تمہید یوں ہے کہ ۹ جنوری کو ''دہلی کا قافلہ'' زیر امارت مولانا محمد اسلم صاحب جیراج پوری بتقریب ''اقبال ڈے'' لاہور پہنچا۔(ا) رات تک مصروفیت رہی۔ ان اجلاس کا تذکرہ بھی ڈائری میں لکھا پایا لیکن ۱۰ جنوری کی صبح کے واقعہ کی تفصیل جو کہ ڈائری کے کئی ایک صفحات پر پھیل ہوئی ہے، کچھ ایسی وجد انگیز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام کو بھی اس حظ کیف میں شریک کر لوں۔ بہتر ہو کہ اسے ڈائری کے الفاظ میں ہی سنیے:

---

● بصد شکریہ، ماہنامہ طلوعِ اسلام، اپریل 1951 (نوشتہ 1939) بحوالہ صابر کلوروی، مرتبہ، اقبال کے ہم نشین، ص 226-234۔

## ۱۵ جنوری بروز سوموار

صبح نو بجے جاوید منزل واقع میورو ڈ پر حاضر ہوئے نذیر نیازی صاحب (۲) حسب وعدہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ حضرت علامہ پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے، لحاف اوڑھے ہوئے بلکہ لحاف کے ساتھ ایک کمبل بھی ملفوف تھا حقہ سامنے تھا جو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔

نیازی صاحب نے بتایا کہ جب پچھلے دنوں لارڈ لوتھین (۳) ملنے کے لیے آیا، تو بھی آپ اسی انداز میں لیٹے لیٹے ملے تھے۔ آواز ابھی تک صاف نہیں ہوئی، اس طرح بولتے ہیں جیسے کسی کی گھگھی بندھ رہی ہو۔ مولانا کی وجہ سے سلسلۂ گفتگو اردو میں چھیڑا لیکن آپ کے لب ولہجہ سے حسب معمول ''پنجابیت'' صاف نمایاں تھی جسے وہ کسی تکلف کے پردہ میں چھپانا نہیں چاہتے۔ عمر قریب ساٹھ برس سمجھئے لیکن اس دفعہ کمزور ہو رہے تھے، بایں ہمہ اس کمزور اور بڑھاپے میں بھی دبدبہ اور عظمت کی وہی شان تھی لیکن سادگی اتنی کہ اگر کسی کو پہلے تعارف نہ ہو تو وہ شاید ہی سمجھے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے بیٹھا ہے۔ پہلے متفرق سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ آپ کی باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی جسے ظرافت کی بجائے شگفتگی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، ہمیشہ موجود رہتی ہے لیکن آج کل آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ضرورت بھی رہتی ہے کہ سنجیدہ گفتگو کو یہاں وہاں سُبک رَو کر دیا جائے۔ ضمناً ایک بات سامنے آ گئی۔ فرمایا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے جب واپس آ رہے تھے تو مولوی شفیع داؤدی صاحب (مرحوم) (۴) بھی ساتھ تھے۔ میں عرشہ جہاز پر کانفرنس کی روئیداد دیکھ رہا تھا کہ کتاب ہاتھ سے گر گئی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں عرب لڑکے جہاز کے ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ مولوی صاحب کو عربی آتی نہیں تھی، گھبراہٹ میں آواز دی کہ یا شیخ ذلک الکتاب لاریب فیہا وہ سمجھ گئے اور کتاب جو اتفاق سے ایک کشتی میں جا گری تھی، اُٹھا لائے۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربارِ فرعون کے ساحر جن کی قوتِ ایمانی استبدادِ فرعون کا دندان شکن جواب ہے، انہیں ''جاوید نامہ'' میں ضرور جگہ ملنی چاہیے تھی۔ فرمایا کہ ''جاوید نامہ'' میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں، جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمد بریلوی) اور سید احمد دہلوی (سرسید) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں، یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں، اب کسی اور موقع پر ان کو لکھوں گا۔

میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں اس منزل کے بعد دوسری منزل کے لیے جہاں ایک طرف انسانوں کے لیے یہ آیا ہے کہ والیٰ ربھم ینسلون (وہ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے) دوسری طرف خدا کے متعلق بھی ہے کہ وجد ربك والملك صفاً صفا (کہ تیرا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے) گویا خدا خود اس زمین پر آئے گا اور اشرقت الارض بنور ربہا (زمین اس کے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ ڈراما کچھ اور سین اسی اسٹیج پر دکھائے گا۔ فرمایا کہ یہ درست ہے لیکن ارض وسما اور پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے، جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان (Time and space) کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ اگلی منزل میں شعور بدل جائے گا کیا معلوم ارض کیا ہو اور سما کیا ہو یا دونوں ایک ہی ہوں۔ اسی لیے تو فرمایا کہ یوم تبدل الارض غیر السمٰوت والارض (جس دن یہ ارض و سمٰوت بدل جائیں گے) شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بُعد باقی نہ رہیں، خواب میں دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں، نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان۔ ایک سیکنڈ کے خواب میں ایک شخص بارہ برس تک امریکہ بھی رہ آتا ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ کیا معلوم کہ دوسرے شعور میں کیفیت و کمیت کا کیا عالم ہو؟

فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو Time کے نظریہ پر ایک مقالہ لکھ کر اپنے استاد Mctaggart کے پاس لے گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا لکھ دیا؟ اس پر لوگ ہنسیں گے، میں نے اسے ضائع کر دیا۔ ایک عرصہ کے بعد جب برگسان کے نظریئے شائع ہوئے تو ان میں ٹائم کے متعلق وہی کچھ تھا جو میں نے لکھا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے مقالہ کے ضائع کر دینے کا بڑا افسوس ہوا، اس لیے کہ میرے مقالہ سے قرآن کریم کی حقیقتِ ثابتہ سامنے آجاتی تھی۔

اس کے بعد برگساں، نیٹشے اور اپنے فلسفہ کے اختلافات کی توضیح فرماتے رہے اور بتایا کہ وہ فلسفہ جس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہو، کس طرح ایک یقینی شے بن جاتی ہے اور وہ فلسفہ جو محض انسانی دماغ کا رہینِ منت ہو، کس طرح ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے اور جب کبھی اسے یقین کا رُتبہ حاصل ہوتا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو۔ آپ یہ کچھ بیان فرما رہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا، کہ ہم کسی نئی دنیا میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ذہنِ انسانی کی وسعتیں کس قدر حدود نا آشنا ہیں اور یہ ہستی جسے دنیا نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا

ہے، علم وادراک کی کن بلندیوں پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے اور دماغ بھی ایسا جو ثریا سے درے کی بات ہی نہ جانتا ہو۔ بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو دو دو جملوں میں صاف کرتے جاتے تھے۔

پھر قرآن کریم کے متعلق ذکر آ گیا۔ فرمایا کہ جب میں ایف اے (F.A) میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا، کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آ کر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آ گیا کہ چھ مہینے ہو گئے، ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہے۔ پھر یہ سوال کیسا ہے؟ نہایت نرمی سے فرمایا کہ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کہ کچھ عربی جانتا ہوں، کہیں کہیں سے سمجھ میں آ جاتا ہے، بات ختم ہوئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹا قرآنِ کریم اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے، میں حیران تھا کہ کیا نبی اکرم ﷺ کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا؟ فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضور ﷺ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر میں حیران تھا۔ فرمایا کہ انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے، اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمد ﷺ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر ایک نبی محمد ﷺ ہی کے مختلف مدارج تھے۔ وہ سلسلہ گویا (Muhammad in the making) تکمیلِ محمد ﷺ کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا، البتہ شعور انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی حتیٰ کہ "محمد ﷺ" مکمل ہو گیا، بابِ نبوت بند ہو گیا، انسانیت اپنے معراجِ کُبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمد ﷺ ہے، کوئی انسان جتنا محمدیتؐ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن کریم اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآنِ کریم اُسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر یہ نازل ہونا شروع ہوتا ہے۔

یہ تو تھی قرآنِ کریم کے قلب کے راستے سمجھ میں آنے کی صورت۔ دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کے متعلق حضرت علامہ ؒ نے فرمایا کہ قرآن فطرت اللہ ہے یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوئے، کوئی یہاں کوئی وہاں، ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے گئے، اس مجموعہ کا نام ہے قرآن مجید۔ اب بھی جہاں

کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہوگی وہ لینن کے الفاظ میں ہو یا سنوسی کے، قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہوگا۔ اس لیے کہ حیاتِ انسانی کے لیے جس قدر حقائق کی ضرورت تھی، وہ سب کے سب اس کے اندر آچکے ہیں۔ اب قرآنِ کریم کو اس طرح سمجھنا چاہیے جس طرح یہ دُنیا کو ملتا چلا آیا ہے۔ کبھی ایک حقیقت کسی زرتشت کو ملی تھی کہیں کسی بدھ کو وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھیے، وہاں نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں اور افسانے کون کون سے، حالانکہ اس مذہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہوں گے، ان کے حقائق قرآن کریم میں موجود ہوں گے اور ان کے افسانوں کی تردید ہوگی، یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہوں گے۔ جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہ ہو، معلوم نہیں ہوسکتا کہ قرآن کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ ہم نے ارض وسما کو لاعبین (InSport) کھیل کود میں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات ایشور نے ایک ''لیلا'' رچائی ہے۔ چنانچہ اُن کے ایک خدا کا نام نٹراجن (کھلاڑیوں کا بادشاہ) ہے۔ اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ رنگ راگ میں مصروف ہے اور دنیا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس افسانے کی تردید لاعبین کے اندر ہے یا مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم (خدا کو اونگھ یا نیند نہیں آتی) ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ سب کائنات پرماتما کا خواب ہے۔ جب وہ بیدار ہوجائے گا تو یہ خواب بھی پریشان ہوجائے گا۔ خود ہمارے ہاں بھی بعض صوفیا میں اس قسم کا تصور موجود ہے۔ اس افسانہ کی تردید قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کی ہے، لہٰذا قرآن کریم سمجھنے کے لیے پہلے اس قسم کے ''افسانوں'' کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ خالص حقائق اب قرآنِ کریم کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتے۔

رسول کی تعریف (Definition) کے متعلق فرمایا کہ ایک رسول میں اللہ کی طرف سے یہ شعور پیدا کردیا جاتا ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ (Length of Time) کو سمیٹ کر ایک حال (Present) کے اندر مرتکز کرلے، لہٰذا جو باتیں دوسروں کے نزدیک دو ہزار برس بعد آنے والی ہوتی ہیں، وہ رسول کے سامنے زمانۂ مستقبل کی نہیں بلکہ حال کی ہوتی ہیں، اس لیے وہ اپنی وحی میں اس قدر محکم یقین رکھتا ہے کہ اس کی سچائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں، وہ ان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اس لیے اُن کے دل میں شک وریب کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔

سیاست حاضرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوتی رہیں، فرمایا کہ مجھے تو نظر آتا ہے کہ ابھی

عوام میں سے کوئی صاحبِ ایمان کھڑا ہو جائے گا اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئے گا۔ اس کی عملی شکل ان کے سامنے وہی ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کا تصور ہے، فرمایا کہ اس کے سوا ہندوستان کی سیاست کا کوئی اور عملی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ اقبالؔ کے دماغ کے متعلق تھا لیکن حقیقی اقبالؔ ان پردوں کے پیچھے قلب کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھپا رہتا ہے۔ ہر چند نیازی صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ کسی جذباتی چیز کا تذکرہ نہ چھیڑنا کیونکہ اس کا ان کی صحت پر بے حد مُضر اثر پڑتا ہے لیکن ایک بات غیر ارادی طور پر ایسی آ گئی جس سے ہمیں حقیقی اقبال کی ایک جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو گئی۔ مولانا صاحب نے دریافت کیا کہ آج کل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے؟ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخمہ کس تار پر جا لگے گا۔ فرمایا کہ گزشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے، صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستے میں رہتا ہوں، جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی کچھ وہیں کی ہی باتیں ہوتی ہیں، یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، کچھ طبیعت سنبھلی تو فرمایا کہ بہت کچھ دل میں ہے کہ حضورؐ کے آستانۂ اقدس پر پہنچوں گا تو یہ بھی عرض کروں گا، وہ بھی۔ راستہ طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہنچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ نیازی صاحب سے فرمایا کہ تازہ کلام سے کوئی شعر ان کو سناؤ۔ انہوں نے ایک شعر سنایا تو فرمایا کہ ہاں ایک شعر یاد آ گیا، کعبۃ اللہ میں پہنچ کر یہ حضورِ حق عرض کیا ہے کہ ؎

تو باش این جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا لیکن دوسرے مصرعہ میں ''منزلِ دوست'' تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی۔ دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا ہو گئی ہے، لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے، یوں محسوس ہوا کہ سارا کلیجہ امنڈ کر منہ میں بھر آیا ہے، گلا پھول گیا، چہرہ سرخ ہو گیا، اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لے جا رہے ہیں، بڑے کرب و اذیت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگے۔ غش کی سی حالت ہو گئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔

ہم ششدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا، ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ ہم نے کیوں اس

مضمون کو چھیڑ دیا۔

کچھ دیر اور بیٹھے کہ ان کی طبیعت سنبھل جائے، اجازت چاہی تو مولانا صاحب سے فرمایا کہ ایک دن اور ٹھہرنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی؟ ہماری دفتر کی پابندیاں اس کی کب اجازت دیتی تھیں! طوعاً و کرہاً رخصت ہوئے، دیکھا تو بارہ بج چکے تھے، تین گھنٹے گزر گئے اور یوں معلوم ہوا کہ شاید پانچ منٹ ہوئے ہیں۔

زندگی میں چند لمحات بعض اوقات حاصلِ زندگی بن جاتے ہیں، یہ چند لمحات اسی قسم کے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اقبال کہاں پہنچ چکا ہے۔ دماغ ہے تو عرش کی بلندیوں پر اور قلب ہے تو عشق رسول ﷺ میں خاکستر! اے کاش مسلمانوں کی سمجھ میں آ جاتا کہ انہیں فطرت کی کرم گستری نے کس قدر بیش بہا نعمت عطا فرمائی ہے۔ (مرقومہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء)

---

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملاقات میں جتنی باتیں ہوئیں اور جس طرح ہوئیں میں نے وہ سب اس یادداشت میں لکھ لی تھیں۔ بہر حال یہ تھے وہ تاثرات جو میرے ذہن میں باقی تھے جنھیں میں نے محفوظ کر لیا۔ اُس وقت اس کی بھی کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ہو گی اور اس کے بعد عالمِ اسلامی کی یہ جلیل مرتبت ہستی ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے پنہاں ہو جائے گی۔ اس کمی کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جنھیں کبھی حضرت علامہ کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی ہو، آج تو اس قسم کی یادداشتوں کے اوراق ہیں اور دلِ حرماں نصیب کی حسرتیں کہ ع

دگر دانائے راز آید کہ ناید(۵)

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) اس ''اقبال ڈے'' کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے مضمون ''یومِ اقبال'' از اسلم جیراج پوری۔

(۲) سید نذیر نیازی: مشہور ماہر اقبالیات

(۳) لارڈ لوتھین سے علامہ کی ملاقات گول میز کانفرنس کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ہندو مسلم اختلافات کے حل کے لیے جو موقف علامہ کا تھا، لارڈ لوتھین بھی علامہ کے ہم خیال تھے۔ یہ لارڈ لوتھین ہی تھے جنہوں نے ۱۹۳۳ء میں علامہ کو انگلستان میں روڈز لیکچر کی دعوت دی تھی مگر علامہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی علالت کی وجہ سے یہ لیکچر نہ دے سکے تھے۔

(۴) مولوی شفیع داؤدی، روشن خیال عالم، علامہ کے دوست، جو گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

# اقبال رحمۃ اللہ •

پنڈت جواہر لال نہرو

کمال پاشا کی قدر ہندوستان کے مسلمان اور ہندو یکساں کرتے تھے۔ اُس نے صرف ترکی کو بیرونی تسلط سے آزاد کیا اور اس کے اندرونی انتشار کو دور کیا بلکہ یورپ کی سامراجی طاقتوں خصوصاً انگلستان کی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا لیکن جب اتاترک کی پالیسی ظاہر ہوئی یعنی اُس کی مذہب سے بیگانگی، خلافت کا خاتمہ، سلطان کی برطرفی، دنیوی ریاست کا قیام اور درویشوں کے سلسلے کو توڑنا تو اس کی یہ قدر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں باقی نہیں رہی اور وہ اس کی جدیدیت کی پالیسی سے بے زار ہو گئے مگر اس پالیسی کی وجہ سے نوجوان ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ اور زیادہ ہر دلعزیز ہو گیا۔ اتاترک نے ایک حد تک خیالی عمارت کو مسمار کر دیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن میں غدر کے زمانے سے رفتہ رفتہ تعمیر ہو رہی تھی اور پھر ایک قسم کا خلا پیدا ہو گیا۔ بہت سے مسلمانوں نے اس خلاء ذہنی کو قومی تحریک میں شریک ہو کر پُر کر لیا۔ بعض پہلے ہی شریک ہو چکے تھے اور بعض تذبذب اور شبہے کے عالم میں اسے دور سے دیکھ رہے تھے۔ اصل کشمکش جاگیری اندازِ فکر اور جدید رجحانات میں تھی۔ جاگیردار طبقے کی قیادت عوام کی تحریک خلافت کے سیلاب میں بہہ گئی تھی لیکن یہ خود تحریک سماجی اور معاشی حالات کی ٹھوس بنیادوں پر یا عوام کی ضرورتوں پر قائم تھی۔ اس کا مرکز ملک کے باہر تھا اور جب اتاترک نے اس مرکز ہی کو ختم کر دیا تو تحریک خلافت کی ساری عمارت ایک دم سے بیٹھ گئی۔ مسلم عوام کے حواس جاتے رہے اور ان میں کسی قسم کے سیاسی عمل کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ پرانے جاگیردار قسم کے لیڈر تو ایسے موقعے کے

• بصد شکریہ، جواہر لال نہرو، تلاش ھنہ 1946، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 14۔219۔

انتظار ہی میں تھے۔ وہ برطانوی پالیسی کی مدد سے جس نے ہمیشہ ان کی دستگیری کی تھی، پھر میدان میں آگئے لیکن اب وہ پہلی سی بات نہ تھی کہ لوگ اُن کی قیادت کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔ اب حالات کا رنگ کچھ اور ہو گیا تھا، مسلمانوں میں بھی بہت دیر کے بعد ایک متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ عوام کی سیاسی تحریک نے جو نیشنل کانگریس کی قیادت میں اٹھی، ان پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔

اگر چہ دراصل مسلمان عوام اور نئے متوسط طبقے کی ذہنیت کی تشکیل واقعات نے کی تھی لیکن موخر الذکر طبقے خصوصاً اس کے نوجوان کو متاثر کرنے میں سر محمد اقبال کا اہم حصہ ہے، ابتدا میں اقبال نے اردو میں پرزور قومی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ جنگ بلقان کے دوران میں انھوں نے اسلامی موضوع اختیار کیے، وہ اپنے زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے عام جذبات سے متاثر ہوئے اور خود انھوں نے ان جذبات پر اثر ڈالا اور انھیں شدید کر دیا لیکن وہ عوام کی قیادت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیری نظام سے وابستہ تھے۔ نسل کے اعتبار سے وہ کشمیری برہمن تھے۔ انھوں نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے ذریعے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے ایک فلسفیانہ نظریہ مہیا کر دیا اور ان میں تفریقی رجحان پیدا کر دیا۔ یوں تو ان کی ہر دلعزیزی ان کے کمال شاعری کی وجہ سے تھی لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ مسلم ذہن کی اس ضرورت کو پورا کر رہے تھے کہ اسے اپنے لیے ایک لنگر مل جائے۔ قدیم اتحادِ اسلامی کا خیال اب بے معنی ہو گیا تھا، خلافت ختم ہو چکی تھی۔ سب اسلامی ملکوں میں اور خصوصاً ترکی میں قومیت پرستی کا زور تھا اور انہیں ایک دوسرے کی کوئی پروا نہ تھی۔ قومیت کا تصور ایشیا پر یورپ و امریکہ کی طرح چھا گیا تھا، ہندوستان میں قومی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور برطانوی حکومت کو بار بار للکار چکی تھی، یہ قومیت ہندوستانی مسلمانوں کے دل کو لگتی تھی اور آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اہم حصہ لیا تھا لیکن ہندوستان کی اس قومی تحریک میں ہندوؤں کا غلبہ تھا اور اُس پر ان ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اس لیے مسلم ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے اس قومیت کو قبول کر کے یہ کوشش کی کہ اس پر اپنا اثر ڈالیں، بہت سے اس تحریک سے ہمدردی رکھنے کے باوجود حیص بیص کے عالم میں اس سے الگ رہے اور بہتوں نے تفریق کا راستہ اختیار کیا جس کی طرف اقبال کے فلسفے اور شاعری نے ان کی رہنمائی کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ یہی وہ حالات تھے جس کے ماتحت اب سے چند سال پہلے تقسیم ہند کی

آواز بلند ہوئی۔ یوں تو اس کے بہت سے اصلی اور ضمنی اسباب تھے، فریقین کی بہت سی غلطیاں اور حماقتیں تھیں اور سب سے بڑھ کر حکومت برطانیہ کی تفریقی پالیسی تھی لیکن ان سب کی تہہ میں یہ نفسیاتی کیفیت تھی جو علاوہ اور تاریخی اسباب کے اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے متوسط طبقے کی نشوونما بہت دیر میں ہوئی۔ آج ہمارے ملک میں جو اندرونی کشمکش نظر آتی ہے وہ صرف قومی تحریک اور غیر ملکی حکومت ہی میں نہیں بلکہ جاگیری نظام اور جدید تصورات واردات میں بھی ہے۔

یہ کشمکش مجموعی طور پر پوری قوم میں بھی نظر آتی ہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری بڑی بڑی جماعتوں کے اندر بھی۔ قومی تحریک جس کی نمائندگی نیشنل کانگریس کرتی ہے، یقیناً جدید تصورات واردات کی نشوونما کے تاریخی عمل کی علمبردار ہے۔ اگرچہ وہ ان تصورات کو بعض قدیم اصولوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے، اسی وجہ سے اس میں ہر قسم کے لوگ جو آپس میں شدید اختلافات رکھتے ہیں، جمع ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں میں ایک تنگ اور بے لوچ سماجی نظام نے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور دوسری جماعتوں کو بھی بھڑکا دیا، مگر اب خود اس سماجی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور اس میں وہ سختی نہیں رہی۔ بہرحال اس نظام میں اتنی قوت نہیں کہ وہ قومی تحریک میں جو وسیع معنی میں ہر قسم کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں پر حاوی ہے، روڑا اٹکا سکے۔ اب قومی تحریک میں اتنا زور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھتی رہی ہے۔ مسلمانوں میں جاگیری عناصر بدستور طاقتور ہیں اور عام طور پر انہیں عوام سے اپنی قیادت کے منوانے میں کامیابی ہوتی رہی ہے۔ ہندو متوسط طبقے اور مسلمان متوسط طبقے کی نشوونما میں ایک نسل سے زیادہ کا فرق رہا ہے اور یہ فرق اب تک سیاست، معیشت، اور دوسرے شعبوں میں نمایاں ہے۔ اسی پسماندگی نے مسلمانوں میں خوف کی نفسیاتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

پاکستان یعنی ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز خواہ وہ جذباتی حیثیت سے کتنی ہی کشش کیوں نہ رکھتی ہو، اس پسماندگی کا علاج نہیں ہے بلکہ یہ اندیشہ ہے کہ اس سے جاگیردار طبقے کو اور تقویت پہنچے گی اور مسلمانوں کی معاشی ترقی میں تاخیر ہوگی۔ اقبال پاکستان کے اولین حامیوں میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے لازمی خطرے اور لغویت کو محسوس کر لیا تھا۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران میں اقبال نے ان سے یہ کہا تھا کہ

انھوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمایت کی تھی مگر اُن کو یقین تھا کہ یہ تجویز کُل ہندوستان کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے مضر ہے، شاید انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا تھا، کیونکہ اس وقت تک اُس نے کوئی اہمیت نہیں حاصل کی تھی۔ ان کا عام نظریہ زندگی پاکستان یا تقسیم ہند کے اس تصور کے ساتھ جو بعد میں پیدا ہوا، نہیں کھپتا تھا۔(۱)

آخر عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا۔(۲) سوویت روس کی زبردست کامیابی نے ان کو بہتر متاثر کیا اور ان کی شاعری کا رخ بدل گیا۔ اپنی وفات سے چند مہینے پہلے جب وہ بستر علالت پر تھے، انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور میں نے بڑی خوشی سے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔(۳) جب میں مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کر رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ باوجود اختلاف کے ہم دونوں میں کس قدر اشتراک خیال ہے اور کتنی آسانی سے ان کے ساتھ نباہ ہوسکتا ہے، ان کی پرانی باتیں یاد آرہی تھیں اور وہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر پہنچ جاتے تھے۔ میں خود بہت کم بول رہا تھا اور بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں ان کا اور ان کی شاعری کا مداح تھا اور مجھے بڑی خوشی تھی کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میرے رخصت ہونے سے ذرا دیر پہلے انھوں نے مجھ سے فرمایا ''تم میں اور جناح میں کیا چیز مشترک ہے؟ وہ ایک سیاستدان ہیں اور تم محب وطن ہو۔'' مجھے امید ہے کہ مجھ میں اور مسٹر جناح میں اب بھی بہت کچھ مشترک ہوگا۔ اب رہا میرا محب وطن ہونا تو یہ آج کل کوئی قابل تعریف چیز نہیں سمجھی جاتی، خصوصاً اس محدود معنی میں جس میں یہ لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مجھے ہندوستان سے بڑی محبت ہے لیکن میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ساری دنیا کے مسائل تو درکنار خود اپنے ملک کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے لیے ہمیں قومی ہمدردی سے زیادہ وسیع جذبے کی ضرورت ہے لیکن اقبال کا یہ خیال یقیناً صحیح تھا کہ میں کچھ زیادہ سیاستدان نہیں ہوں، اگرچہ سیاست نے مجھے اپنے چُنگل میں دبا رکھا ہے۔(۴)

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) ایڈورڈ تھامسن کے نام علامہ کا ایک خط حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری سے دریافت ہوا۔ مولانا راغب احسن کے نام خطوط اقبال جہاں دیگر صفحہ ۱۱۶ پر علامہ نے جن، خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے پنڈت نہرو کے بیان کی مزید تائید ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

......"میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں...... براہِ کرم نوٹ فرمالیں کہ اس تبصرہ کا مصنف اس مغالطہ کا شکار ہے کہ جیسے میری تجویز "پاکستان کی اسکیم" سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں تک میری تجویز کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے جب کہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال و مغرب کے مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علیحدہ ہو اور انگلستان سے براہ راست وابستہ ہو۔"......

(۲) پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں، علامہ نے شروع میں اشتراکیت کی حمایت میں کچھ اشعار کہے تھے لیکن آخر عمر میں وہ اس تحریک کے زبردست مخالف تھے۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" جو علامہ کے آخری مجموعہ کلام ارمغانِ حجاز میں شامل ہے، سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۳) پنڈت نہرو کی یہ ملاقات جنوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ پنڈت نہرو ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر کے ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمے میں شہادت کے لیے لاہور آئے تھے اور میاں افتخار الدین کے گھر ٹھہرے، اس ملاقات میں میاں افتخار الدین اور راجہ حسن اختر دونوں موجود تھے۔ لاہور میں اس ملاقات کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی۔ اقبال کا یہ فقرہ کہ "جواہر لال آپ محب وطن ہیں اور جناح سیاستدان" بے حد مشہور ہو۔ اردو ڈائجسٹ، اقبال نمبر 77) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مفکر پاکستان از حنیف شاہد، صفحہ ۳۵۵۔

# علامہ اقبال رحمۃ اللہ سے ایک مختصر ملاقات •

تلوک چند محروم

جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۱۳ء کے مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا۔ میں ڈیرہ اسماعیل خاں سے ایف اے کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر دینے لاہور آیا اور موہن لال روڈ پر ایک سدیشی قسم کے ہوٹل میں اپنے ایک ہم سبق دوست کے ساتھ مقیم ہو گیا۔ ان دنوں حضرت علامہ انارکلی بازار میں دوسری منزل پر قیام پذیر تھے۔ اقبال کے کلام کا کوئی دلدادہ لاہور آئے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے بغیر واپس چلا جائے۔ میں نے اسے بڑی بدقسمتی خیال کیا۔ مجھے ان کے مزاج اور طبیعت کے متعلق ان کے کلام سے جو کچھ علم تھا، وہ تو اطمینان بخش تھا لیکن پھر بھی میں سوچ میں پڑ گیا کہ آیا بغیر کسی وساطت کے خود ہی پہنچ جاؤں یا کوئی وسیلہ تلاش کروں۔ اسی اثناء میں لالہ لال چند فلک اتفاقاً مل گئے۔ میں نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب مجھ سے بے تکلف ہیں۔ میں آپ کو لے جاؤں گا۔'' ہم نے آپس میں وقت مقرر کیا اور مقررہ روز علامہ کے مکان پر پہنچ گئے۔

پہلوانی قد وقامت کے ملازم (علی بخش) نے دروازہ کھولا، ہمیں برآمدہ میں بٹھا کر علامہ کی خدمت میں فلک صاحب کا پیغام پہنچایا۔ چند منٹ میں آپ قمیص اور شلوار میں ملبوس تشریف لائے۔ ہم نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے تپاک سے مصافحہ فرمایا۔ فلک نے میرا تعارف کرایا۔ غائبانہ واقفیت تو رسالہ 'مخزن' کے ذریعے ہو چکی تھی، مل کر اظہار مسرت کیا۔

• بصد شکریہ، ہفت روزہ، چٹان، لاہور، شمارہ بابت ۳۰ جنوری ۱۹۵٦ء، بحوالہ جعفر بلوچ، مجالس اقبال، ص 49-48۔

علامہ نے مسکراتے ہوئے پنجابی زبان میں فلک سے کہا (آگے چل کر بھی تمام گفتگو پنجابی میں ہوتی رہی) ”کہیے صاحب کوئی اور سازش سرکار کے خلاف ہو رہی ہے یا نہیں؟“ فلک نے جواب میں کہا ”اگر آپ کی سرپرستی میسر ہو جائے تو یہاں کیا دیر ہے؟“ علامہ ہنستے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئے، پوچھا ”آپ کہاں ہیں اور کیا شغل ہے؟“ میں نے عرض کیا ”ڈیرہ اسماعیل کے ایک ہائی سکول میں ٹیچر ہوں۔“ فرمایا ”پھر تو شعر کہنے کے لیے آپ کو کافی وقت مل جاتا ہوگا۔ میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھاتا تھا، شعر و شاعری کے لیے بہت وقت مل جاتا تھا۔“

میں نے عروض کے متعلق پوچھا کہ آیا شاعر کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے۔ جواب ملا۔ ”میں نے تو علم عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے۔“ (سبقاً سبقاً کے الفاظ پنجابی فقرے میں استعمال فرمائے تھے) میرے اس سوال پر کہ شاعری میں ترقی کرنے کے لیے کن ذرائع کی ضرورت ہے۔ فرمایا ”کافی مشق سخن اور مطالعہ لازمی ہیں۔“ میں نے اس پر کہہ دیا ”کافی مشق سخن سے آپ کی مراد اگر پرگوئی ہے تو اس سے کلام میں اسقام کے داخل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔“ اور ساتھ ہی نظیر اکبرآبادی کی مثال پیش کی۔ فرمایا ”مشق کے ساتھ احتیاط سے بھی تو کام لیا جا سکتا ہے۔“ اس بارے میں میری تسلی ہو گئی۔

مجھے یاد نہیں کہ سوامی رام تیرتھ آنجہانی کا ذکر کس سلسلے میں آ گیا۔ علامہ نے ان کے متعلق محبت آمیز جذبات کا اظہار فرمایا اور ساتھ ہی ایک لطیفہ سنایا کہ ان کا لڑکا پچھلے دنوں ولایت سے منروالوجیکل انجینئرنگ [یہی لفظ یا اس سے ملتا جلتا کوئی امتحان تھا؟ محروم] کا امتحان پاس کر کے لوٹا اور مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اس سے کہا ”بھئی تمہارے ابا تو آسمان پر اڑتے تھے۔ اس کے برخلاف تم نے زمین میں دھنسنے کا علم کیوں سیکھا؟“ اس پر ہم دیر تک ہنستے رہے۔

آخر میں نے عرض کیا ”آپ کی پرسوزئے کی بہت تعریف سنی ہے۔ ہے تو بڑی جسارت لیکن یہ درخواست کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اپنے چند شعر ترنم میں عطا فرمائیں۔ لاہور آنا مشکل ہوتا ہے۔ کسی جلسے میں پہنچ کر سننا اتفاقات پر منحصر ہے۔“ اس پر فرمایا ”میں سنا دیتا لیکن ساتھ کے کمرے میں بڑے بھائی صاحب موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں میں اس طرح نہیں پڑھا کرتا۔ آپ کسی اور وقت آ جائیں۔“ افسوس کہ امتحان کی مصروفیت کے باعث میں پھر حاضر نہ ہو سکا اور اس وقت دل کی یہ خواہش دل ہی دل میں رہی لیکن پانچ سال بعد ۱۹۱۸ء میں بریڈلا

ہال کے سرکاری مشاعرہ میں ان کی زبان سے دو مختصر نظمیں (ایک اردو میں، دوسری فارسی میں) سنیں۔ وہ پرسوز، بلند اور پاکیزہ ترنم مجھے آج تک نہیں بھولا۔ بریڈلا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ سٹیج پر ٹہلتے ہوئے شعر سنا رہے تھے۔ خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو اس کی آواز سنائی دے۔ نظمیں دونوں زبانی سنائیں۔ ایک دفعہ درمیان میں ایک شعر حافظہ سے اتر گیا۔ آپ چپ چاپ منٹ دو منٹ ٹہلتے رہے۔ اس وقت کیا مجال جو کسی نے کھانسا بھی ہو۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ''سبحان اللہ۔ سبحان اللہ'' کی آواز کہیں سے سنائی دے جاتی تھی۔

# علامہ اقبال•

ثریا احمد

پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں مَیں نے ''خضرِ راہ'' ان کو پڑھتے سنا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ یورپ کے بعد عالم اسلام نہایت کرب کے عالم میں تھا۔ ہندوستان کے باہر بھی مسلمانوں پر انتہائی پریشانی کا عالم طاری تھا......(ان سے باقاعدہ روابط تو نہ تھے) البتہ ایک ملاقات ضرور ہوئی اور وہ اس طرح کہ ان کی زندگی میں ''یوم اقبال'' منایا گیا تھا، میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ اس جلسے مین شریک ہونے کے لیے نکلا، راستے میں صلاح یہ ٹھہری کہ کیوں نہ علامہ صاحب کے درِ دولت پر حاضری دی جائے۔ چنانچہ ''جاوید منزل'' جا پہنچا۔ حضرت علامہ کچھ احباب سے مصروفِ گفتگو تھے، وہ مختلف موضوعات پر باتیں کر رہے تھے اور مجھے اعتراف ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا۔ حضرت علامہ اسے تشنہ نہ چھوڑتے۔ اسلامی ممالک کے رسم ورواج، ان کی سیاست سے لے کر ان کے مخصوص کھانوں کی مماثلت تک کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں فرماتے......میرا تعارف کرایا گیا تو بڑے تپاک سے ملے اور خاصی توجہ فرمائی۔

✿✿✿

• بصد شکریہ، رسالہ کرن اقبال نمبر، مجلہ لاہور کالج برائے خواتین، ۱۹۷۷ء......انٹرویو: ثریا احمد۔ بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 219۔

# ابا جان•

جاوید اقبال

آج اس سانحہ کو بیتے دس برس ہونے کو آئے ہیں اور آج مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ماضی کے ان دھندلے نقوش کو کریدنے کے لیے کہا گیا ہے جن میں سے اکثر مندمل ہو چکے ہیں۔ میں حیران ہوں کہاں سے شروع کروں۔ اقبال، اس میں کوئی شک نہیں، دنیا کی نظر میں ایک ممتاز شاعر، فلسفی اور پیغامبر کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ایک انسان بھی تھے۔ ایک ایسا انسان جس کا گھر ہو، بیوی ہو اور جسے اپنے بچوں سے الفت ہو، حالانکہ اپنی زندگی میں انہوں نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقعہ دیا جس سے میں ان کی شفقت یا الفت کا اندازہ لگا سکتا۔ والدین اپنے بچوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں۔ انہیں گلے سے لگاتے ہیں۔ انہیں چومتے ہیں، مگر مجھے ان کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقتِ پدری کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے منہ اٹھائے کبھی گھر میں اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز سے عجیب مخدومانہ التفات کی شان سے۔ گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو۔ اور بعض اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چار پائی پر آنکھیں بند کیے، اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط ہے۔ اُن کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کا ضبط تھا، ایک گہری خاموشی تھی جس میں عنفوانِ شباب کے وقتی ہیجان کا فقدان تھا۔ اس محبت کی نوعیت فکری یا تخیلی تھی جس تک میرا ذہن نارسا پہنچ کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں ان کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ بہر حال جہاں

• بصد شکریہ۔ محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 213۔222۔

تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان سے محبت کم کرتا تھا مگر خوف زیادہ کھاتا تھا کیونکہ ہماری عمروں کا فرق باپ بیٹے کا نہ تھا بلکہ دادا پوتے کا تھا۔

مجھے اپنے خاندان کے بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ میری پیدائش سے کئی سال پیشتر ابا جان حضرت مجدد کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ساتھ لے کر دوبارہ ہند شریف پہنچے۔ اس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں۔ میں ان کے ہمراہ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پُروقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر رکھی ہے۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف گھور رہا ہوں جیسے میں اس مقام کی خاموش ویرانی سے کچھ کچھ شناسا ہوں۔ ابا جان نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔ اس وقت صرف ہم دو ہی مقبرے میں موجود تھے۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی آواز کی گونج ایک ہولناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں سے آنسو امنڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ خیر، دو ایک روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے لیکن مجھ پر اس راز کا انکشاف نہ ہوا کہ آخر اس مزار پر جانے کا مقصد کیا تھا اور وہ آنسو کیوں؟ مجھے یاد ہے، میں بچپن میں اکثر یہی سوچا کرتا۔

ہر گھر کی باتیں چھوٹی چھوٹی ہوا کرتی ہیں، مگر ان سے گھر کے افراد کے کرداروں پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات والدین میں اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں تنازع بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح ابا جان اور اماں جان میں میری وجہ سے کئی بار تکرار ہو جاتی، مثلاً: اماں جان کو میرے متعلق ہر گھڑی یہی فکر دامن گیر رہتی کہ جب کبھی میں اکیلا کھانا کھاؤں، پیٹ بھر کر نہیں کھاتا، اس لیے وہ ہمیشہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا کرتیں۔ یہاں تک کہ میں سات آٹھ برس کا ہو گیا لیکن اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے کی عادت نہ پڑی۔ ابا جان اس بات پر متعدد بار ناراض ہوئے کہ تم اسے بگاڑ رہی ہو۔ اگر یہ جوان ہو کر بھی خود کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہوگا۔ ہم لوگ رات کو اکثر خشکہ کھایا کرتے تھے۔ لہٰذا اب یوں ہوتا کہ بطور احتیاط چمچہ میری پلیٹ کے قریب رکھ دیا جاتا، مگر کھانا اماں جان ہی کھلاتیں۔ ابا جان کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دبے پاؤں زنانہ میں آیا کرتے۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ بہر حال جب بھی اماں جان مجھے کھانا کھلا

رہی ہوتیں ان کا دھیان باہر ہی رہتا۔ اور جونہی وہ ابا جان کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ بھی سنتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے علیحدہ کر چمچہ میرے آگے رکھ دیتیں۔ اور میں خود کھانا کھانے میں مشغول ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے ابا جان کئی مرتبہ اس کا سراغ لگا چکے تھے لیکن وہ اپنی مخصوص ہنسی کے بعد چلے جایا کرتے۔

میں بچپن میں بے حد شریر تھا۔ اماں جان سے بلاناغہ مار کھانا تو میرا معمول بن چکا تھا۔ پڑھائی سے بھی مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، مگر ابا جان سے میں نے مار بہت کم کھائی ہے۔ میرے لیے ان کی جھڑک ہی کافی ہوا کرتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے پر مجھے کئی بار کوسا گیا۔ ابا جان جب کبھی بہت ناراض ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے: ''احمق آدمی، بیوقوف''۔ یہاں مجھے ابا جان سے مار کھانے کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ بچپن میں مجھے روز ایک آنہ خرچ کرنے کو ملا کرتا اور اسے خرچ کر چکنے کے بعد خواہ میں اماں جان کی کتنی ہی منتیں کرتا مجھے مزید کچھ نہ ملتا بلکہ ہر لحہ ان کے ناراض ہونے کا احتمال رہتا۔ ایک دفعہ اتفاق یوں ہوا کہ کوئی مٹھائی بیچنے والا ہمارے گھر کے سامنے آیا۔ مٹھائی دیکھ کر ہم للچا گئے، لیکن جیب خالی تھی۔ اسے بٹھا تو لیا اور اماں جان کے پاس دوڑے آئے کہ شاید کچھ مل جائے مگر انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ طبیعت ضدی تھی۔ خیال آیا کہ اس خوانچہ فروش سے پوچھیں کہ پیتل لے کر مٹھائی دے سکتا ہے یا نہیں۔ بدقسمتی سے اس نے ہاں کہہ دی۔ بس پھر کیا تھا، سائے کی طرح ابا جان کے کمرے میں گھسے۔ ایک طرف پڑے ٹیبل فین کے پیچھے لگے پیتل کے پرزے کو اتار کر خوانچہ فروش کو دے آئے اور مٹھائی لے لی۔ لیکن شامتِ اعمال سے ہمارا شوفر اُدھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے آ کر ابا جان سے شکایت کر دی۔ ہم خوشی خوشی اچھلتے کودتے جو گھر کی حدود میں داخل ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ ابا جان بلا رہے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں گئے۔ وہ اپنی آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور تین چار تھپڑ ہماری گردن پر جما دیے۔ ابا جان مجھے جب کبھی مارتے گدی پر مارتے۔ وہ زور سے تو نہ مارتے مگر گدی جسم کا ایک ایسا حصہ ہے جہاں چوٹ زیادہ لگا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر مجھے ان سے کبھی مار کھانے کا اتفاق ہوا تو اس کی وجہ جھوٹ بولنا تھی۔

عام طور پر گھر میں اپنی ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میرا سابقہ ابا جان کی بجائے

اماں جان سے زیادہ پڑتا تھا۔ لیکن حیرت کی بات ہے، باوجود اس کے کہ میں ان کے ہاں بارہ سال کے طویل انتظار کے بعد پیدا ہوا تب بھی مجھے اکلوتا نہ سمجھتیں اور نہ ہی مجھ سے لاڈ پیار ہوتا۔ البتہ جب مجھے کبھی پیٹ رہی ہوتیں تو انہیں یہ خوف ضرور رہتا کہ کہیں چلّانے کی آواز سن کر ابا جان نہ آ جائیں اور خفا ہوں کہ تم کس قدر بے دریغ ہو کر بچے کو پیٹتی ہو۔ اسی طرح کبھی ابا جان کے کمرے میں ہماری پیشی ہوتی تو اماں جان اپنا سب کام چھوڑ کر خاموش بیٹھ کر رونے لگتیں کہ ابا جان کو غصہ بہت کم آتا ہے مبادا بچے کو زور سے مار بیٹھیں۔ مگر جب میں صحیح سلامت اندر داخل ہوتا تو وہ آنسو پونچھ چکی ہوتیں۔ تیوری چڑھا کر مجھے گھورتیں اور اپنے کام میں لگ جاتیں۔ کئی بار تو مجھے خیال آیا کرتا کہ میں اپنے ماں باپ کا حقیقی بیٹا نہیں بلکہ لے پالک بیٹا ہوں۔ اکثر اوقات یہی خیال اس قدر شدت اختیار کر جاتا کہ میں اپنے آپ کو بری طرح سے تنہا محسوس کیا کرتا اور چھپ چھپ کر رویا کرتا۔ ان دنوں ابھی میری چھوٹی ہمشیرہ منیرہ پیدا نہ ہوئی تھی پھر بھی میں یہاں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں، میری لمحہ بھر کی عدم موجودگی ان دونوں کے لیے بہت بڑے عذاب سے کم نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ جب میں پہلی مرتبہ سکول گیا تو اماں جان، ابا جان کے پاس بیٹھیں دیر تک روتی رہیں اور ابا جان انہیں تسلیاں دیتے رہے۔ لیکن یہ باتیں سننے میں آئی ہیں، دیکھنے میں نہیں آئیں۔

ابا جان کو میں نے لوگوں کے ہجوم میں بہت کم دیکھا ہے۔ میں ان کے ساتھ کسی جلسے میں شریک نہیں ہوا، نہ ہی میں نے انہیں اپنا کلام خود لوگوں کے سامنے پڑھتے سنا ہے۔ لیکن میری ہوش میں جب دو ایک بار ولایت گئے تو میں انہیں اسٹیشن پر چھوڑنے ضرور گیا۔ جب وہ ولایت میں تھے تو میرے تایازاد بھائی مختار نے، جو ان دنوں ہمارے پاس رہا کرتے تھے، مجھ سے ان کے نام ایک خط بھی لکھوایا۔ مجھے یاد نہیں اس خط میں مَیں نے کیا لکھا، یا اس کا جواب کیا آیا، مگر اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ جواب میں جو پوسٹ کارڈ مجھے ملا اس پر کسی مینار کی تصویر بنی ہوئی تھی جس کی سب سے بلند منزل پر کوئی کھڑا اذان دے رہا ہے۔

جب وہ ولایت سے واپس آئے تو میں انہیں اسٹیشن پر لینے بھی گیا۔ وہاں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ جب گاڑی پہنچی تو میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف بڑھیں گے اور گود میں اٹھا لیں گے۔ لیکن جب وہ اپنے ڈبہ سے اترے تو ہجوم ان پر پل پڑا۔ لوگوں نے ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے شروع کر دیے، یہاں

تک کہ وہ لد گئے اور ان کے چہرے کا کافی سے زیادہ حصہ پھولوں میں چھپ گیا۔ ان سے ہاتھ ملانے والوں کی تعداد بے انتہا تھی۔ مجھ سے بھی ابا جان نے فقط ہاتھ ہی ملایا۔ ممکن ہے انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ یہ ہاتھ کس کا ہے کیونکہ بہت سے کانپتے ہوئے بے تاب ہاتھ جو ان کی طرف بڑھے ہوئے تھے ان میں سے ایک میرا ننھا سا ہاتھ بھی تھا۔ اس روز مجھے رنج ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں میں کوئی خلیج حائل ہے جسے کم از کم میں عبور کرنے سے قاصر ہوں۔ خیر ہم اسٹیشن سے گھر پہنچے۔ اماں جان نے ان کے استقبال کے سلسلہ میں اہتمام کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پہنچتے ہی وہ زنانہ میں آئیں گے۔ مگر ابا جان کو سارا دن لوگوں نے گھیر رکھا اور اماں جان دیر تک انتظار کرتی رہیں۔ شام کو تنگ آ کر انہوں نے ابا جان سے کہلوا بھیجا کہ چائے اندر بچوں کے ساتھ پیجئے۔ وہ اندر آئے تو اماں جان نے شکایتاً کہا: ''اتنے سالوں کے بعد آپ گھر آئے ہیں اور آپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ پیار سے اس بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا ہوتا'' ابا جان کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ مجھے گود میں اٹھا لیا۔ چائے ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر پی۔ مگر پھر اطلاع آئی کہ چند ملاقاتی آئے ہیں اور وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گئے۔

ہم گھر میں شور نہ مچا سکتے تھے۔ اگر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ باہر لان میں کبھی کرکٹ کھیل رہا تو ہمیں حکم ملتا کہ یہاں مت کھیلو۔ اور ہم منہ لٹکائے وہاں سے چل دیتے، لیکن بعض اوقات وہ ہمارے کھیل میں خود بھی شریک ہو جایا کرتے۔ ہمارے ہاتھ ان کی طرف گیند پھینکتے پھینکتے تھک جاتے مگر وہ بلا تھامے ''ٹھپ ٹھپ'' کرتے رہتے۔ ایک دفعہ وہ اندر بیٹھے تھے، ہم نے ہٹ جو لگائی تو گیند دروازے کے شیشے کو توڑتی ان کے کمرے میں جا گری۔ اس دن سے ہمیں کرکٹ کھیلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ کئی بار کھلی بہار میں جب میں کوٹھے پر پتنگ اڑا رہا ہوتا ہی تو دبے پاؤں اوپر آ جاتے اور میرے ہاتھ سے پتنگ لے کر خود اڑانے لگتے۔ مگر مجھے یاد ہے انہوں نے جب کبھی بھی کسی اور پتنگ سے پیچ لڑایا تو ہمیشہ ہماری پتنگ ہی کٹی۔

اماں جان کی بڑی آرزو تھی کہ وہ تمام دن گھر پر پڑے رہنے کی بجائے کہیں ملازمت کر لیں۔ یہ سن کر ابا جان عموماً مسکرا دیا کرتے۔ اور حقیقت ہے بچپن میں میں نے اس معما کو بارہا سلجھانے کی کوشش کی کہ میرے ابا جان کیا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مجھ سے یہ سوال پوچھ بیٹھتا تو میں خاموش ہو جایا کرتا کیونکہ میں خود نہ جانتا تھا۔ اسی طرح اماں جان اس بات پر بھی مصر

رہتیں کہ کرایہ کا گھر چھوڑ اپنا گھر بنوایئے۔ ان ایام میں ہم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ آخر تین چار سال کے بعد جب وہ اماں جان کی خواہش کے مطابق اپنا گھر بنوانے میں کامیاب ہو گئے اور ہم سب میو روڈ پر اٹھ آئے تو نئے گھر میں قدم رکھتے ہی یعنی تیسرے روز اماں جان رحلت فرما گئیں۔ ان کی وفات کے وقت میری عمر گیارہ برس کی تھی اور منیرہ کی پانچ برس۔

اماں جان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بچے ابا جان کے زیادہ قریب آ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جس وقت اماں جان فوت ہوئیں تو ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے روتے روتے ابا جان کے کمرے کی طرف گئے۔ وہ حسبِ معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے کیونکہ ان دنوں خود بھی بیمار رہتے تھے۔ گلا بیٹھ چکا تھا۔ صاف نہ بول سکتے تھے۔ میں اور منیرہ ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہا۔ اور جب ہم ان کے قریب پہنچ گئے تو اپنے ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے خفگی سے مجھے کہنے لگے: ''تمہیں یوں نہ رونا چاہیے۔ یاد رکھو، تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔'' اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

اماں جان کی بے وقت موت نے انہیں پژمردہ سا کر دیا لیکن اب وہ ہم دونوں بچوں کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ہمیں حکم تھا کہ ان سے مل کر اسکول جایا کریں۔ جانے سے پہلے اور آنے کے بعد وہ ہم دونوں کی پیشانیوں پر بوسہ دیا کرتے۔ مگر مجھے اس بوسہ میں شفقت کی بجائے ہمیشہ معمول کی جھلک دکھائی دیتی۔ گویا وہ ہمیں اس لیے چومتے ہیں کہ کہیں ہم دونوں یہ تصور نہ کر لیں کہ ہمیں ابا جان کی محبت میسر نہیں ہے۔ بہر حال منیرہ کو ان کا قرب حاصل تھا۔ وہ رات کو عموماً انہی کے ساتھ سویا کرتی۔ اس کی ہر خواہش بغیر کسی حیل وحجت کے پوری کر دی جاتی۔ اور اگر میں کبھی اسے جھڑ کتا یا مار بیٹھتا تو میری شامت آ جاتی۔ انہیں ہم دونوں بہن بھائیوں کے جھگڑوں پر بہت رنج ہوتا تھا۔ وہ اپنے احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے کہ یہ دونوں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ لیکن احباب کے یہ کہنے کے باوجود بھی، کہ جس گھر میں بچے ہوں وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے، ان کی تسلی نہ ہوتی۔ کہتے: ''تمہارا دل پتھر کا ہے۔ تم بڑے

سنگدل ہو۔ اتنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

اماں جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ مجھے اس خیال سے اپنے ہمراہ بھوپال لے گئے کہ ان کی عدم موجودگی میں مَیں منیرہ سے لڑتا نہ رہوں۔ بھوپال میں میرا زیادہ وقت ابا جان کی نگاہوں کے سامنے ہی گزرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے کہ چمچہ اس طرح پکڑنا چاہئے اور کانٹا یوں۔ میں فطرتاً کچھ شرمیلا واقع ہوا تھا، اس لیے جب کبھی انہیں لوگ وہاں ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ہاں جاتے تو مجھے ہمیشہ کہا کرتے کہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھ رہنے کی بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیے۔ بھوپال سے واپسی پر ہم ایک دن کے لیے دہلی ٹھہرے۔ لال قلعہ، نظام الدین اولیا اور نئی دہلی سے ہوتے ہوئے بغرض سیر قطب مینار پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اوپر چڑھ جاؤں اور میں نے انہیں بھی ساتھ آنے کو کہا مگر وہ بولے: "تم جاؤ۔ میں اتنی بلندی پر نہیں جا سکتا۔ اور جب اوپر پہنچ جاؤ تو نیچے کی طرف مت دیکھنا۔ کہیں دہشت سے گر نہ پڑو۔" ان کے وہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

گرمیوں میں وہ باہر سوتے۔ میری چارپائی ان کے قریب ہی ہوا کرتی۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو جایا کرتی۔ چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا۔ بستر پر کروٹیں بدلتے۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ اکثر اوقات وہ رات کے دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو اس پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے۔ بعض اوقات تو وہ علی بخش کو اس غرض کے لیے بھی بلواتے کہ میری پائینتی پر پڑی ہوئی چادر کو میرے اوپر ڈال جاؤ۔ ابا جان کی عادت سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں اکثر ہلتا رہتا، جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں بلکہ سوچ رہے ہیں لیکن جب گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے۔ اور نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار میں ان کے خراٹوں سے ڈر جایا کرتا۔

ابا جان کو میں نے بیسیوں مرتبہ خود بخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے۔ جب کبھی تنہا بیٹھے اپنا کوئی شعر گنگنا رہے ہوتے تو ان کا بے جان سا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور ہوا میں

گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش ہو جاتی۔ صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے۔ گرمیوں میں باہر رکھے ہوئے تخت پر ہی نیت باندھ دیتے۔ دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی۔ دیواریں گرد و غبار سے اَٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے اور اگر کبھی مجبوراً باہر جانا پڑتا تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً سست تھے، اس لیے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جایا کرتی۔ ویسے چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بڑے خوش تھے۔ کئی بار دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کی وجہ سے بھول جایا کرتے اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے: ''کیوں بھئی، میں نے کھانا کھا لیا ہے؟'' شام کو گھر کے دالان ہی میں دو ایک چکر لگا لیا کرتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں کامل جمود تھا۔

اماں جان کی وفات کے بعد ابا جان نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن جب میں نے ازسرِ نو خضاب شروع کرنے کو کہا تو مسکرا کر بولے: ''میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں'' میں نے پھر کہا: ''ابا جان، ہم تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں'' شاید اس خیال سے کہ بچے میرے سفید بالوں کو دیکھ کر مجھے ضعیف سمجھنے لگے ہیں، انہوں نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا، لیکن چند ہی مہینوں بعد پھر چھوڑ دیا اور میری ہمت نہ پڑی کہ انہیں دوبارہ شروع کرنے کو کہوں۔

ابا جان کی بڑی تمنا تھی کہ میں تقریر کرنا سیکھوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں کشتی لڑا کروں۔ اسی سلسلہ میں میرے لیے گھر میں ایک اکھاڑا بھی کھدوا دیا گیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ اکھاڑے کی مٹی پر ڈنڈ پیلنا یا لنگوٹی باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ پھر بڑی عید کے روز مجھے ہمیشہ تلقین کیا کرتے کہ بکرے کے ذبح ہوتے وقت میں وہاں پر موجود رہوں۔ لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی قسم کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے۔ ایک دفعہ دالان میں کھیلتے مجھے جو ٹھوکر لگی تو منہ کے بل گرا۔ میرا نچلا ہونٹ اندر سے کٹ گیا۔ ابا جان اتفاق سے ادھر آ نکلے اور میرے منہ سے خون بہا دیکھ کر بجائے اس کے کہ میرے قریب پہنچیں یا مجھ سے پوچھیں ''کیا ہوا ہے؟'' وہ چند لمحوں کے لیے ساکت و مبہوت کھڑے رہے۔ پھر ان کے قدم ڈگمگائے اور بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑے۔ جب ہوش آنے پر انہیں بتایا گیا کہ معمولی چوٹ تھی اور اب میں ٹھیک ہوں تو

بڑے متعجب ہوئے۔ کہنے لگے: ''اس کے منہ سے تو خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔''

ویسے ابا جان میں قوتِ برداشت کی انتہا تھی۔ جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ انہیں کبوتر بازی کا شوق بھی رہ چکا تھا۔ آخری عمر میں ان کی خواہش تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرہ بنوایا جائے جس میں لاتعداد کبوتر چھوڑ دیے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہے۔ انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

ابا جان کے عقیدت مندوں میں سے ایک حجازی عرب بھی تھا جو کبھی کبھار انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتا۔ اس عرب کی آواز بڑی پیاری تھی۔ جب بھی اس سے قرآن مجید سنتے تو مجھے بلا بھیجا کرتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار اس نے سورۃ مزمل پڑھی۔ اور آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکا تو آپ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے: ''تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے'' اسی طرح مجھے ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کو بھی کہا، اور خاص طور پر وہ نظم، جب کسی قریب بیٹھے ہوئے نے کہہ دیا ؎

''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا''

تو آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول ﷺ اللہ کا نام کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

ابا جان کو انگریزی لباس سے نفرت تھی۔ مجھے ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کیا کرتے۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو کبھی دو حصوں میں گوندھتی تو برا مانتے۔ کہتے: ''اپنے بال اس طرح نہ گوندھا کرو۔ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے'' اور اگر میں کبھی غلطی سے اپنی قمیضوں یا شلواروں کا کپڑا بڑھیا قسم کا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے۔ کہتے: ''تم اپنے آپ کو کسی رئیس باپ کا بیٹا سمجھتے ہو۔ تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے۔ اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو میں تمہیں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔'' میرے لیے بارہ آنے سے زائد قمیص کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زائد کے بوٹ خریدنا جرم تھا، جس کی سزا کافی کڑی تھی۔ ویسے انہیں اگر کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ آج میں پلنگ پر سونے کی بجائے فرش پر سویا ہوں تو بڑے خوش ہوا کرتے۔

اپنی زندگی میں صرف ایک بار انہوں نے مجھے بائیسکوپ دیکھنے کی اجازت دی۔ وہ ایک انگریزی فلم تھی جس میں نپولین کا عشق دکھایا گیا تھا۔ مگر مجھے یاد ہے ابا جان کو یہ نہ بتایا گیا بلکہ کہا گیا کہ اس فلم میں نپولین کے حالاتِ زندگی ہیں۔ ابا جان دنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ مجھے اکثر خالد رضی اللہ عنہ بن ولید اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا کہ نپولین کے اجداد عرب سے آئے تھے۔ واسکوڈی گاما کو عربوں ہی نے ہندوستان کا رستہ دکھایا۔ یا مسولینی کا قد چھوٹا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دیو معلوم ہوتا ہے۔ اور میں اس سے مل کر بے حد متاثر ہوا تھا۔

آخری ایام میں ابا جان کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی اس لیے مجھے حکم تھا کہ انہیں روز صبح اخبار پڑھ کر سنایا کروں۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا کر جاتا تو بہت خفا ہوتے۔ اسی طرح میں رات کو انہی کی کوئی غزل گا کر بھی سنایا کرتا۔ ان دنوں مجھے ان کی صرف ایک غزل یاد تھی ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

ابا جان کے سامنے وہ غزل پڑھنا میرے لیے ایک مصیبت ہوا کرتی۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھ جاتا تو بھی ناراض ہوتے اور کہتے: ''شعر پڑھ رہے ہو یا نثر؟'' میں ان سے بہت ڈرتا تھا، البتہ منیرہ ان کی چہیتی تھی۔ وہ اور اس کی جرمن گورنس ہر شام ابا جان کے پاس بیٹھا کرتیں۔ ابا جان جرمن زبان بخوبی جانتے تھے، اس لیے گورنس سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے۔ اور منیرہ کو بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ ان دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی تھی، اس لیے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرتی اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔

ابا جان کو لوگ گھر ملنے آتے تھے۔ ہر شام احباب کی محفل جما کرتی۔ ان کی چارپائی کے گرد بہت سی کرسیاں رکھی ہوتیں اور لوگ ان پر بیٹھ جایا کرتے۔ آپ چارپائی پر لیٹے ان سے باتیں کرتے رہتے اور ساتھ ساتھ حقہ بھی پیتے جاتے۔ رات کا کھانا نہ کھاتے تھے، صرف کشمیری چائے پینے پر اکتفا کرتے۔ رات گئے تک علی بخش ان کے پاؤں دباتا اور اگر کبھی میں دبانے بیٹھتا تو منع کر دیتے اور کہتے کہ تم ابھی چھوٹے ہو، تھک جاؤ گے۔ مجھے خاص طور پر حکم تھا کہ جب بھی ان کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو تو میں وہاں ضرور موجود رہوں۔ لیکن مجھے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی کیونکہ وہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ میں عموماً موقعہ

پا کر وہاں سے کھسک جایا کرتا، جس پر انہیں بہت رنج ہوتا اور اپنے احباب سے کہتے: "یہ لڑکا میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے" اب وہ تنہائی بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ اکثر اوقات افسردگی سے کہا کرتے: "سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں۔ میرے پاس آ کر کوئی نہیں بیٹھتا۔"

آخری رات ان کی چارپائی گول کمرے میں بچھی تھی۔ عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ میں کوئی نو بجے کے قریب اس کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا: "کون ہے؟" میں نے جواب دیا "میں جاوید ہوں" ہنس پڑے۔ بولے "جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں" پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین صاحب سے مخاطب ہوئے: "چودھری صاحب، اسے جاوید نامہ کے اخیر میں وہ دعا "خطاب بہ جاوید" ضرور پڑھوا دیجئے گا" اس رات ہمارے ہاں بہت سے ڈاکٹر آئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ آج کی رات مشکل سے کٹے گی۔ کوٹھی کے صحن میں کئی جگہوں پر دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں لوگ کھڑے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ابا جان سے ڈاکٹروں کا یہ جواب مخفی رکھا گیا۔ مگر وہ بڑے تیز فہم تھے۔ انہیں اپنے احباب کا یہ بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر یقین ہو چکا تھا کہ بساط عنقریب الٹنے والی ہے۔ لیکن اس رات وہ ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔

مجھے بھی حالات سے آگاہ نہ کیا گیا۔ اس لیے میں معمول کے مطابق اپنے کمرے میں آ کر سو رہا۔ مگر صبح، طلوعِ آفتاب سے پیشتر، مجھے علی بخش نے آ کر جھنجھوڑا اور چیختے ہوئے کہا "جاؤ دیکھو تمہارے ابا جان کو کیا ہو گیا ہے" نیند یکدم میری آنکھوں سے کافور ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ صبح موسمِ بہار کی صبح تھی لیکن اس شادابی میں مجھے ایک گہرا خلا نظر آ رہا تھا۔ ایک بے بسی، ایک اداسی سی دکھائی دیتی تھی۔ گھر کے مختلف حصوں سے کراہنے اور سسکیاں بھرنے کی بھینچی ہوئی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ میں اپنے بستر سے اس خیال سے نکلا کہ جا کر دیکھوں تو سہی انہیں کیا ہو گیا ہے۔ جب میں اپنے کمرے سے گزرتا ملحقہ کمرے میں پہنچا تو منیرہ تخت پر اکیلی بیٹھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے رو رہی تھی۔ کسی معمولی بات پر جھگڑے کی وجہ سے ہماری آپس میں بول چال کئی دنوں سے بند تھی۔ مجھے ابا جان کے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ جھجکی، پھر ایکا ایکی میری طرف لپکی اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے

مگر اس کے باوجود میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دونوں ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر رک سے گئے۔ میں نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔ ان کے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ چارپائی پر سیدھے لیٹے تھے۔ انہیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی۔ ابا جان کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ قبلہ کی طرف تھا۔ مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر میرے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔ منیرہ کی ٹانگیں دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے میرے بازو کو زور سے پکڑ رکھا تھا اور مجھے اس کی ہچکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن میں کوشش کے باوجود بھی نہ رو سکتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں رو دیا تو وہ ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اپنی انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہیں گے۔ اور جب ہم ان کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ اپنے ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھالیں گے۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے خفگی سے مجھ سے کہیں گے: "تمہیں یوں نہ رونا چاہیے۔ یاد رکھو، تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔"

# یادِ اقبال•

جلیل قدوائی

یہ نہیں کہ حضرت علامہ مرحوم و مغفور کے ساتھ میرے اس قسم کے روابط تھے جنہیں ''تعلقات'' کا نام دیا جا سکتا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ موصوف سے بالکل ہی غیر متعارف یا بے تعلق تھا۔ ہاں شاید اس نسبت کو کسی خاص عنوان کے تحت نہیں لایا جا سکتا، یوں بھی جب خود ''اقبال (۱) بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے'' تو میں کس شمار و قطار میں ہوں۔

میں نے کہیں لکھا ہے کہ علامہ اقبال کو پہلے پہل میں نے سکول کی طالب علمی کے زمانہ میں اپنے محترم بزرگ عمومی خان بہادر قاضی نذیر احمد قدوائی مرحوم وکیل و اسپیشل مجسٹریٹ اناؤ کے کتب خانہ میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن کی پرانی جلدوں میں تلاش کیا۔ اس وقت میرا ادبی ذوق و شعور نکھر چلا تھا مگر اب یاد آتا ہے کہ علامہ کے کلام سے اس احساس کے بغیر کہ نظم کو شاعر سے بھی کوئی تعلق ہوتا ہے اس سے بھی بہت پہلے کمسنی ہی میں متعارف ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ میرے ایک دوسرے بزرگ اور مندرجۂ بالا خان بہادر صاحب کے برادر خورد جناب قاضی حمید احمد قدوائی مرحوم سب رجسٹرار نے جن کا سینہ تمام عمر دردِ اسلامی سے خاص طور پر معمور رہا، اقبال رحمہ اللہ کا قومی ترانہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہم نے بچوں کو ایک خاص انداز پر زبانی یاد کرایا تھا جسے وہ ہمارے گھر آنے والے خصوصی مہمانوں کو بڑے اہتمام سے سنوایا کرتے تھے۔

پھر میں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کے مشہور نصاب ''کمک اُردو'' میں علامہ کی

• بصد شکریہ۔ قومی زبان کراچی، اپریل 1966، بحوالہ صابر کلوروی، مرتبہ، اقبال کے ہم نشین۔ ص 85-93

''پرندے کی فریاد''

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

پڑھی جس میں اس نظم کے موجودہ متن کے مقابلے میں کہیں زیادہ شعر تھے، شاید اسی کتاب میں یا کہیں اور نظم ''نیا شوالہ''

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے

نظر سے گزری اور پھر ''ترانہ ہندی''

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

بھی پڑھا۔

غرضیکہ اسی طرح چھوٹی چھوٹی کئی اور نظمیں بھی پڑھیں جو بے حد پسند آئیں۔ بڑھتی ہوئی عمر، اردگرد کے حالات اور زندگی کے سربند ماحول کو سمجھنے کی نئی نئی ترنگ، شعروشاعری کے نشہ کی ابتدا، ان کے کلام سے دلچسپی ایسی بڑھی کہ وہ میرے خوابوں کی دنیا بننے لگا۔ ان منازل سے گزرنے کے بعد کہیں یہ ہوا کہ مخزن میں ان کا کلام نظر سے گزرا۔

یہ ابتدائی تجربات اور تاثرات لے کر ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ پہنچا اور اگرچہ ان کی بہت سی پسندیدہ نظمیں پہلے ہی زبانی یاد ہو چکی تھیں مگر ۱۹۲۴ء میں بانگ درا کے اشاعت پذیر ہونے تک مختلف رسائل مثلاً زمانہ، الناظر، صوفی، مخزن (جس کے اُس زمانہ میں دل شاہجہان پوری ایڈیٹر تھے) ہزار داستان وغیرہ نیز اپنے ہم مذاق دوستوں خواجہ منظور حسین و صاحبزادہ عبدالجلیل خاں کی ذاتی بیاضوں سے بڑے شوق سے تلاش کر کر کے ان کی زیادہ سے زیادہ نظمیں اپنی بیاضوں میں نقل کرتا رہا۔ (۲)

۱۹۲۵ء میں علامہ سے بالواسطہ مخاطبت کا موقع مہیا ہو گیا۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی شاندار اور تاریخی جوبلی منعقد ہوئی تھی۔ میں یونیورسٹی کے طلباء کے رسالہ علی گڑھ میگزین کا نائب مدیر تھا، اس موقع پر رسالہ کے خاص نمبر کے لیے علامہ کے کلام اور تصویر کی ضرورت تھی

جس کے لیے میں انہیں رسمی مراسلہ بھیج چکا تھا۔ علی گڑھ کی روایات کے نامور علمبردار اور اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب سید سجاد حیدر یلدرم ان دنوں یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ میرے حال پر ان کی خصوصی عنایات تھیں۔ یلدرم اور علامہ کے درمیان بے تکلف دوستی تھی جس پر وہ برملا فخر کیا کرتے تھے۔ میری عرض پر موصوف نے علامہ کو ایک تعارفی اور سفارشی خط لکھا اور بھیجنے سے پہلے مجھے پڑھ کر سنایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا اور "مائی ڈیئر سر محمد" (۳) کے الفاظ سے شروع کیا گیا تھا، یہ القاب جس وقار اور افتخار کے ساتھ ایک مخصوص لہجے میں سجاد صاحب نے پڑھ کر سنایا تھا اس کا لطف آج تک دل سے محو نہیں ہوا۔ (۴)

علامہ اقبال نے فوراً جواب لکھا، اردو میں مگر "مائی ڈیئر سجاد" کے القاب (۵) سے، جس میں موصوف کلام اور تصویر طلب کرنے پر میرا نام لے کر شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اپنی ایک چھوٹی سی تصویر بھی عطا کی تھی، وہی جس میں کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے اور سوٹ پہنے، بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ عینک لگائے مصروفِ مطالعہ ہیں۔ فارسی کی مشہور غزل بھی جس کا مطلع ؎

نہ یابی درجہاں یارے کہ داند دل نوازی را
بخود گم شو، نگہدار آبروئے عشق بازی را

خط کے ہمراہ اپنے دست مبارک سے لکھ کر روانہ فرمائی۔ یہ پوری غزل بھی سجاد مرحوم نے مجھے عنایت کرنے سے پہلے بلند آواز میں اور اپنے منفرد تیوروں کے ساتھ پڑھ کر سنائی تھی اور ان اشعار پر تو جھوم جھوم گئے تھے ؎

من ایں علم و فراست باپر کا ہے نمی گرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را
بہ ہر نرخے کا ایں کالا بگیری سُود مند اُفتد
بہ زور بازوئے حیدر بہ وہ ادراکِ رازی را

اس خط اور اس تصویر نیز اس غزل کا عکس پورے صفحہ پر نہایت آب و تاب کے ساتھ ہم نے میگزین کے جوبلی نمبر میں شائع کیا تھا، افسوس کہ اس رسالہ کی کوئی نقل اب میرے پاس موجود نہیں مگر اُس زمانے میں علی گڑھ کے بہتیرے پڑھے لکھے آج پاکستان میں موجود ہیں، کسی نہ کسی کے پاس ضرور ہوگی۔ اقبال اکادمی کو تلاش کر کے اسے محفوظ کر لینا چاہیے۔ تصویر مجھ سے

بعد میں حکیم یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال لاہور نے منگا کر اپنے رسالے میں بھی شائع کی تھی اور اب بڑے سائز پر عام دستیاب ہے اور آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے مطالعے والی تصویر کہلاتی ہے۔ شاید میگزین کے پورے ہی صفحہ کا بلاک چھاپا تھا۔

کئی برس گزر گئے۔ اب میں گریجویٹ ہو کر یونیورسٹی کے دفتر رجسٹرار میں ملازم ہو چکا تھا کہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ علی گڑھ تشریف لائے اور اپنے مشہور خطاب ارشاد فرمائے۔ (۶) ایک بار مجھے بھی حاضری نصیب ہوئی۔ تقریر اعلیٰ درجے کی انگریزی میں تھی۔ یونین کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں رات کے وقت بجلی کی روشنی میں ایک ہمہ گیر سناٹا چھایا ہوا تھا جس میں انگریزی لباس میں مزین ڈائس پر کھڑے ہوئے ایک بلند و بالا انسان کی نقرئی کہوں یا طلائی تنہا آواز ایک کھنکھناہٹ کے طور پر فضا میں گونج رہی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر، رک رک کر رس گھول رہی تھی۔ یہ شاعری یا مبالغہ نہیں ہے۔ آپ یقین مانیں جو سمجھ سکتے تھے، سمجھ کر اور جو نہیں سمجھ سکتے تھے، احتراماً صرف آواز سے، اس کے پارٹ سے، اُس کے زیر و بم سے اُس کے لہجہ سے اُس کی گونج سے مست ہو رہے تھے۔ اگرچہ علامہ موصوف عالمِ جذب و مستی میں علم و عرفان کے دریا بہا رہے تھے مگر مجھے اعتراف ہے کہ میرے ساتھ زیادہ تر موخرالذکر صورت ہی پیش آئی تھی۔ ناگہاں ایک طرف سے کسی نے خارج از آہنگ نعرہ بلند کیا یعنی اسلامی ادب و ثقافت کے تذکرہ پر علامہ سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کردی۔

اتنا سننا تھا کہ علامہ نے تقریر بند کردی، چہرہ کا رنگ سرخ ہو گیا اور چند لمحہ سکوت کے بعد نہایت تند و تلخ لہجے میں نہ صرف اس فرمائش پر سرزنش کی بلکہ بتایا کہ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں۔ نیز معاصر شعر و ادب سے اپنی مایوسی اور بیزاری کا اظہار بھی فرمایا۔ سچ یہ ہے کہ اُن کی اس ادا میں بھی ان کے مشتاقوں کے لیے دلنوازی کا پہلو تھا۔ موصوف نے صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ہماری شاعری کوئی امید افزا پہلو نہیں رکھتی اور ہمارے لیے اس سے بالکل کنارہ کش ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ علامہ اپنی شاعری کی طرف اشارہ نہیں کر رہے تھے۔

علی گڑھ کے اس دورانِ قیام میں ڈاکٹر ظفر الحسن مرحوم پروفیسر فلسفہ کے ذریعہ جن کے ہاں موصوف اقامت پذیر تھے اور پھر کچھ دن بعد علامہ کی علی گڑھ میں دوبارہ تشریف آوری کے موقع پر میرے محبوب اور عزیز دوست خواجہ غلام السیّدین صاحب پرنسپل یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے دولت کدہ پر مجھے موصوف کے ساتھ ملاقاتوں اور ہم نشینی کا شرف حاصل ہوا۔ کم سخنی اور متفکرانہ انداز طبیعت کے

ساتھ ساتھ زندہ دلی اور شگفتہ طبعی بھی ان کے مزاج کی خصوصیت معلوم ہوئیں۔ علماء و مفکرین کے ان مجمعوں میں میری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی سی تھی۔ چنانچہ نیازمندانہ بیٹھا رہا۔ موخر الذکر ملاقات موسمِ سرما میں سیدین صاحب کی ذاتی کوٹھی کے باہری چھوٹے چبوترے پر ہوئی تھی جہاں ہم لوگ دھوپ کھانے بیٹھے تھے۔ ان دنوں موصوف کا گلا بیٹھا ہوا تھا اور زیادہ تر گفتگو موسم اور بیماری کے بارے میں رہی۔ موصوف کی طبعی کم سخنی نے اس علالت کے سبب کم و بیش جبری خاموشی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے بڑی مشکل سے بولتے تھے یا اشاروں سے کام لیتے تھے۔ (۷)

ان سرسری ملاقاتوں سے فائدہ اٹھا کر ایک بار میں نے علامہ کو لاہور خط لکھا جس کے ساتھ اپنی تعلیم، تصانیف، نثر و نظم نیز ادبی و تنقیدی کاموں کی تفصیل انگریزی میں ٹائپ کرا کے خدمت میں روانہ کیں۔ میں ان دنوں دفتر کی ملازمت ترک کر کے تدریسی کام سنبھالنا چاہتا تھا۔ اردو اور فارسی میں پی ایچ ڈی (P.hd) بلکہ کہیں کہیں ایم اے کی ڈگریاں بھی اُس وقت تک ہندوستانی یونیورسٹیوں نے عام نہیں کی تھیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبوں میں بھی فارسی تعلیم یافتہ اصحاب لیکچرار مقرر ہو جاتے تھے۔ میں صرف بی اے (B.A) تھا اور اپنی سادگی سے سمجھتا تھا کہ اس چھوٹی ڈگری کے ساتھ میرا علمی و ادبی کام شامل ہو کر اردو میں ایم اے (M.A) کی ڈگری کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ سجاد حیدر مرحوم نے اسی پہلو کو مدنظر رکھ کر مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا اور میرٹھ اور بریلی کے کالجوں میں اسی بنیاد پر میرے تقرر کی سفارشیں بھی کی تھیں مگر ان کی کوششوں میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ اب میں علامہ اقبال سے ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہتا تھا جس میں اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی ہو۔ موصوف نے ازراہِ نوازشِ خاص انگریزی زبان میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھیج دیا۔ افسوس کہ میری نالائقی اور زندگی میں انتشار کے سبب وہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت علامہ نے میری تحسین میں روایتی ندازمیں قلم توڑ دیا تھا۔ ہرگز نہیں۔ چونکہ مقنن تھے، مبصر تھے، لکھنے میں پوری احتیاط ملحوظ رکھی تھی۔ چنانچہ سرٹیفکیٹ کا مضمون کچھ یوں تھا کہ ”آپ نے اپنے ادبی اور علمی کاموں کی جو تفصیلات مجھے بھیجی ہیں، انہیں ملاحظہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں وراگر آپ نے اپنا یہ مشغلہ جاری رکھا جس کا میں آپ کو مشورہ دوں گا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ایسے نہ ہو جائیں اور ویسے نہ ہو جائیں۔“ وغیرہ۔

ایسا کچھ ہوا کہ کچھ دن بعد سجاد حیدر اور راس مسعود مرحومین کی امداد اور توجہات خاص سے مجھے الٰہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے (M.A) (درجۂ اوّل) کرنے کا موقع نصیب ہو گیا۔ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ علی گڑھ میں سر راس نے اردو نصاب کی تنظیم نو کر کے آنرز اور ایم اے کی جماعتیں کھولیں اور ۱۹۳۴ء میں وہاں بحیثیت لیکچرار میرا تقرر ہو گیا۔ اس کا افسوس رہا کہ اس وقت تک سر راس علی گڑھ چھوڑ چکے تھے۔ میرے اس تقرر میں علامہ کا بھی ہاتھ تھا اور میں اس افتخار اعزاز نیز موصوف کے احسان اور قدر افزائی کو تا زیست فراموش نہیں کر سکتا۔ واضح ہو کہ آسامی کا اشتہار دیا گیا تھا اور انتخاب کے لیے با قاعدہ انٹرویو ہوا تھا۔ کمیٹی نے سارا معاملہ دو باہری ارکان مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ اور حضرت علامہ اقبال رحمہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ سیّد صاحب رحمہ اللہ نے اپنی رائے میرے حق میں دی تھی اور چونکہ بسبب علالت علامہ علی گڑھ تشریف نہیں لا سکے تھے اس لیے سارے متعلقہ کاغذات بذریعہ ڈاک موصوف کو لاہور بھیج دیے گئے تھے۔ حضرت علامہ رحمہ اللہ کی رائے بھی میرے تقرر کے حق میں آئی۔ (۸)

علامہ اقبال رحمہ اللہ سے میری آخری ملاقات غالباً ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ میں علی گڑھ کی ملازمت ترک کر کے حکومت ہند کے شعبۂ اطلاعات میں شامل ہو چکا تھا اور شملہ سے اپنے ایک عزیز کی بیماری کے سلسلے میں لاہور گیا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، شام کا وقت۔ اپنی میوروڈ (موجودہ علامہ اقبال روڈ) والی کوٹھی کے صحن میں داہنے ہاتھ کے برآمدہ کے نیچے صحن میں بغیر بستر کی ایک چارپائی بلکہ ایک چھوٹے کھٹولے پر تہبند اور بنیان میں نیم دراز تھے۔ اس طرح کہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر اُن پر اپنا سر اٹھا رکھا تھا۔ چارپائی کے ایک طرف اُن کا پرانا حقہ رکھا تھا جس کے کبھی کبھی کش لگا لیتے تھے۔ بات کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذہنی اعتبار سے کہیں اور ہیں یا کسی خیال میں مستغرق ہیں، نظریں نہیں ملاتے تھے اور جیسے فکر میں ڈوبے ہوئے کسی ایک ہی جگہ دیکھے جا رہے ہوں مگر باتیں پوری حاضر دماغی اور اعتماد کے ساتھ کر رہے تھے۔ سوال کا جواب پہلے دوٹوک "ہاں" یا "نہیں" سے دیتے تھے، پھر دلائل کا سلسلہ شروع ہوتا تھا[ کسی اور موقع پر لکھ چکا ہوں کہ اس ملاقات میں مَیں نے اردو کی ترقی کے لیے رسم الخط کی تبدیلی اور فلسطین کے مسئلے پر سوالات کیے تھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا انداز سے جواب دے کر علامہ رحمہ اللہ نے بہ دلائل ثابت کیا تھا کہ دونوں مسئلوں کو اٹھانا محض بیکاری تھا۔ میری بیماری پر

اظہارِ تاسف بھی کیا تھا اور دریافت فرمایا تھا کہ ان کے شہر میں مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

میں نے شملہ میں کچھ دنوں تک غالباً ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک دوست ضیا الدین مرحوم کے ساتھ بال جبریل کی چند منتخب غزلیات کے انگریزی ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا تھا مگر کام مشکل نظر آیا، لہٰذا ترک کر دیا گیا۔ نمونہ کے طور پر علامہ کی خدمت میں چند ترجمے بھی روانہ کیے تھے مگر ادھر سے کوئی خبر نہیں آئی۔ اُس زمانے میں ہم دونوں علامہ کے اس مجموعۂ کلام کو سرہانے رکھ کر سوتے تھے اور علی الصبح دفتر جانے سے پہلے بعض غزلیں پاگلوں کی طرح زور دار آواز کے ساتھ کورس میں گاتے رہتے تھے۔

کچھ عرصے بعد علامہ کا وصال ہو گیا۔ یہ خبر وحشت اثر دل نے کیونکر سنی، خدا ہی جانتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے والدۂ مرحومہ کو اُن دنوں کچھ اس قسم کے خطوط لکھے تھے کہ انہوں نے خاص طور پر صبر تلقین کی تھی اور لکھا تھا کہ اس عمر میں کسی کی موت سے مجھے اتنا گہرا اثر نہیں لینا چاہیے مگر وہ موت العالم کے غم سے ناواقف تھیں۔ علامہ رحمۃ اللہ کے انتقال پر نہ جانے کتنی نظمیں لکھی گئیں۔ شاید شدتِ غم میں شاعر کی زبان گنگ اور قلم کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ تمام مطبوعہ نظموں میں جن اشعار نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا ظفر علی خان کے تھے جن سے بڑھ کر شاید سانحے پر اور اشعار لکھے بھی نہیں گئے۔ چند تھے مگر ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کی سچی مثال تھے۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبالؔ کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا
کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صفِ ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا
سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کا اُبھرنا
ہر روز یہی اُس نے مسلمانوں کو دیا درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا (۹)

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے...... کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے۔ (مصنف مضمون ہذا)

(۲) ان بیاضوں سے پاکستان آ کر میں نے ایک مفید کام لیا۔ بہت سی نظموں کے میرے نقل کردہ اور مروجہ متنوں میں اختلاف تھا۔ اسے میں نے مضمون کی بنیاد بنایا اور انجمن کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع کرایا۔ (مصنف مضمون ہذا)

(۳) بر سبیل تذکرہ اسی وقت سب سے پہلے مجھے یہ معلوم ہوا کہ انگریزی میں ''سر'' کے لفظ کے ساتھ ہمیشہ مخاطب کا پہلا نام (جو عیسائیوں میں اصلی نام ہوتا ہے) لیتے ہیں، چنانچہ سر محمد کے بجائے سر اقبال کہا جائے تو غلط ہوگا۔ ہاں ہمارے ہاں اصلی نام کی رعایت سے سر محمد اقبال پورا لکھا جائے تو صحیح ہوگا۔ (مصنف مضمون ہذا)

(۴) یوں بھی سجاد حیدر مرحوم کے بات کرنے کا انداز بے حد البیلا، عام لوگوں کی طرز سے بالکل جدا، تیکھا اور منفرد تھا جس کا مزہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جسے ان سے شرف ہمکلامی حاصل ہوا ہو۔ ان کا لہجہ اور ان کی چال ان دو خصوصیات میں مجھے آج تک کوئی ان کا معمولی سا ہمسر بھی نہیں ملا۔ چال کے بارے میں تو غالب کا مصرعہ ع چال جیسے کڑی کمان کا تیر! کچھ مفہوم ادا کر سکتا ہے لیکن گفتگو کے انداز کو بیان کرنے کے لیے مجھے نہ اپنے نہ کسی اور کے الفاظ میسر آتے ہیں مگر خیر سجاد پر علیحدہ مضمون درکار ہے۔ (مصنف مضمون ہذا)

(۵) یہ خط خطوط اقبال صفحہ ۱۵۲ پر شائع ہو چکا ہے۔ اگرچہ وہاں القاب ''مائی ڈیئر'' نہیں صرف ''ڈیئر سجاد'' درج ہے۔ خط پر تاریخ درج نہیں لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۹۲۵ء میں تحریر کیا گیا تھا۔

(۶) علی گڑھ کا یہ سفر ۱۸ نومبر ۱۹۲۹ء کو شروع ہوا۔ اس سفر کے دوران علامہ نے وہی خطبات پیش کیے جو اس سے قبل مدراس میں صادر فرما چکے تھے۔ اسی سفر کے دوران آپ کو علی گڑھ کی یونین کی طرف سے ''لائف ممبر شپ'' کا اعزاز دیا گیا۔ یہ اعزاز ۲۳ نومبر ۱۹۲۹ء کے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔

(۷) علامہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ گئے تھے جہاں علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ''ڈی لٹ'' کی اعزازی ڈگری دی گئی تھی۔

(۸) اس سلسلے میں نقوش (شخصیات نمبر) میں وقار عظیم کے مضمون ''سرور صاحب'' کا حسب ذیل اقتباس غور طلب ہے......

''یونیورسٹی کے معاملے میں بڑی سادگی اور صفائی سے گفتگو ہوئی۔ مصلحت اور سیاست کے تقاضوں کا ذکر آیا اور جس خاص معاملے کے سلسلے میں علی گڑھ گیا تھا اس کے ہر پہلو پر باتیں ہوئیں تو مجھے اندازہ اور یقین ہو گیا کہ اس آسامی پر کون لیا جائے گا۔'' گویا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ واضح ہو کہ آل احمد سرور جن سے وقار صاحب نے اپنے تقرر کے امکانات کے بارے میں رائے حاصل کی، اس وقت ایک طالب علم تھے اور یونیورسٹی کے انتظامی امور اور تقرراتی پالیسی سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ خورشید صاحب چونکہ ریڈری کے امیدوار تھے، کمیٹی پر نہ تھے۔ سرور صاحب تو اردو کے شعبہ میں اُس آسامی پر لیے گئے جو وسط ۱۹۳۷ء میں میرے حکومت ہند میں چلے جانے سے خالی ہوئی تھی۔ وقار صاحب کو یہ الفاظ لکھتے وقت کم از کم یہ احساس تو ہونا چاہیے تھا کہ وہ مسلمانوں کی اس عظیم درسگاہ میں (جو ان کی مادر علمی بھی ہوئی) میں طریق تقررات کو مشکوک بنا کر اس کی خدمت کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔ میرے بیان کی تائید کرنے والوں میں پاکستان میں پروفیسر حلیم موجود ہیں جو اس وقت علی گڑھ میں پرووائس چانسلر اور انتخابی کمیٹی کے رکن تھے اور نواب محمد اسمٰعیل خاں تھے جو یونیورسٹی کے عارضی وائس چانسلر تھے۔ (مصنف مضمون ہذا)

سیارہ ڈائجسٹ ''اقبال نمبر'' صفحہ ۶۳ میں جلیل قدوائی نے ایک انٹرویو کی شکل میں کم و بیش یہی واقعات بیان کیے ہیں، تاہم موجودہ تحریر سے ان کے علامہ سے تعلقات کی بھرپور صورت سامنے آتی ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ کے حوالے سے مذکورہ انٹرویو اوراقِ گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین صفحہ ۲۸۰ پر شائع ہو چکا ہے۔

# اقبال سے میری ایک ملاقات•

جلیل قدوائی

افسوس کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے مجھے بہت زیادہ مواقع نہیں ہوئے مگر ہاں و ایک بار شرف نیاز ضرور ہوا تھا۔ علی گڑھ میں جب وہ خطبات مدراس کے سلسلہ میں تقریر فرما چکے تو ایک نشست میں یونین ہال میں جہاں ان کی تقریر ہوئی تھی طلباء نے ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی تھی۔ کہاں تو آپ نہایت باوقار اور سنجیدہ بلکہ فلسفیانہ انداز سے اپنے موضوع پر اظہار خیال فرمارہے تھے مگر شعر سنانے کی فرمائش سنتے ہی آپ کے مزاج کا اعتدال جاتا رہا اور آپ نے نہایت تلخ اور تیز بلکہ غصہ کے لہجہ میں نوجوانوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور فرمایا کہ جس قسم کی شاعری موصوف نے کی وہ محفل گرم کرنے اور مشاعرہ بازی کے لئے نہیں بلکہ اصلاح احوال قوم کی خاطر تھی اور چونکہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اس لئے آپ نے شعر کہنا بند کر دیا آپ نے نوجوانوں کو تاکید کی کہ شعر گوئی اور شعر خوانی کی لغویت سے دور رہیں۔

آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے شعر کہنا بند کر دیا مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے متفرق اشعار یا نظمیں کہنی بند کر دی تھیں کیونکہ اس کے بعد آپ کا کلام مجموعوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے بازار میں آیا متفرق کلام آپ نے نہ سنایا نہ رسالوں میں شائع کرایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل کہتے رہتے تھے اور اسے کتابی صورت میں شائع کراتے تھے جستہ جستہ کہہ کر اور سنا کر اس کا اثر اور وقار ضائع نہ کرتے تھے۔

• بعد شکریہ، ماہنامہ سیارہ، لاہور، اقبال نمبر، مئی ۱۹۶۳، بحوالہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ۔ ص 381-380۔

میں آپ سے آپ کے دولت کدہ میکلورروڈ پر بھی ملا تھا۔ شام کے وقت بنیان اور تہ بند میں کھری چارپائی پر اپنے دونوں ہاتھوں پر اپنی گردن ٹکائے آدھے بیٹھے اور آدھے لیٹے اسی طرح آپ مجھ سے ملے تھے۔ ساتھ ہی آپ کا بہت پرانا حقہ رکھا تھا۔ شام کا وقت تھا غالباً اگست ستمبر ۱۹۳۲ء، خاموش اور استغراق کی حالت میں تھے۔ صرف سوالات کا جواب دیتے جاتے تھے۔ میں نے اس زمانہ کے سب سے زیادہ اہم مسئلہ فلسطین پر اور اردو رسم الخط میں ٹائپ کے رائج کرنے کے بارے میں سوالات کئے تھے۔ تفصیلات نہیں یاد رہیں اتنا یاد ہے کہ آپ دوٹوک جواب دیتے تھے۔ ہاں یا نہیں۔ ہوگا یا نہیں ہوگا۔ درست ہے یا غلط ہے۔

فلسطین کے مسئلہ پر آپ نے کہا تھا کچھ نہیں ہوسکتا جمہوری ریاست قائم ہوکر رہے گی۔ وہی ہوا۔ رومن رسم الخط کو اردو میں رائج کرنے کے بارے میں فرمایا۔ ''غلط اقدام''

۱۹۲۵ء میں علی گڑھ میگزین کا جوبلی نمبر میں نے بہ حیثیت جائنٹ ایڈیٹر شائع کیا تھا۔ میں نے سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم سے سفارشی خط لکھایا تھا جواب میں ڈاکٹر صاحب نے خط بھیجا اور ایک فارسی غزل بھی۔ یہ خط اور غزل بلاک بنوا کر ہم نے خاص نمبر میں شائع کی تھی۔ انہوں نے اپنی ایک تصویر بھی عنایت کی تھی وہ بھی اسی صفحہ پر شائع کی تھی۔ یہ تصویر اب عام ہوگئی ہے جس میں حضرت عینک لگائے ''نظریہ اضافیت'' کا مطالعہ کررہے تھے۔ خط کچھ اس طرح پر تھا۔ ''ڈیئر سجاد جلیل قدوائی صاحب کا میری طرف سے شکریہ ادا کیجئے۔ ایک غزل حاضر ہے۔ اس میں غزل وہ تھی جس کے یہ شعر مشہور اور مجھے بہت پسند تھے۔

من ایں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ ساز د مرد غازی را
بہ ہر نرخ کہ ایں کالا بگیری سو مند افتد
بہ زور بازوئے حیدر بدہ ادراک رازی را

# بزمِ اقبال میں چند لمحے •

چراغ حسن حسرت

میں نے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو جلسوں میں بھی دیکھا ہے، پارٹیوں، دعوتوں اور پنجاب کونسل کے اجلاسوں میں بھی لیکن جب ان کا ذکر آتا ہے تو میرے تصور کے پردے پر سب سے پہلے ان کی جو تمثال ابھرتی ہے وہ ان کی نج کی صحبتوں کی تصویر ہے۔ شام کا وقت ہے، وہ کوٹھی کے صحن میں چارپائی پر ململ کا کُرتہ پہنے بیٹھے ہیں۔ چوڑا چکلا سینہ، سرخ و سپید رنگت، زیادہ سوچتے رہنے کی وجہ سے آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ چارپائی کے سامنے کرسیاں بچھی ہیں۔ لوگ آتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ان پر ہر قسم کے لوگ ہیں۔ شاعر، لیڈر، اخبار نویس، اسمبلی کے ممبر، وزیر، پارلیمنٹری سیکرٹری، طالب علم، پروفیسر، مولوی، کوئی آدھ گھنٹہ بیٹھا، کوئی گھنٹہ بھر لیکن بعض نیازمند ایسے ہیں جو گھنٹوں بیٹھیں گے اور خاصی رات گئے گھر جائیں گے۔ حقہ کا دور چل رہا ہے۔ علمی، ادبی اور سیاسی باتیں ہو رہی ہیں۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سب کی باتیں سنتے ہیں اور بیچ میں ایک آدھ فقرہ کہہ دیتے ہیں۔ پھر جو خود اس موضوع پر گفتگو شروع کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ اردو میں باتیں کرتے کرتے پنجابی کی طرف جھک پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی انگریزی کا ایک آدھ فقرہ بھی زبان پر آ جاتا ہے لیکن بات میں الجھاؤ بالکل نہیں، جو کہتے ہیں دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ میں نے کبھی ان صحبتوں میں اپنے آپ کو ان کے بہت قریب پایا ہے لیکن مجھے بارہا ایسا محسوس ہوا ہے کہ مجھ سے دور ہیں، بہت دور۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا لمحہ آ جاتا ہے جو انھیں ہم دنیا والوں کے قریب لے آتا ہے۔ ان کی گفتگو علم و حکمت اور فلسفہ و سیاست کے متعلق ہی

---

• بصد شکریہ، ظہیر الحسن جاوید، مضامین حسرت، بحوالہ جعفر بلوچ، مجالس اقبال۔ ص208۔211۔

نہیں ہوتی تھی۔ وہ لطیفے اور پھبتیاں بھی کہتے تھے۔ میں نے انھیں موسیقی اور پتنگ بازی کے متعلق بھی باتیں کرتے سنا ہے۔ ان کے ہاں آنے والوں میں صرف اہل علم ہی نہیں تھے، ایسے لوگ بھی تھے جنہیں علم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ ان سے انھیں کے ڈھب کی باتیں کرتے۔

ایک شخص نے جو ان کے ہاں اکثر آیا کرتا تھا، ان سے کہا:

''مجھے عشق ہو گیا ہے۔ میں آپ کے ہاں ہر شام اس لیے چلا آتا ہوں کہ آپ کی باتوں سے مجھے کچھ تسکین ہوتی ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟''

وہ تھوڑی دیر چپکے بیٹھے رہے۔ پھر پوچھا ''اس معاملہ میں تمہاری نیت نیک ہے؟''

''جی ہاں! میری نیت تو درست ہے۔''

''کامیابی کی کوئی صورت نہیں؟''

''مجھے تو قطعاً مایوسی ہو چکی ہے۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ میرے قلب کو سکون حاصل ہو جائے۔''

''تو پھر قرآن پڑھا کرو۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔''

پھر ایک موقع پر ان کے پاس ایک نوجوان آیا جو خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے پوچھا:

''تم نے کیا واقعی خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''میں ہندو ہوں۔''

''کیا تم اپنے مذہب پر یقین رکھتے ہو؟''

''ایک حد تک۔''

''تم آواگون کو مانتے ہو؟''

''جی ہاں!''

''پھر خودکشی کرنے سے کیا فائدہ؟''

"میں زندگی کے دکھوں سے چھوٹ جاؤں گا۔"

"اس کی امید بہت کم ہے۔ دیکھو تمہارے عقیدے کے مطابق تمہیں خودکشی کرنے کے بعد یا تو اس سے بہتر جنم ملے گا یا اس سے بدتر یا پھر تمہارے موجودہ جنم جیسا۔ گویا بہتری کی امید صرف ایک تہائی ہے تو اس حالت میں خودکشی کیوں کی جائے؟"

نوجوان اقبال رحمتہ اللہ علیہ کو نہیں جانتا تھا۔ اسے ایک اور شخص اقبال کے ہاں لے آیا تھا۔ تاہم اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے قلب سے تسکین کی ایک لہر سی اٹھی جو اس کی روح پر چھا گئی۔ اس نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔

یہ نوجوان دیوندر ستیارتھی تھا جس نے آگے چل کر گیت جمع کرنے اور دیہاتی زندگی کے متعلق افسانے لکھنے کی وجہ سے شہرت پائی۔ اس نے یہ واقعہ خود مجھ سے نقل کیا ہے۔

اقبال شاعر تھے لیکن ان کے ہاں شعر خوانی کی محفلیں نہیں لگتی تھیں۔ وہ لوگوں کو اپنے شعر نہیں سناتے تھے اور دوسروں سے شعر سنانے کی فرمائش نہیں کرتے تھے۔ ان کا سیاسی فکر بہت پختہ تھا لیکن انھیں سیاسی جوڑ توڑ نہیں آتے تھے۔ وہ اگرچہ پنجاب کی مجلس قانون سازی کے ممبر بھی رہے۔ گول میز کانفرنس میں بھی شریک ہوئے لیکن وہ خود بھی اپنی ان سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کے اطمینان کے لیے یہی نج کی صحبتیں تھیں جن میں تکلف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جن لوگوں کو ان محفلوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے بڑے انسان بھی تھے۔

❀❀❀

# علامہ اقبال•

چراغ حسن حسرت(۱)

میکلوڈ روڈ پر لکشمی انشورنس کمپنی کی عمارت سے کچھ آگے سینما ہے۔ سینما سے ادھر ایک مکان چھوڑ کے ایک پرانی کوٹھی ہے جہاں آج کل آنکھوں یا دانتوں کا کوئی ڈاکٹر رہتا ہے۔(۲) کسی زمانے میں علامہ اقبال یہیں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں یہیں پہلی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب بھی میں اس طرف سے گزرتا ہوں تو اس کوٹھی کے قریب پہنچ کر قدم رُکتے معلوم ہوتے ہیں اور نظریں بے اختیار اس کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

کوٹھی اچھی خاصی تھی، صحن بھی خاصا کشادہ، ایک طرف شاگرد پیشہ کے لیے دو تین کمرے بنے ہوئے تھے جن میں علامہ اقبال کے نوکر چاکر علی بخش رحمن، دیوان علی وغیرہ رہتے تھے لیکن کوٹھی کی دیواریں سیلی ہوئی، پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا، چھتیں ٹوٹی پھوٹی، منڈیر کی اینٹیں اپنی جگہ سے اس طرح سرکی ہوئی تھیں کہ ہر وقت منڈیر کے زمین پر آرہنے کا اندیشہ تھا۔ میر کا مکان نہ سہی، بہر حال غالب کے بَلّی ماراں والے مکان سے ملتا جلتا نقشہ ضرور تھا۔

کوٹھی کے صحن میں چارپائی بچھی تھی، چارپائی پر اُجلی چادر، اس پر علامہ اقبال ململ کا کُرتہ پہنے تہبند باندھے تکیہ سے ٹیک لگائے حقہ پی رہے تھے۔ سرخ و سپید رنگت بھرا ہوا جسم، سر کے بال کچھ سیاہ کچھ سپید، داڑھی گھٹی ہوئی۔ چارپائی کے سامنے کچھ کرسیاں تھیں۔ ان پر دو تین آدمی بیٹھے تھے، دو تین اُٹھ کے جا رہے تھے۔ سالکؔ صاحب (۳) میرے ساتھ تھے، علامہ اقبال نے پہلے اُن کی مزاج پُرسی کی۔ پھر میری طرف توجہ فرمائی۔

• بصد شکریہ، ظہیر الحسن جاوید، مضامین حسرت، بحوالہ جعفر بلوچ، مجالس اقبال۔ ص 208۔211۔

ان دنوں نمک کی ستیاہ گرہ زوروں پر تھی، ڈانڈی کے مارچ کے چرچے جگہ جگہ ہو رہے تھے۔ لاہور میں روز جلوس نکلتے، جلسے ہوتے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگتے تھے۔ میں نے پہلے کبھی کھدر کا لباس نہیں پہنا تھا مگر یہ تو کھدر کا خاص موسم تھا۔ کچھ رواجِ عام کا اثر، کچھ کفایت کا خیال، میں نے بھی یہی لباس پہننا شروع کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کا ذہن میرے کھدر کے لباس سے چرخے، چرخے سے گاندھی اور گاندھی سے کانگریس کی جانب منتقل ہو گیا کیونکہ اس رسمی تعارف کے بعد انہوں نے جو گفتگو شروع کی، اُس کی لپیٹ میں گاندھی، کانگریس اور اہنسا سب کے سب آ گئے تھے۔

موضوع روکھا پھیکا تھا مگر بیچ بیچ میں لطیفے بھی ہوتے جاتے تھے۔ میں تو ہُوں ہاں کر کے رہ جاتا تھا مگر سالکؔ صاحب کب رُکتے تھے، جہاں موقع ملتا تھا کوئی لطیفہ، کوئی چٹکلہ، کوئی پھبتی ضرور کہہ دیتے تھے۔ ہم جب گئے تھے تو سورج چھپنے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا، مگر اُٹھے تو اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ مجھے لاہور آئے ہوئے سوا سال سے اوپر ہو چکا تھا لیکن زیادہ لوگوں سے ربط نہیں تھا یا تنہا گھر میں بیٹھا ہوں یا سالکؔ صاحب کے ہاں، ہفتہ میں ایک دو مرتبہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتی (۴) کے ہاں بھی چلا جاتا تھا لیکن اب جو علامہ اقبال کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا تو ایک اور ٹھکانہ ہاتھ آ گیا۔ کچھ دنوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ اول تو دوسرے تیسرے ورنہ ساتویں آٹھویں روز ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا۔ کبھی کسی دوست کے ساتھ کبھی اکیلا مگر جب جاتا تھا گھنٹہ دو گھنٹہ ضرور بیٹھتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بارہ بارہ بجے تک برابر محفل جمی ہے، لوگ آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ادب، شاعری، سیاست، مذہب پر بحثیں ہو رہی ہیں لیکن ان محفلوں میں سب سے زیادہ علامہ اقبال باتیں کرتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی حیثیت زیادہ تر ''سامعین'' کی ہوتی تھی۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو بات کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے یا بات کاٹ کے بولنا شروع کر دیتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر مسئلہ کے متعلق اُن کی معلومات دوسروں سے زیادہ ہوتی تھیں اور اہل محفل کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ چند جملے کہہ کے چپکے ہو رہیں۔

ان کے مکان کے دروازے غریب و امیر، ادنیٰ و اعلیٰ سب پر کھلے تھے۔ نہ کوئی حاجب نہ دربان، نہ ملاقات کے لیے کارڈ بھجوانے کی ضرورت تھی، نہ تعارف کے لیے کسی واسطہ

کی حاجت، جو آتا ہے کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا ہے اور یا تو خود اپنا تعارف کرا دیتا ہے یا چپ چاپ بیٹھا باتیں سنتا رہتا ہے۔ علامہ اقبال باتیں کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے رُکتے ہیں تو اُس کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور پوچھتے ہیں ''فرمایئے کہاں سے آنا ہوا؟'' وہ اپنا نام بتاتا ہے، کوئی حاجت ہوتی ہے تو بیان کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد دین (۵) تاثیر کہتے ہیں کہ ایک رات کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے کہ ایک شخص جس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے اور کچھ بدحواس معلوم ہوتا تھا، آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ علامہ اقبال کچھ دیر کے بعد اُس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ''فرمایئے، کہاں سے تشریف لائے؟'' وہ کہنے لگا ''یوں ہی آپ سے ملنے چلا آیا تھا۔'' خدا جانے علامہ اقبال نے اس کے چہرے سے معلوم کر لیا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا یا کوئی اور بات تھی۔ بہر حال انہوں نے پوچھا ''کھانا کھایئے گا؟'' اس نے جواب دیا ''جی ہاں کھلا دیجیے۔'' علامہ اقبال نے علی بخش کو بلا کے کہا ''انہیں دوسرے کمرے میں لے جا کے کھانا کھلا دو۔'' یہ سن کر وہ کہنے لگا ''میں کھانا یہیں کھاؤں گا۔'' غرض علی بخش نے وہیں دستر خوان بچھا کے اُسے کھانا کھلایا، وہ کھانا کھا کے بھی نہ اُٹھا اور وہیں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ رات اچھی خاصی جا چکی تھی۔ اس لیے میں اسے وہیں چھوڑ کے گھر چلا آیا۔ دوسرے دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ کیوں ڈاکٹر صاحب! رات جو شخص آیا تھا اُس کا کیا ہوا؟ کہنے لگے ''تمہارے جانے کے بعد میں نے اُس سے کہا کہ اب سو جایئے۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ آپ کے کمرے میں ہی پڑ رہوں گا۔ چنانچہ علی بخش نے میرے کمرے کے دروازے کے ساتھ اُسے چار پائی بچھا دی۔ صبح سویرے اٹھ کر وہ کہیں چلا گیا۔

اُن سے جو لوگ ملنے آتے تھے، ان میں کچھ تو روز کے آنے والے تھے، کچھ دوسرے تیسرے اور کچھ ساتویں آٹھویں دن آتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جنہیں عمر بھر میں صرف ایک آدھ مرتبہ ان سے ملنے کا موقع ملا۔ پھر بھی اُن کے ہاں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ جب جاؤ دو تین آدمی بیٹھے ہیں، کوئی سفارش کرانے آیا ہے، کوئی کسی شعر کے معنی پوچھ رہا ہے۔ کسی نے آتے ہی سیاسیات کے متعلق بحث چھیڑ دی ہے اور کوئی مذہب کے متعلق اپنے شکوک بیان کر رہا ہے۔

اکثر لوگ جو باہر کے کسی شہر سے لاہور کی سیر کرنے آتے تھے، اُن کی کوٹھی پر حاضر ہونا

واجبات میں سے سمجھتے تھے کیونکہ لاہور آ کے ڈاکٹر اقبال کو نہ دیکھا تو کیا دیکھا؟ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا دیکھ کر اُن سے علاج کرانے آجاتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص اُن سے دانت نکلوانے چلا آیا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اقبال علاج کرنا نہیں جانتے تو وہ بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ یہ کیسے ڈاکٹر ہیں جنھیں دانت نکالنا بھی نہیں آتا۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں علامہ اقبال سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا اشتیاق عمر بھر رہا مگر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو اُن کی طبیعت کا حال معلوم نہیں تھا، وہ ان کی عظمت کے ذکر اذکار سن کر اور ان کے نام کے ساتھ سر جیسا پُرعب خطاب دیکھ کر دل میں سمجھتے تھے کہ ان کے حضور میں ہم ایسے غریب لوگوں کی رسائی کہاں؟

میرے ایک عزیز دوست جو علامہ اقبال کے سچے عقیدت مند ہیں ان کی وفات سے کوئی دو مہینے بعد مجھ سے ملنے آئے اور جب تک بیٹھے رہے انہی کا ذکر کرتے رہے۔ جب انھیں میری زبانی معلوم ہوا کہ علامہ اقبال سے ہر شخص مل سکتا تھا تو انہوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ مجھے کئی سال سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا تھی مگر حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ جی میں سوچتا تھا کہ کسی تقریب کے بغیر کیسے ملوں؟ کیا عجب ہے کہ وہ ملنے سے انکار ہی کر دیں۔ کئی دفعہ میں اس شوق میں ان کی کوٹھی تک گیا مگر اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس لیے باہر سے ہی اُلٹے پاؤں لوٹ آیا۔''

علامہ اقبال بہت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں تو وہ ہمیشہ تہبند اور کُرتے میں نظر آتے تھے۔ البتہ باہر نکلتے تو کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے، کبھی فراک کوٹ کے ساتھ شلوار اور ترکی ٹوپی پہنی ہوتی تھی۔ ولایت جانے سے پہلے وہ پنجابیوں کا عام لباس پہنتے تھے یعنی کبھی مشہدی لنگی کے ساتھ فراک کوٹ اور شلوار کبھی سپید ململ کی پگڑی، وہ شروانی اور چست گھٹنا بھی پہنتے رہے ہیں مگر بہت کم۔ میں نے اس لباس میں انہیں دیکھا تو نہیں البتہ قیاس کہتا ہے کہ شروانی اور چست گھٹنا اُن کے جسم پر بہت کھلتا ہوگا۔

وہ کھانا کم کھاتے تھے مگر ہمیشہ اچھا کھاتے تھے۔ مدت سے ان کا یہ دستور تھا کہ رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے، صرف نمکین کشمیری چائے پر اکتفا کرتے تھے۔ دسترخوان پر ہمیشہ دو تین سالن ضرور ہوتے تھے۔ پلاؤ اور کباب انہیں بہت مرغوب تھے۔ شب دیگ بھی بہت پسند

تھی۔ جاڑے کے دنوں میں بڑے چاؤ سے شب دیگ پکواتے اور خشکہ کے ساتھ کھاتے تھے، پھلوں میں صرف آموں سے رغبت تھی، آموں کی فصل میں لگن اور سینیاں بھر کے بیٹھ جاتے، خود کھاتے، احباب کو کھلاتے، لطیفے کہتے، آپ ہنستے دوسروں کو ہنساتے تھے۔

جوانی کے زمانے میں اُن کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کے نماز پڑھتے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے، پھر ورزش کرنا شروع کر دیتے، ڈنڈ پیلتے، مگدر ہلاتے اور جب سارا جسم عرق عرق ہو جاتا تو مگدر ہاتھ سے چھوٹتا، سن زیادہ ہو گیا تو ورزش چھوٹ گئی۔ البتہ قرآن کریم کی تلاوت آخر تک جاری رہی۔

عام طور پر پنجابی بولتے تھے۔ کبھی کبھی اثنائے گفتگو میں انگریزی بولنا بھی شروع کر دیتے تھے۔ یو پی کے جو شاعر اور ادیب ان سے ملنے آتے تھے انہیں علامہ اقبال کے ڈیل ڈول، لب ولہجہ اور گفتگو کے انداز پر حیرت ہوتی تھی کیونکہ ان لوگوں کے ذہن میں شاعر کا تصور یہ ہے کہ تیکھے تیکھے نقش، جسم دھان پان بلکہ بالکل مشتِ استخواں، کلے میں گلوری جس کی پیک بہہ کر ٹھوڑی تک پہنچی ہے، سر پر پٹے اور ان پر دو پلڑی ٹوپی، بات بات پر تسلیمات بجالاتا اور دُہرا ہوا جاتا ہے۔ بغل میں کاغذوں کا پلندہ، جس میں کچھ ادھوری، کچھ پوری غزلیں، مخاطب کے مذاق اور خیالات کا لحاظ نہیں کرتا۔ جو ملنے آتا ہے اُسے اپنا کلام سنانا شروع کر دیتا ہے اور اس وقت تک خاموش نہیں ہوتا جب تک سننے والا اُکتا نہیں جاتا۔

مجھ سے یو پی کے ایک شاعر نے جو علامہ اقبال سے مل چکا تھا، استعجاب کے انداز میں کہا "اجی صاحب! ڈاکٹر صاحب اپنے لب ولہجہ اور ڈیل ڈول سے بالکل پنجابی معلوم ہوتے ہیں۔" گویا ان کے نزدیک اچھے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لب ولہجہ اور ڈیل ڈول سے پنجابی معلوم نہ ہو۔

ایک دفعہ یو پی کے ایک شاعر صاحب آئے اور تھوڑی دیر کے بعد علامہ اقبال سے ان کا کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ انہوں نے ٹالنا چاہا لیکن آپ جانتے ہیں کہ یو پی کا شاعر سننے اور سنانے کے معاملہ میں ہمیشہ "بے پناہ" ہوتا ہے۔ انہوں نے علامہ مرحوم کے انکار کو شاعرانہ انکسار سمجھا اور برابر تقاضا جاری رکھا، جب یوں کام نہ نکلا تو اپنی ایک غزل سنانی شروع کر دی۔ علامہ اقبال کچھ دیر تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے لیکن جب دیکھا کہ مدعی سامعہ خراشی پر ہی اکتفا نہیں

کرنا چاہتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ داد کا طالب بھی ہے تو ان سے ضبط نہ ہو سکا، صاف کہہ دیا کہ اس قصے کو جانے دیجیے، میں شعر سننے سنانے کا قائل نہیں۔ وہ تھوڑی دیر چپکے بیٹھے رہے، پھر اٹھ کے چلے گئے مگر اُن کے تیوروں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے نکلتے ہی خودکشی کر لیں گے اور اس معاملہ میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ انہیں یقیناً عمر بھر میں کبھی اس قسم کے شاعر سے سابقہ نہیں پڑا ہوگا، جی میں کہتے ہوں گے کہ یہ کیسے شاعر ہیں جو نہ شعر سنتے ہیں، نہ سناتے ہیں، نہ داد لینے کا شوق ہے نہ داد دینے کا سلیقہ۔

علامہ اقبال جوانی میں کبھی کبھار مشاعروں میں بھی شریک ہو جاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ انہیں اس قسم کے اجتماعات سے نفرت سی ہو گئی۔ ایک دن مشاعروں کا ذکر آ گیا تو فرمایا ''اردو شاعری کو ان مشاعروں نے کھویا۔'' میں نے پوچھا، وہ کیسے؟ کہنے لگے ''مشاعروں میں برے بھلے سب شریک ہوتے ہیں اور داد کو شعر کے حسن وقبح کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری نے عوام کے مذاق کو اپنا رہنما بنا لیا۔'' میں نے عرض کیا ''ان مشاعروں نے تو اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔'' فرمایا ''ہاں زبان کو فائدہ پہنچایا اور شاعری کو غارت کر ڈالا۔''

مرحوم کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی، خشک فلسفیانہ مسائل کو بھی وہ لطیفوں اور پھبتیوں سے ایسا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ جی چاہتا تھا پہروں بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہیں۔ یوں تو ہر روز دو تین لطیفے ہو جایا کرتے تھے لیکن جو پھبتیاں انہوں نے سر شہاب الدین (۶) کے متعلق کہی ہیں اُنہیں تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دیکھ کر علامہ اقبال کو لطیفوں اور پھبتیوں کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ سر شہاب الدین کی رنگت سیاہ ہے، ایک دفعہ وہ سیاہ سوٹ پہن کر اسمبلی میں تشریف لے آئے۔ علامہ اقبال نے انہیں دیکھا تو ہنس کے فرمایا ''چودھری صاحب! آج تو آپ ننگے ہی چلے آئے۔''

چودھری صاحب نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ لباس کے انتخاب کا معاملہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ سیاہ رنگت پر سیاہ سوٹ واقعی بھلا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لوگوں کو یہ معلوم کرنے میں دقت ہوتی ہے کہ کوٹ کا کالر کہاں ہے؟ اور ٹھوڑی کہاں؟ یہ سوچ کے سیاہ سوٹ کے بجائے سپید سوٹ پہننا شروع کر دیا۔ سپید پتلون، سپید کوٹ، سپید قمیص، سپید پگڑی چونکہ وہ خود بھی پنجابی کے شاعر ہیں، اس لیے سپید سوٹ زیب تن کر کے سمجھ لیا کہ اب حریف کے لیے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں

رہی۔ سپید لباس میں سیاہ چہرہ اسی طرح معلوم ہوگا جس طرح گورے گالوں پر سیاہ تِل اور خال رُخِ یار کی تعریف میں تو دیوانوں کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ علامہ اقبال نے انہیں دیکھا تو سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور بے اختیار ہنس پڑے۔ چودھری صاحب نے جھنجھلا کے کہا ''آپ ہنستے کیوں ہیں؟'' ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ آپ ہیں یا کپاس کے کھیت میں ارنا بھینسا۔'' ایک مرتبہ پھر ایسا ہی موقع پیش آیا تو مرحوم نے اُن پر بجھے ہوئے سگریٹ کی پھبتی کہی۔

ایک مرتبہ بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ چودھری شہاب الدین کا ذکر چھڑ گیا۔ کہنے لگے ''میں نے عالم خیال میں ایک بڑھیا دیکھی جو اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا تو کون ہے؟ کہنے لگی ''میں طاعون ہوں۔'' میں نے کہا، تو بھاگ کے کہاں جا رہی ہے؟ کہنے لگی ''میں شہر کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن وہاں شہاب الدین پہلے ہی موجود ہے۔ میری کیا ضرورت رہ گئی؟''

ایک دن سر شہاب الدین سے کہنے لگے ''چودھری صاحب آپ سچے مسلمان ہیں۔'' چودھری صاحب نے پوچھا ''آپ کو کیونکر معلوم ہوا؟'' کہنے لگے ''مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے اور بحمد اللہ کہ آپ کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔''

جن دنوں ابھی چودھری شہاب الدین نہ سر تھے نہ کونسل کے صدر بلکہ صرف لاہور میونسپلٹی کی صدارت فرماتے تھے اور نرے چودھری جی کہلاتے تھے۔ مہتر صاحب چترال (۷) لاہور تشریف لائے اور یہاں کے معززین نے اُن کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی۔ چونکہ علامہ اقبال کے سوا مہتر صاحب سے کسی کی شناسائی نہیں تھی، اس لیے مہمانوں سے میزبانوں کا تعارف کرانے کی خدمت اُنھیں کے سپرد ہوئی۔ چودھری شہاب الدین کی باری آئی تو علامہ مرحوم نے فرمایا...... اعلیٰ حضرت مہتر چترال...... چودھری شہاب الدین۔

اتنا کہہ کے بڑی متانت سے فرمایا ''ایں ہم مہتر لاہور است'' اور اس ایک فقرہ میں چودھری صاحب کی تمام صوری اور معنوی حیثیتیں، اُن کا طول و عرض اور عمق یعنی پورے ابعاد ثلٰثہ آ گئے۔

اس قسم کے لطیفے جو صرف چودھری سر شہاب الدین سے متعلق ہیں، ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں ضرور ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا اور چودھری صاحب

بتاتے نہیں۔ دوسرے لوگوں کو جو لطیفے یاد رہ گئے ہیں ان میں سے بعض حاضر ہیں، کچھ اور بھی ہیں لیکن انہیں اس لیے نہیں لکھتا کہ میں تعزیراتِ ہند اور ضابطہ دیوانی دونوں سے بہت ڈرتا ہوں، تعزیراتِ ہند تو خیر کچھ زیادہ ڈرنے کی چیز نہیں لیکن ضابطہ دیوانی کی زد میں آنے کے لیے ذرا جیب میں ''زور'' ہونا چاہیے۔ آپ کو ممکن ہے اس موقع پر غالبؔ یاد آ جائے اور آپ فرمائیں کہ ؏

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

لیکن میں عرض کروں گا کہ یوں ہی سہی، بلا سے ڈگری اور قرقی کا خطرہ تو نہیں۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ اُن سے ہر قسم کے لوگ ملنے آتے تھے اور وہ سب کی باتیں غور سے سنتے اور ان کا جواب دیتے تھے، دوسرے تیسرے (روز) کالجوں کے کچھ طلباء بھی آ جاتے تھے۔ ان میں سے کوئی ان کے اشعار کے معانی پوچھتا تھا، کوئی مذہب کے متعلق سوالات کرتا تھا۔ کوئی فلسفہ کی بحث لے بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے چار پانچ طالب علم اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کالج کی مخلوق میں بننے سنورنے کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ پوڈر اور سرخی کا استعمال روز بروز بڑھتا جاتا ہے، ابروؤں کو خم دینے، زلفوں میں بل ڈالنے، ہونٹوں کو سرخی کے استعمال سے ''لعلیں'' بنانے کا شوق زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ چاروں پانچوں گل چہرہ اور نازک اندام، اس پر بناؤ سنگھار کا خاص اہتمام۔ انہوں نے آتے ہی پردہ کی بحث چھیڑ دی اور ایک نوجوان کہنے لگا ''ڈاکٹر صاحب اب مسلمانوں کو پردہ اٹھا دینا چاہیے۔''

ڈاکٹر صاحب مسکرا کے بولے ''آپ عورتوں کو پردہ سے نکالنا چاہتے ہیں اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالج کے نوجوانوں کو بھی پردہ میں بٹھا دیا جائے۔''

علی بخش اُن کا پرانا نوکر ہے اور کوئی چالیس برس تک برابر ان کے ساتھ رہا ہے، ملازمت اختیار کی تو مَسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، اب داڑھی مونچھیں سپید ہو چکی ہیں، داڑھی تو خیر منڈوا دی اور پردہ ڈھک گیا، مونچھوں کو خضاب کیا مگر چند دنوں میں خضاب اُڑ گیا اور مونچھوں کی رنگت کچھ عجیب سی ہو گئی۔ انتقال سے ایک دو مہینے پہلے کا ذکر ہے کہ علامہ مرحوم تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اردگرد کچھ بے تکلف احباب بیٹھے تھے۔ علی بخش پاس کھڑا تھا کہ اُس کی مونچھوں کی رنگت کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک صاحب کہنے لگے ''یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر علی بخش کی مونچھوں کی رنگت کیا ہے؟'' دوسرے بولے خاکستری؟ ایک اور صاحب نے کہا خاکستری نہیں،

اگرئی۔ ڈاکٹر صاحب بھی سن رہے تھے، مسکرا کے بولے "نہ اگرئی نہ خاکستری، چھئی کہو چھئی۔"

علامہ اقبال کے ملنے والوں میں دو شخص بہت دلچسپ تھے۔ مولانا گرامی (۸) اور عبداللہ چغتائی۔ (۹) گرامیؔ ہوشیار پور کے رہنے والے اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے لیکن ان کی صورت شکل، چہرے مہرے سے قطعاً ذہانت کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ سر پر بڑا پگڑ، جس کے پیچ کھلے ہوئے، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، ہاتھ میں ڈنڈا۔ علامہ اقبال سے انہیں سچی محبت تھی، لاہور آتے تھے تو مہینوں انہیں کے ہاں رہتے تھے۔ کبھی وہ دیر تک نہ آتے تھے تو علامہ اقبال خود انہیں بلوا بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ گرامیؔ جالندھر آئے ہوئے ہیں۔ حضرت مرحوم نے علی بخش کو جالندھر بھیجا کہ گرامی کو لے آؤ۔ گرامی نے اسے دیکھ کے کہا "ارے علی بخش تم کہاں؟" کہنے لگا "آپ کو لینے آیا ہوں۔" ارشاد ہوا "میں تو خود لاہور چلنے کی تیاری کر رہا ہوں، ارے کوئی ہے تانگہ لاؤ ہم اسٹیشن تک جائیں گے، اچھا سا تانگہ ہو، لاہور جا رہے ہیں، لاہور، وقت پر اسٹیشن پہنچ جائے۔"

تانگہ والا آیا اور تانگہ والے نے اُسے دھوپ میں کھڑا کر دیا، تھوڑی دیر میں مولانا گرامی گھر سے نکلے اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے لیکن لمحہ بھر بیٹھ کے اُتر گئے اور علی بخش سے کہنے لگے "تانگہ گرم ہو گیا، ڈاکٹر کو میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہہ دینا کہ تانگہ گرم ہو گیا تھا اس لیے نہیں آئے۔ اگلے مہینے آئیں گے، اگلے مہینے، ہاں یہ ضرور کہہ دینا کہ تانگہ گرم ہو گیا تھا۔"

گرامی کے لطیفے تو بے شمار ہیں لیکن اس خیال سے نہیں لکھتا کہ یہ مضمون کہیں "لطائف گرامی" بن کے نہ رہ جائے۔ عبداللہ چغتائی، گرامی کو نہیں پہنچتے۔ البتہ وہ بھی اپنے انداز کے ایک ہی بزرگوار ہیں، جتنا تیز بولتے ہیں اتنا ہی تیز چلتے ہیں اور لکھنے میں بولنے اور چلنے دونوں سے تیز، آدھا فقرہ ذہن میں ہے، آدھا کاغذ پر، یہی وجہ ہے کہ اُن کی نثر غالبؔ اور بیدلؔ کی نظم سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال انہیں چھیڑ چھیڑ کے اُن کی باتیں سنتے اور لطف اٹھاتے تھے۔

مرحوم زندگی کے بعض معاملات میں خاص ضابطوں کے پابند تھے، وہ گھر کا سارا حساب کتاب باقاعدہ رکھتے تھے اور ہر شخص کے خط کا جواب ضرور دیتے تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص ان سے زیادہ سند یا کسی تصنیف پر ان کی رائے لینے آتا تھا تو کہتے تھے، خود لکھ دو، میں دستخط کر دوں گا اور یہ بات صرف ٹالنے کی غرض سے نہیں کہتے تھے بلکہ جو کچھ کوئی لکھ لاتا

تھا اُس پر دستخط کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی، ایک ایک نشست میں دو دو سو شعر لکھ جاتے تھے۔ پلنگ کے پاس ایک تپائی پر پنسل اور کاغذ پڑا رہتا تھا۔ جب شعر گوئی پر طبیعت مائل ہوتی تھی، لکھنا شروع کر دیتے تھے، کبھی خود لکھتے تھے، کبھی کسی کو لکھوا دیتے تھے۔ عشق رسول ﷺ نے ان کے دل کو گداز کر رکھا تھا، نبی کریم ﷺ کا نام لیتے وقت اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں اور قرآن پڑھتے پڑھتے بے اختیار رو پڑتے تھے۔ غرض اُن کی شخصیت بے حد دلآویز تھی۔ جن لوگوں نے صرف اُن کا کلام پڑھا ہے اور اُن سے ملے نہیں وہ اقبال کے اعلیٰ کمالات سے بے خبر ہیں۔

موت سے کوئی ڈھائی سال پہلے وہ میورو ڈپر اپنی نو تعمیر کوٹھی میں اُٹھ گئے۔ وہاں گئے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے کہ اُن کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا، (۱۰) انہیں اس واقعہ کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے اس حالت میں انہیں دیکھا کہ مرحومہ کی قبر کھودی جا رہی ہے اور وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے معلوم ہو رہے تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی اور چہرہ زرد۔ اس واقعہ کے بعد ان کی صحت برابر بگڑتی چلی گئی۔ آخر ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کیا اور شاہی مسجد کے باہر دفن ہوئے۔ (۱۱)

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) چراغ حسن حسرت کاشمیری ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں فوت ہوئے۔ سند باد جہازی کے قلمی نام سے بھی مشہور ہیں۔ امروز اخبار میں "حرف و حکایت" کے کالم لکھتے تھے۔

(۲) رتن سینما (میکلوڈ روڈ) کے قریب اس کوٹھی میں جہاں علامہ ۱۹۳۵ء تک قیام پذیر رہے، آج کل عارضی طور پر اقبال اکادمی کا دفتر ہے۔

(۳) عبدالمجید سالک (پیدائش: ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء، وفات ۲۷ دسمبر ۱۹۵۹ء) ذکر اقبال ان کی مشہور تصنیف ہے۔

(۴) حکیم فقیر محمد چشتی...... علامہ کے مشہور دوست تھے جن سے علامہ کی صحبتیں رہتی تھیں۔

(۵) ڈاکٹر محمد دین تاثیر...... ۱۹۰۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا۔ مقالات تاثیر کے نام سے حال ہی میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

(۶) چوہدری شہاب الدین...... لاہور کے مشہور ایڈووکیٹ۔ علامہ کے بے شمار لطیفے ان سے منسوب ہیں۔

(۷) مہتر چترال...... محمد ناصر الملک چترالی علامہ کے دوست تھے۔ صحیفۃ التکوین نامی کتاب کے مصنف تھے۔ اس کتاب کا موضوع تخلیقِ کائنات اور اس کا ارتقاء ہے۔

(۸) مولانا گرامی...... غلام قادر گرامی ۱۸۹۵ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

(۹) عبداللہ چغتائی...... مرقع چغتائی کے مصنف عبدالرحمن چغتائی کے بھائی اور مشہور ماہر آثار قدیمہ۔

(۱۰) اشارہ جاوید اقبال کی والدہ سردار بیگم کی طرف ہے جن کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو ہوا۔

# پس تحریر•

## چراغ حسن حسرت

میں ۱۹۲۹ء میں پہلی بار علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں وہ میکلوڈ روڈ پر قیام پذیر تھے۔ گرمیوں کے دن تھے، شام کا وقت تھا، کوٹھی کے صحن میں وہ ململ کا کرتہ پہنے چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ سامنے کرسیاں بچھی تھیں۔ جو آتا کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتا۔ اہل محفل میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ شاعر، اخبار نویس، ادیب، کلرک، پہلوان۔ گفتگو سیاسیات سے شروع ہوئی اور پھبتیوں پر ختم ہوئی۔ علامہ اقبال کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے ایسے فقرے چست کیے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

علامہ کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی اور کبھی کبھی طبیعت لہراتی تو پھبتیوں پر پھبتیاں کستے...... ایک صاحب جو علامہ کے خاص نیازمندوں میں تھے، سب سے زیادہ نظر عنایت تھی، سب سے زیادہ پھبتیاں انہی پر کسی جاتیں۔ ایک دفعہ اُن کے بعض اقرباء نے ان سے کہا ''تم اپنے آپ کو علامہ اقبال کے خاص دوستوں میں سمجھتے ہو لیکن اُن کے ہاں جو تمہاری حیثیت ہے، وہ ہمیں معلوم ہوگئی ہے۔'' یہ طعنہ سننے کے بعد وہ گھر میں بیٹھ رہے۔ علامہ اقبال کو معلوم ہوا تو انہیں منانے کے لیے اُن کے گھر جانے کا ارادہ کیا، انہیں جب خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب مجھے منانے کے لیے میرے ہاں آنا چاہتے ہیں تو وہ بے تاب ہو کر خود علامہ کے ہاں پہنچے۔ علامہ اقبال نے پہلے تو ان سے معافی مانگی اور کہا کہ افسوس میری زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس پر آپ مجھ سے

• (سندباد جہازی: امروز، حرف و حکایت، ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ء، صفحہ ۵) بحوالہ، صابر کلوروی، اقبال کے ہمنشیں، ص 133۔147۔

ناراض ہو گئے، پھر ایک آدھ پھبتی ایسی کہہ دی کہ وہ بے اختیار ہنس دیے۔

علامہ کے پرانے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ وہ شروع شروع میں علامہ کے ہاں ملازم ہوا تو شہر والوں کے طور طریق سے ناواقف تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہہ دیا، جاؤ بازار سے بتاشوں کا مُربہ لے آؤ۔ سارے شہر میں پھرا لیکن بتاشوں کا مربہ کہاں سے ملتا، دکاندار علی بخش سے مذاق کرتا رہا۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ منادی میں لکھا، میں ڈاکٹر اقبال کو ہندوستان کا شاعر اعظم نہیں سمجھتا۔ اسی زمانے میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے پاس فاسفورس کا تیل بھیجا، ڈاکٹر صاحب کے گھٹنے میں درد تھا، وہ کم ہو گیا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو لکھا ''آپ نے جو تیل بھیجا تھا، میں نے اسے استعمال کیا اور مفید پایا۔'' دوسرے دن منادی میں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط چھپ گیا۔ اس کے ساتھ جلی حروف میں چار کالمی عنوان تھا:

''فاسفورس کے تیل کے متعلق ہندوستان کے شاعر اعظم کی رائے''

ڈاکٹر صاحب کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی لیکن میں نے منادی کے یہ دونوں پرچے انہیں دکھائے تو ہنس کے کہنے لگے ''خواجہ صاحب بھی سچے! اس فاسفورس کا تیل استعمال کرنے سے پہلے میں کچھ نہیں تھا، اس تیل نے مجھے شاعر اعظم بنا دیا۔''

ایک مرتبہ مولانا عبدالمجید سالک علامہ اقبال کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے ''ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں ''علامہ اقبال کے جانور'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ ڈالوں۔'' علامہ مرحوم نے کہا ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' سالک صاحب کہنے لگے ''آپ نے اپنے کلام میں جا بجا مختلف جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ میں ایک مضمون لکھ ڈالنا چاہتا ہوں جس میں ان سب کا ذکر آ جائے گا۔'' علامہ نے فرمایا ''بہت اچھا خیال ہے۔''

(حرف وحکایت از چراغ حسن حسرت: امروز: ۲۴ دسمبر ۱۹۵۰ء۔ ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء)

علامہ اقبال بڑے شگفتہ طبع اور بذلہ سنج بزرگ تھے، کبھی کبھی خوش طبعی کی طرف جھک پڑتے تو مسلسل پھبتیاں کہتے چلے جاتے تھے۔ ان کے نیازمندوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنھیں انھوں نے مایۂ تفریح بنا رکھا تھا۔ ان میں ایک صاحب ایسے تھے جنہوں نے مجددیت اور مہدویت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ وہ لاہور آئے تو سب سے پہلے علامہ اقبال رحمہ اللہ کی خدمت میں

حاضر ہوئے۔ ان کے پاس اپنے دعوے کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ میں کانگڑہ کے زلزلہ کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں اور قرآن میں اس زلزلہ کا ذکر آیا ہے اور اسے قربِ قیامت کی علامت قرار دیا ہے۔ علامہ اقبال نے اُن کی یہ دلیل سنی تو بہت لطف اندوز ہوئے اور کہنے لگے...... پھر تو آپ ''ابنِ زلزلہ'' ہوئے اور یہ ظاہر ہے کہ مہدویت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

❁❁❁

# تاثرات●

چوہدری محمد عبداللہ خان

دسمبر ۱۹۳۶ء کی آخری شام تھی۔ میں اور میرے برادر عزیز محمد زبیر ایم اے حضرت علامہ کی خدمت میں پہلی بار نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ مجھے اس سے قبل کئی ایک بلند مرتبت شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ یہ لوگ اپنی نیازمندیوں کو اپنے سحر شخصیت سے مسحور کرنے کے لیے ایک ایسی تخیلی فضا مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک اجنبی آدمی جو پہلے ہی ان کے بڑے بڑے نام سن کر مرعوب ہوتا ہے۔ یہ عجیب وغریب ماحول، یہ تکلف آمیز گفتگو سن کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ عصر حاضر کی اس سب سے بڑی شخصیت کے حضور میں ہماری بھی یہی کیفیت ہو گی لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ ایک درویش کا آستانہ ہے اور یہاں کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔

حضرت علامہ جاوید منزل کے صحن میں پلنگ پر دراز تھے اور ایک بے تکلف دوست سے گفتگو فرما رہے تھے۔ حضرت ممدوح کے نحیف اور کمزور جسم پر بڑھاپا اپنی تمام خوفناکیوں کے ساتھ مستولی ہو چکا تھا۔ سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں ضعفِ بصارت عیاں تھا، چہرہ کے شکنِ زندگیوں کی تلخیوں کے آئینہ دار تھے۔ طویل علالت نے بظاہر آپ کو مضمحل کر دیا تھا، کہولت وشیب کے تمام آثار نمایاں تھے۔ ہمیں قریب پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جانے کے لیے ارشاد فرمایا اور معمولی تعارف کے بعد سلسلۂ کلام کو پھر جاری کر دیا اور کئی گھنٹے مسلسل مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ بلند شخصیتوں کی عادات وگفتار میں شاید احساس برتری کے

● بصد شکریہ، روزنامہ احسان، 30 مئی 1938، بحوالہ، صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 208۔211۔

باعث اکثر فضول تکلف اور لغوی متانت آجاتی ہے۔

حضرت علامہ کی طبع بلند حقیقت میں اس قدر بلند تھی کہ اس دنیا کی بڑی سے بڑی بلندی اور ارتفاع بھی ان کے سامنے پستی کے عام درجہ پر ہوتی تھی، اسی لیے وہ تکلف، بے معنی اور متانت بے ہودہ جو عام لیڈروں اور برخود غلط علماء کی گفتار و عادات میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں، وہاں نام کو نہ تھی، گفتگو میں سادگی اور بے تکلفی بدرجہ اتم تھی، یہاں تک کہ نیاز مندوں سے گفتگو کرتے وقت بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی نہایت ہی بے تکلف دوست سے باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت میں نہایت لطیف مزاح تھا۔ زیر لب ہنسی کے ساتھ عام گفتگو میں کئی لطائف بیان فرماجاتے تھے۔ باتیں کرتے وقت ہمیشہ بشاش نظر آتے تھے۔ گلے کی بیماریوں کے باعث آواز اگرچہ نہایت پست ہو چکی تھی لیکن طویل سے طویل گفتگو میں بھی کوئی لفظ ایسا نہ تھا جس کے مطالب واضح نہ ہو سکیں۔ اصل اقبال تصنیفات کے اقبال سے مختلف تھا، خطاب اور شوکتِ الفاظ جو حضرت کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے، گفتگو میں قطعاً ناپید تھا۔ آپ خوبصورت الفاظ اور دلفریب تراکیب سے اپنی گفتگو کو مزین کرنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے۔ آپ کی زبان نہایت سلیس ہوا کرتی تھی۔ حقیقت میں ان کی گفتار کی دلچسپی سحرِ بیان کی بجائے ان رموز و معارف میں ہوا کرتی تھی جس کا امانت داران کے سینہ کے سوا آفاق میں اور کوئی نہ تھا۔

علم و حکمت اور حقائق و معارف کے وہ ایک ایسے بحر بے کراں اور مخزن عمیق تھے جس کی اتھاہ گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ جن لوگوں کو جنابِ ممدوح سے شرف نیاز حاصل تھا صرف وہی جانتے ہیں کہ ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک قوم اور ایک عصر کی موت ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اقبال زندہ ہے لیکن اس کا کلام ہم میں موجود ہے، لیکن یقین مانیے یہ جملہ صرف انہی لوگوں کی زبان پر آسکتا ہے جو اقبال کی ذات سے متعارف نہ تھے، اقبال کو صرف انہوں نے ان کی کتابوں میں دیکھ رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی تصنیفات اس کی ذات کے بحر ناپیدا کنار سے چند قطروں کی حیثیت رکھتی ہیں، اپنی علالتِ طبع کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

ایک بار ڈاکٹروں نے فتویٰ دے دیا کہ آپ کے پیٹ میں ایک پتھر ایسی سخت چیز ہے جس کا علاج سوائے آپریشن کے اور کچھ نہیں۔ مزید یہ کہ اگر یہ آپریشن یورپ کے کسی کامیاب ڈاکٹر سے تین ماہ کے اندر اندر نہ کرایا گیا تو موت قطعی ہے۔ چنانچہ یورپ جانے کی تیاریاں

ہونے لگیں کہ اسی اثناء میں حضرت مولانا سید میر حسن (۱) کو اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ انہوں نے فوراً سیالکوٹ بلوایا اور فرمانے لگے کہ آپ تاریخ اسلام کے ماہر ہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ شاہانِ اسلام اور امرائے اسلام ایسے نازک طبع لوگ زمانہ کی آنکھوں نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔ ان ایام میں بھی یہ خوفناک امراض یقیناً موجود تھے لیکن اسلامی طب میں آپریشن کو کوئی حیثیت حاصل نہیں، یقیناً اطبائے اسلام اپنے ہی طریق علاج کے ذریعہ ان موذی بیماریوں سے نجات دلواتے ہوں گے۔ پھر کیوں نہ یورپ کے عقل باختہ لوگوں سے زندگی کو خطرہ میں ڈالنے سے قبل کسی طب اسلامی کے ماہر سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ اُنھیں کے ارشاد کے مطابق حضرت علامہ فرمانے لگے کہ میں نے دہلی کے ایک حکیم سے علاج کرایا۔ علاج کے بعد اُنھیں ڈاکٹروں سے پھر ملاحظہ کرایا جنھوں نے کہا تھا کہ آپریشن کے سوا دنیا میں اس مرض کا علاج موت ہے۔ وہ حیران ہوئے کہ اب ان کے پیٹ میں وہ سخت چیز موجود نہیں تھی۔ حضرت علامہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ انھی ایام میں ایک مشہور انگریز نے انگریزی اخبارات میں اسلامی طب کے خلاف جسے عرف عام میں غلطی سے یونانی طب کہا جاتا ہے، نہایت مذموم پروپیگنڈہ شروع کیا۔ دو تین قسطوں کے بعد آپ نے اسے کہلوا بھیجا کہ وہ اسلامی طب کو بدنام کرنے سے باز آجائے ورنہ وہ انگریزی طب کے خلاف اپنے تجربات کی بنا پر لکھنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے اور اس کا وہ اثر ہوگا جو شاید اس سے پوشیدہ نہ ہو۔ چنانچہ اس کے بعد اس شخص کی طرف سے اخبارات کو اسلامی طب کے خلاف کوئی چیز موصول نہ ہوئی۔

اس کے بعد علامہ نے اسلامی طب کے متعلق ایسی پُراز معلومات باتیں ارشاد فرمائیں کہ ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علامہ جہاں ایک بلند پایہ شاعر اور فلسفی ہیں، وہاں اسلامی طب پر بھی عبور کامل رکھتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ حکیم تھے، طبیب ہرگز نہ تھے۔ اس ضمن میں حضرت ممدوح نے کئی ایک واقعات و مشاہدات بیان فرمائے۔ افسوس ہے کہ اس مختصر سی صحبت میں سب کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ (۲)

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) علامہ کے استاد...... پیدائش: ۱۸۴۴ء۔ وفات ۱۹۲۹ء۔

# اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور طلبِ علم •

حاجی سردار محمد

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف علماء و فضلاء، خاص و عوام بلکہ طلباء میں بھی مقبول تھے۔ عزیز طلباء کو میں ذیل میں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔ ایک میں تو اُن کی علمی جستجو کا بیان ہے کہ آپ طلبِ علم میں کس طرح سرگرداں رہتے تھے کہ جب تک کسی بات کی تہہ تک نہ پہنچ جاتے، چھوڑتے نہ تھے خواہ کتنی ہی محنت کرنا پڑے۔ غالباً آپ کے مندرجہ ذیل شعر میں مسلمانوں کو اپنے اس ادبار کے زمانے میں کمیٔ علم کا احساس دلایا گیا ہے ؎

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی خزف چین لب ساحل ہوں میں

اس شعر میں نیوٹن کے قول کی جزوی ترجمانی بھی معلوم ہوتی ہے جس میں اُس نے کہا تھا کہ میری حالت اُس شخص یا بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے کنکریاں چُن رہا ہو حالانکہ سمندر کی گہرائیوں میں موتی چُھپے ہوئے ہیں۔

۱۹۲۴ء میں جب میں میڈیکل میں سیکنڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا، میڈیکل کالج کے ہوسٹل کے لڑکوں نے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب منائی۔ اس وقت ابھی نیو ہوسٹل تعمیر نہ ہوا تھا۔ حضرت علامہ اقبال کو صدارت کی دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول فرمالی۔ ڈاکٹر باٹ (مشہور سرجن) بطور مہمانِ خصوصی تشریف لائے۔ حضرت علامہ اقبال نے صدارتی تقریر میں حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ

• بعد شکریہ، رسالہ اقبال (اقبال ہوسٹل) لاہور، اقبال نمبر 1977، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 76-78۔

کا شعر پڑھا (وہ اِس وقت یاد نہیں رہا) اور فرمایا کہ میں اُس وقت تک اس کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکا جب تک میں نے طب کی فلاں کتاب (نام اب یاد نہیں رہا) کا مطالعہ نہ کر لیا۔

اس واقعہ سے میں طالب علموں کی توجہ دو باتوں کی طرف دلاتا ہوں۔ اول ہمارے بزرگوں میں بے شمار ایسے لوگ گزرے ہیں جن کے اشعار میں بھی طب یا اس قسم کے دوسرے علوم کے استعارے شامل ہوتے تھے جن کے علم کے بغیر معانی تک رسائی نہ ہوتی تھی۔

دوم حضرت علامہ باوجود اپنے علم و فضل کے حصولِ علم کے لیے ہمہ وقت مصروف رہتے، دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث: اطلبو العلم من المهد الي اللحد (علم کی جستجو اور طلب بچپن کے پالنے سے لحد تک جاری رکھو) کی عملی جھلک مسلمانوں کے ایسے ہی واقعات میں نظر آتی ہے۔

۱۹۲۸ء میں میں جب فیروز پور چھاؤنی، اسلامیہ ہائی سکول میں سائنس ٹیچر تھا، اپنے کسی کام سے لاہور آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اُسی روز رات کو سیرت النبی رحمۃ اللعالمین ﷺ کے مصنف قاضی سلمان منصور پوری (مرحوم) کی تقریر حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں ہے اور صدارت حضرت علامہ اقبال کریں گے، میں بھی پہنچ گیا۔ تقریر کا موضوع تھا:

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی کہا گیا ہے کہ دیگر انبیاء کرام میں علیحدہ علیحدہ جو خوبیاں تھیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تن تنہا جمع تھیں۔

قاضی صاحب (مرحوم) نے فرداً فرداً تمام انبیاء علیہم السلام کی علیحدہ علیحدہ خوبیاں گنوائیں اور پھر واقعات وشواہد کی روشنی میں ثابت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تن تنہا وہ تمام خوبیاں جمع تھیں جو علیحدہ علیحدہ تمام انبیاء کرام میں ایک ایک کر کے موجود تھیں۔ اس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علوِ مرتبت اور افضل الانبیاء بلکہ افضل البشر ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہ اقبال صدارتی تقریر کے لیے اٹھے اور قاضی صاحب کی تعریف تو کی کہ انہوں نے موضوع کو خوب نبھانے کی کوشش کی ہے لیکن حضور کی علوِ مرتبت پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء سابقین میں جو صفات جمع ہو گئی تھیں، وہ درجۂ کمال

میں نہ تھیں، وہ صفات الگ الگ بدرجۂ کمال پہنچ کر آنحضرت ﷺ میں جمع ہوئیں، اس طرح بشریت اپنے انتہائی کمال کو پہنچی۔

بعینہٖ یہی مضمون حضرت سید عبدالعزیز باغ مغربی نے بیان فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے مرید علامہ احمد بن مبارک سجلماسی کی کتاب ابریز میں دیا گیا ہے جس کا اردو ترجمہ خزینۂ معارف کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

# حفیظ کا اقبال•

حفیظ جالندھری

۲۱اپریل (۱۹۳۷ء) کی رات آفتاب ہمیں اندھیروں میں چھوڑ گیا تھا۔ کسی دوسری دنیا پر طلوع ہو چکا ہوگا۔ اس وقت ہمارے آسمان پر بے شمار ستارے رقص و سرود کی محفل جمائے ہوئے ہیں لیکن یہ سماں ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور کیوں نہیں بن سکتا؟ اسی لیے میں یہ حرف لکھ رہا ہوں شاید آفتاب میرے قلب پر اتر آیا ہے۔

عامی نگاہیں ستاروں کے رقص و سرود سے مسحور نور و سرور تو حاصل کرتی ہیں۔ انھیں ننھا منا بھی کہتی ہیں، چمکارتی پچکارتی ہیں مگر میرا یقین ہے کہ ہماری ان طفلانہ باتوں پر ستارے مسکراتے ہیں۔ ان کے تبسمی اشارے کہہ رہے ہوتے ہیں۔ اے خاکی نگاہو! تم لاکھ چاہو ہماری بڑائی کا تصور تم سے ممکن نہیں۔ ٹھیک ہے تمہارے لیے ہم ننھے منے ہی بہتر ہیں۔

میں کہتا ہوں: بجا ہے، اے میری تنہا رات کی بہارو، ستارو، اے حسین مہ پارو! ہم بے چارے انسان ضعیف البیان تمہاری بلندی کی وجہ سے تمہاری اصل حقیقت سمجھنے سے ابھی تک عاجز ہی سہی لیکن یہ تو ہم بھی جان چکے ہیں کہ تم کسی نہ کسی آفتاب کی روشنی لیتے ہو۔ ہم پوچھتے ہیں فقط یہ کہ تمہاری روشنی سلانے کے لیے کیوں ہے، جگانے کے لیے کیوں نہیں؟ تمہارا رقص و سرود نیند کی لوریاں کیوں دیتا ہے، آفتاب نے تو بیداری عطا کی تھی۔

برسوں گزر گئے ہماری دنیائے شعر و حکمت کا آفتاب عالمتاب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ہاں برسوں گزر گئے اور ہماری دنیائے شعر و حکمت میں ابھی تک رات ہی کی

• بصد شکریہ، نقوش، اقبال نمبر 2، 1977، بحوالہ جعفر بلوچ، مجالس اقبال، ص 114۔126۔

عملداری ہے۔

بظاہر ہمارے آسمان شعر وحکمت پر بھی بے شمار ستارے ہیں۔ یہ سب کہتے ہیں کہ ہمیں تم کو سرور عطا کرتے ہیں۔ ان میں بہت سوں کا دعویٰ ہے کہ اب اقبال کی روشنی فقط ہم ہی ہیں۔

یہ جاننے کی تو مجھے قطعاً پروانہیں کہ میں ذرہ ہوں یا ستارہ۔ اتنا جانتا ہوں کہ روشنی کی جو چند کرنیں مجھ تک میرے ظرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے آئی ہیں وہ ''بنات النعش'' سے نہیں براہ راست اسی نیر اعظم سے میں نے اخذ کی ہیں جس کا نام اقبال ہے۔

سب سے پہلے گزارش لازمی یہ ہے کہ اقبال کے رخصت ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے بے تکلف دوست تھے اور ایک دو نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ خیال ہم دیتے تھے، شعر اقبال کہہ دیتا تھا۔ مجھے اعتراف کرنا ہے کہ میں نہ تو اقبال کے حلقۂ احباب میں شامل تھا اور نہ مجھے مریدان خاص الخاص میں شمار ہونے کا کسی بھی ڈھنگ سے دعویٰ ہے۔ البتہ میں بار یاب تھا اور وہ مجھ پر مہربان تھے۔ اس مہر وکرم کا سبب میرا نیاز مندانہ خاموش انداز تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں حضرت مولانا گرامی کا شاگرد تھا اور گرامی مرحوم اور علامہ اقبال میں نہ صرف گہری دوستی تھی بلکہ ایک اور رشتہ بھی تھا۔ اقبال اپنے فارسی کلام کی زبان اور محاورے کے بارے میں حضرت گرامی سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس خط وکتابت کا بہت سا حصہ میری نظر سے گزرتا تھا جو گرامی اور اقبال میں ہوا کرتی تھی بلکہ میں لاہور آکر گرامی کے خطوط بھی پہنچایا کرتا۔ بسا اوقات جوابات بھی لے جایا کرتا تھا۔ گرامی اور اقبال کی دوستی کا دور بے شمار لطائف و ظرائف اور نکات کا حامل ہے۔ ان شاء اللہ میں صفحۂ قرطاس پر لے آؤں گا۔ یہاں تو محض وہ تاثرات و واقعات بیان کرنا ہیں جو میری ذات سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ نقوش کے طفیل یہی چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے میری طفلی کا لطیفہ ہے۔ میں آٹھ نو برس کا لڑکا تھا جب میں نے پہلے پہل ایک نظم ''نیا شوالہ'' سنی، پڑھی اور یاد کر لی۔ پھر اپنے ایک ہم مکتب براہمن زادے کو سنانے لگا:

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

''صنم'' کا لفظ ''بت'' کے معنوں میں مولود شریف کی تقریبوں میں وعظ کرنے والے

واعظوں سے سن رکھا تھا لیکن صنم کدوں کی ترکیب ان دنوں میں میری سمجھ سے باہر تھی۔ جالندھر کی دوآبی پنجابی زبان میں ''کدوں'' کے معنی ہیں ''کب'' اور اس کو ماضی کے لیے استعمال کریں تو کہیں گے: ''کدوں دے''

یہ واقعہ میرے بیتے ہوئے ابتدائی دنوں کا ہے۔ ان دنوں اس شعر کا جو مفہوم میرے ذہن میں تھا، ایک لطیفے سے کم نہیں:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

میں اپنے برہمن زاد ہمجولی کو شعر سناتا اور معنی بھی بیان کرتا جاتا کہ اے برہمن اگر تو برا نہ مانے تو میں ایک سچی بات کہہ دوں...... دیکھنا برا نہ ماننا۔ سچی بات یہ ہے کہ تیرے ناز نخرے جو تو اپنے گلی کوچے میں دکھاتا پھرتا ہے، سب بت ہیں جو مدت ہوئی پرانے (آؤٹ آف ڈیٹ) ہو چکے ہیں۔ ان کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

مزا یہ کہ وہ برہمن زادے شرما جاتے اور چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی۔ وہ زمانہ گزر گیا اور میں خود شاعری فرمانے لگا لیکن بچپن کی اس شرارتی جہالت کے مزے تو اب تک لیتا ہوں۔ ہر برہمن کو ''تیرے بت ہو گئے پرانے'' کہنے والا مجھے بھی یہی کہنے کا حوصلہ دے رہا ہے۔

علامہ اقبال کو پہلی مرتبہ میں نے ایک بہت بڑے مشاعرے میں دیکھا جہاں میں خود بھی شعر پڑھنے کے لیے جالندھر سے بلایا گیا تھا۔ الحمدللہ میں اس روز کی عمومی ذلت سے شعر نہ پڑھنے کے سبب بچ گیا تھا۔ میری عمر سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مجھے پنجابی کا بھی، اردو کا بھی اچھا شاعر بتایا جاتا تھا۔ کہاں؟ جالندھر میں اردگرد کی بستیوں اور کپورتھلہ، نکودر وغیرہ میں بھی...... جس مشاعرے کا میں ذکر کرنے والا ہوں، وہ مشاعرہ اولین جنگ عالمگیر کے آخری دور میں پنجاب پبلسٹی کمیٹی کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ ڈیڑھ دو ہزار شاعر اور ساٹھ ستر ہزار سننے والے شمالی ہندوستان کے سب سے بڑے اور وسیع (بریڈ لا) ہال لاہور میں جمع تھے۔

فضا کچھ ایسی تھی کہ جس شاعر نے بھی سٹیج پر آ کر لوگوں کے چشم و گوش پر حملہ آور ہونے کی جرأت کی، لاہور کے کالجی جوانوں کی بپھری ہوئی موج نے شاعر کو پسپا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ بعض شاعر لوگ بڑے دعوے سے ''منم منم'' کرتے ہوئے اٹھے لیکن داد میں بڑی ندامت ملی۔

بعض خود بیٹھ گئے اور بعض بٹھا دیئے گئے۔

میں تو خیر تھا ہی "نومشقا" یہ دیکھ کر بڑے بڑے گھاگ بغلیں جھانکتے دیکھے گئے۔ اسٹیج پر جانے سے انکار کرنے لگے۔ پولیس بلائی گئی۔ سامنے فرشی بنچوں پر اور گیلریوں میں ٹھنسے ہوئے ہندو، مسلمان، سکھ کالجی نوجوانوں پر ڈنڈا برسا لیکن شاعروں کی فوج کو شکست کے سوا اور کچھ نصیب نہ ہوا۔ نوجوان طالبانِ علم نے ہر شاعر کے چہرے پر انڈا یعنی صفر برسا دیا۔ پولیس ایکشن کے سبب پوری لَے کے ساتھ بجتی ہوئی تالیاں اور اجتماعی سیٹیاں تو ذرا چپ سادھ گئیں لیکن ستر ہزار بھنچے ہوئے دانتوں اور نیم وا ہونٹوں کی شوں شوں سے اس وسیع ہال کی فضا ایسی بھر گئی جیسے آبشار گر رہے ہوں یا بہشتیوں نے بیک وقت پانی کی بھری ہوئی لاکھوں مشکوں کے منہ کھول دیئے ہوں۔ جس شاعر نے بھی سر اٹھانے کی جسارت کی اس پر ہزاروں گھڑوں پانی پڑنے لگا۔

واضح رہے کہ یہ مشاعرہ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں قتل عام اور اوڈوائر کے نافذ کردہ مارشل لاء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مشاعرے کے آغاز میں تھیٹر کے گویوں کی ایک پارٹی سے ہارمونیم اور طبلہ پیٹنے کے ساتھ:

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

گوایا گیا۔ (مشہور بدنام) سر مائیکل اوڈوائر پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر صدارت فرما رہے تھے۔ حکیم احمد شجاع صاحب سرکاری اخبار حق کے ایڈیٹر اور مشہور و معروف شاعر و صاحب قلم مشاعرے میں شاعروں کو سٹیج پر بلانے اور سامعین کو مختلف طریق سے خاموش کرانے کی ناکامی کا شکار تھے۔

آخر نواب سراج الدین سائل جیسے خوش قامت اور خوش الحان کو لایا اور لہرایا گیا لیکن ان کی وجاہت کام نہ آئی۔ گمبھیر سُروں میں سائل نے انگریزوں کو اپنا اَن داتا کہہ کر لوگوں کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ ان کے سر پر کی تولو ہاری کلاہ شوں شوں کے ساتھ تالیوں، کاغذ کے بنے ہوئے پٹاخوں کی دھمک سے اور سیٹیوں کے بے زبان طوفان سے اتر گئی۔

بات یہ تھی کہ اس جنگ عالمگیر میں اس برصغیر کے اندر بسنے والوں کو فقط انگریزوں کی شکست ہی منظور نہ تھی بلکہ علانیہ انگریز کے خلاف نعرے لگانا شعار بن چکا تھا۔

مشاعرے کی یہ مضحکہ خیز حالت تھی کہ ڈاکٹر اقبال کے نام کا اعلان کیا گیا۔ لیجیے ڈاکٹر

اقبال اپنا کلام سنائیں گے۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ تمام زبانیں، تمام شور وشر تمام تالیاں، تمام سیٹیاں یکا یک چپ سادھ گئیں۔ وہ جو فرش پر جوتوں کی پھٹ پھٹ تھی، وہ جو بنچوں پر پنسلوں کی کھٹ کھٹ کھٹاک تھی، سب دم بخود۔ پانی کی سب مشکوں کے منہ بند۔

یہ تھا علامہ اقبال کا میری آنکھوں سے پہلی مرتبہ کا دیدار۔ ایک مضبوط، وجیہہ اور ادھیڑ عمر کا فرد، ترکی ٹوپی کے ساتھ اسٹیج پر آیا۔ اس نے فارسی زبان میں ایک نظم ترنم کے ساتھ سنائی۔ یہ تھا اس کا حوصلہ اور اعتماد ذات اس وقت جب ستر ہزار میں زیادہ سامعین سکھ، پنجابی کے رسیا، ہندو ہندی کے طالب، اردو تک کے دشمن، وہاں فارسی کی نظم!

یہ نظم سب نے سنی، فارسی نہ جاننے والے بے شمار تھے، جاننے والے چند سیکڑوں سے زیادہ نہ ہوں گے لیکن اقبال جب وہ نظم سنا کر بیٹھا تو تحسین کی تالیوں سے ہال ہی نہیں زمین و آسمان مسحور ہو گئے۔ آج مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہم سب جو ہجوم اندر ہجوم شاعر ہیں، ان میں اصل شاعر کون ہے۔ الحمدللہ! اتنی فارسی تو میں بھی جانتا تھا، جس نے مجھے بتایا اور میں سمجھ گیا کہ اقبال کیا ہے۔ کیوں سب سے بلند ہے۔

دوسری مرتبہ اقبال کو میں نے (امرتسر) مسلم لیگ کے اس جلسے میں شعر سناتے سنا جہاں مولانا محمد علی اور شوکت علی قید سے رہا ہو کر امرتسر آئے تھے۔ یہ وہ پر آشوب دور تھا جب غلاموں نے آزادی کی پہلی کروٹ لی تھی۔ جلیانوالہ باغ کا دانعہ ہو چکا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے اتحاد کر لیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے ہنگامہ خیز اجلاس ہو رہے تھے۔

میں جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے دو دن پہلے جالندھر کے ایک پراونشل کانگریس کے جلسے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے اصرار وایماء پر ایک نظم سنانے کے جرم میں قید کاٹ چکا تھا اور اب باغی شاعر بن رہا تھا۔

مسلم لیگ کا اجلاس اس تھیٹر ہال میں تھا جو امرتسر کے مسلم ہائی سکول کے عین قریب تھا اور جہاں میں کبھی کبھی جالندھر سے بھاگ بھاگ کر تھیٹر دیکھنے جایا کرتا تھا۔

آج اسی ہال میں جالندھر سے اپنے چند دوستوں کے ساتھ امرتسر میں وارد اور دور گیلری میں ٹھنسا ہوا جلسے کا نگران!

علامہ نے چند شعر زاغ وزغن اور باز وعقاب کے امتیاز کے لیے پڑھے، عنوان تھا: 'فلسفۂ اسیری'' مترنم آواز آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہے......سُریلا............دل میں اتر جانے والا ترنم۔

جلسہ ختم ہوا۔ اقبال بہت سے آدمیوں کے جھرمٹ میں جلسہ گاہ سے نکل رہے تھے۔ ہجوم میں گھس کر بل میں نے ان کا محض ہاتھ ہی نہیں پکڑا بلکہ لپٹ بھی گیا...... جیسے بچھڑا ہوا بیٹا اپنے باپ کو لپٹا لے۔ علامہ کچھ بولے نہیں۔ میری صورت دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ میں واقعی وارفتہ سا تھا۔ ان کے اردگرد کا ہجوم اور میں دبلا پتلا سوکھا ساکھا کم حیثیت سا لڑکا...... میری اس حرکت سے ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چلنے والا ایک سیلاب رک گیا۔

مجھے اس وقت ہوش آیا، جب بازو سے پکڑ کر کسی نے مجھے دھکیل دیا۔ آواز آئی ''اوئے ہُن بس وی کر۔'' (یعنی اب ختم بھی کر)

دیکھا تو ایک کالا بھجنگ دیو، طرے دار پگڑی باندھے میرے اور علامہ کے درمیان حائل ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چودھری شہاب الدین (مرحوم) تھے جو ان دنوں علامہ کے مریدان خاص میں گنے جاتے تھے۔ (میں نے کچھ مدت ان کو علامہ کے خلاف بھی دیکھا) اور میں نے یہ بھی جان لیا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ میری قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ پہلی مرتبہ اقبال کے قرب سے ان کے ہاتھوں دھکیلا جاؤ اور دوسری مرتبہ اپنی تصنیف کردہ سوز وساز اردو شعر کی وہ کتاب جس کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اپنی تشکیل میں پہلی مرتبہ نثر کی کتابوں کے ہوتے ہوئے اول درجہ کا انعام تجویز کیا تھا، اس کا انعام چودھری صاحب بھی نصفا نصف بٹور لیں کیونکہ انھوں نے مسدس حالی کا پنجابی ترجمہ کیا تھا اور لاہور کی میونسپل کمیٹی کے صدر اعظم بھی تھے...... جی ہاں......!

میں نے اس دور میں حضرت گرامی کی جوتیاں سیدھی کرنی شروع کی تھیں۔ گھر سے بھاگ بھاگ جانے، دوڑ دوڑ جانے کے زمانے میں لاہور پنجاب لائبریری میں مطالعہ کے مزے لینے آتا رہا۔ گرامی صاحب مجھے اقبال کے نام خطوط دے دیتے، میں پہنچا دیتا لیکن خود اپنی شعروشاعری کا تذکرہ زبان پر کبھی نہ لاتا۔ مجھے ہمیشہ اپنی جرأت والہانہ اور چودھری صاحب کے دخل در معقولات کا دل ہی دل میں شکوہ بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی میری وہ بے ہنگم، عقیدت اور طرز آداب اور چودھری صاحب کا جواب باصواب یاد تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فرما دیتے'' آؤ حفیظ

جی آؤ بیٹھو۔ یہاں چودھری صاحب نہیں ہیں۔" اور پھر چھوٹا سا قہقہہ لگا دیا کرتے۔

میری اولین شاعرانہ جسارت ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی جب میری عمر ۲۱ برس تھی۔ جالندھر سے ایک رسالے اعجازی نامی نکالنے کا ارادہ کیا۔ ملک الشعراء گرامی اس رسالے کے سرپرست تھے۔ پہلے نمبر کے لیے مجھے علامہ اقبال کے اشعار کی تمنا تھی۔ حضرت گرامی نے ایک چٹھی دی۔ میں لاہور پہنچا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ آپ انارکلی کے بالاخانہ میں متمکن تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوا تو علامہ کا خاص خادم علی بخش خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ گرامی صاحب کے چٹھی رساں کو دیکھ کر علی بخش ہمیشہ پھول کی طرح کھل جایا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب دوسرے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو مولانا گرامی کا خط دیا۔ جب تک وہ پڑھتے رہے، میں کھڑا ان کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ اس خط میں حضرت گرامی نے میری تعریف کے پل باندھ رکھے تھے۔ مجھے آسمان ادب پر چمکنے والا روشن ستارہ بتایا تھا اور ڈاکٹر صاحب کو مجھ پر ہمیشہ مہربان رہنے کی تاکید کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا:

"حفیظ جی! بیٹھ جاؤ۔ علی بخشا چالیا۔" چائے کی یہ اولین پیالی تھی جسے میں حجاب آداب کے سبب خالی بھی نہ کر سکا۔ پہلے آپ نے مجھ سے گرامی صاحب کی صحت، ان کے لاہور آنے کے ارادے پوچھے۔ پھر دوبارہ خط پر نظر ڈالی اور میری تعلیم دریافت کی۔

میں ندامتوں کے کنویں میں گر گیا۔ میرے منہ سے نکلا: "ساتویں جماعت" پاس کہنا بھول گیا۔ ادبی رسالے کا ایڈیٹر بننے کو حکیم الامت اور اس دنیا میں سب سے بڑے عالم اور شاعر قبال سے اشعار طلب کرتے وقت اپنی حیثیت علم بیان کرنے کے دوران اسکول سے بھگوڑے کا جو حال ہو سکتا تھا، اس کا اندازہ فرما سکیں تو فرمائیے۔

علامہ کی نگاہوں میں حقارت کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ فرمایا "مطالعہ جاری رکھو۔"

پھر پوچھا "تم فارسی میں شعر کہتے ہو یا اردو میں؟"

میں نے عرض کیا "اردو میں۔"

فرمایا "بہت اچھی بات ہے۔ ایک بات یاد رکھو۔ اپنے اشعار میں رونے دھونے کی تبلیغ سے باز رہنا۔ رونا رلانا بہت ہو چکا ہے، لوگوں کو ہمت اور حوصلہ درکار ہے۔"

اب میں نے اپنے رسالے اعجاز کے لیے علامہ سے اشعار کی درخواست کی۔ آپ نے بکمال مہربانی مجھے شعر فارسی کے لکھوائے جن میں سے دو مجھے اس تحریر کے وقت بھی یاد ہیں:

از خاک سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوب ہلا کوئے، ہنگامۂ چنگیزے
حرف نگفتۂ شما بر لب کود کاں رسید
از من بے زباں بگو پردگیان ساز را

گرامی صاحب کا نام لے کر رسالے کے لیے کبھی کبھی قلمی امداد کی میری درخواست جواب میں جو کچھ کہا، میرے سینے پر لکھا ہے: فرمایا:

"جس طرح کوئی زمین بہت زیادہ کاشت ہوتی رہنے سے بنجر ہو جاتی ہے، اس کو کچھ عرصے کے لیے بغیر کاشت چھوڑ دینا چاہیے تاکہ زمین کی خداداد صلاحیت اپنا مقام حاصل کرے۔ آج کل میرا یہی حال ہے، بہت کم لکھتا ہوں۔"

آہ! آج میں علامہ کے اس عذر کو خود اپنی ذات پر مسلط دیکھتا ہی نہیں بلکہ اس عذر پر خود بخود آنسو بھی بہاتا ہوں۔

مختصر یہ کہ نماز مغرب سے پہلے آپ نے مجھے گرامی کے نام ایک خط دیا۔ میں سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ یہ ملاقات مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ رسالہ تو پانچ ماہ بعد بند ہو گیا، میں کشمیر چل دیا، پلٹا تو میں نے ایک مکان فروخت کر دیا جس کی پاداش میں میرے والد صاحب نے جوتوں سے میرا دماغ پختہ کیا اور گھر سے نکال دیا کہ جاؤ شاعری ہی کرو۔

میں جالندھر چھوڑ کر لاہور آ گیا۔ یہ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ لاہور میں میری شعر و شاعری نے ہنگامے برپا کر دیئے لیکن حاضری کا شوق مجھے شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال کے پاس لے جاتا رہا اور یہ میرے لیے زادِ سفر تھا یعنی سرمایہ حیات۔

علامہ کے پاس اکثر احباب خاص ہی جمع ہوتے تھے لیکن کبھی کبھار مجھے تنہائی کی حضوری بھی نصیب ہو جاتی رہی۔ علامہ حقہ پیتے جاتے، دریائے فکر و نظر بہتا رہتا۔ اقبال جس کو بھی جوہر قابل سمجھتے اسی طرح اس کی ذہنی پرورش فرماتے تھے۔

میں ان سے کوئی سوال شاذ ہی کرتا، خاموش بیٹھا سنتا رہتا اور اور جو کچھ اور جتنا کچھ

میری سمجھ میں آتا، اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا۔

آپ نے دو مرتبہ نہ جانے کیوں مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش کی لیکن مجھ سے یہ حماقت سرزد نہ ہو سکی۔ سچ ہے میں ان دنوں پنجاب ہی کا نہیں پورے برصغیر کا ''گاماں پہلوان سخن'' تھا لیکن اقبال کے سامنے شاعر بننا اور شعر سنانا مجھے تو بے ہودگی ہی نظر آتی تھی۔

ایک مرتبہ میں، سالک صاحب، مرتضیٰ میکش اور ایک اور شاعر دوست جن کا نام لینا اب مناسب نہیں (۱) علامہ کے ہاں جا بیٹھے۔ علامہ نے ہم سب سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ میں اور سالک صاحب تو کنی کاٹ گئے مگر ہمارے ساتھی نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایک کالی سی جیبی بیاض نکالی، ایک غزل جو حضرت علامہ ہی کی غزل کے جواب میں کہی گئی تھی، سنانی شروع کر دی۔ میں، سالک اور میکش ہکے بکے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے مگر اس شیر نے پوری غزل کے ہر شعر کو مکرر، سہ مکرر بھی پڑھا اور داد بھی طلب فرمائی۔ علامہ خوب خوب فرماتے اور حقہ پیتے رہے۔ آخر شاعر صاحب نے مقطع کے بعد مطلع پھر سنا ڈالا اور کالی کتاب جیب میں ڈال لی تو ان کو تخلص سے مخاطب کرتے ہوئے علامہ نے کہا:

''صاحب! آپ نے بڑے زور کی غزل کہی ہے۔ اہل زبان سنیں گے تو بہت داد دیں گے، کہیں گے کہ آپ نے سر قوافی غزل ارشاد کی ہے۔''

ہم اپنے دوست کی حماقت پر پانی پانی ہو رہے تھے۔ اب وہاں سے جو پلٹے تو راہ میں سالک صاحب اور میکش نے ان کے لتے لینے چاہے لیکن وہ صاحب بحث پر اتر آئے۔

میں نے علامہ کی موجودگی میں انجمن حمایت اسلام کے بڑے بڑے عظیم الشان جلسوں میں شعر تو سنائے ہیں، چندہ بھی جمع کرایا ہے لیکن ان کے در دولت پر جا کر شعر تو کیا شاعری کے متعلق کچھ پوچھنے کی بھی جسارت نہ ہو سکی۔ ان کو شعر سنانے کے چند ہی واقعے میری زندگی کی یادگار ہیں۔

پہلی صورت یہ ہوئی کہ میں نے ایک نظم ''تین نغمے'' (ٹیگور، اقبال اور حفیظ) لکھی تھی۔ سب سے پہلے فارمن کرسچین کالج کے ایک بہت بڑے جلسے میں سنائی۔ بعد ازاں یہ نظم ہر جگہ سنی جانے لگی تھی۔

سر راس مسعود (مرحوم) نے جو علامہ کے والہ و شیدا تھے، علی گڑھ اور کان پور کی اردو

کانفرنسوں میں اور عظیم مشاعروں اور جلسوں میں مجھ سے یہ نظم سن کر اس کی نقل بھی مجھ سے لے رکھی تھی۔

ایک دن میں اپنے ٹھکانے پر ماڈل ٹاؤن میں تھا کہ سر راس مسعود جو کسی کام کے لیے لاہور آئے تھے، موٹر کار میں میرے غریب خانے پر آ پہنچے۔ میں اس وقت سوز و ساز کی کتابت پر نظر کر رہا تھا۔ کھڑے کھڑے مجھ سے کہا: نظم "تین نغمے" لو اور میرے ساتھ موٹر میں سوار ہو جاؤ۔

میں نے کہا، حضرت! ذرا میرے غریب خانے کو زینت بخشیے۔

جواب ملا: نہیں، آج تمھیں گرفتار کرنے ہی کو آیا ہوں۔

میں نے تعمیل ارشاد کی۔ سمجھا مجھے سر شفیع کے ہاں لے جائیں گے۔ کتابت شدہ نظم لپیٹی اور ساتھ ہولیا۔ لاہور پہنچے، دیکھا وہ سیدھے میکلوڈ روڈ علامہ کے مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

اب حجت اور حیلہ بے معنی تھا۔ سہما ہوا برآمدے میں داخل ہوا۔ علی بخش نے کرسیاں آگے بڑھائیں، سر راس مسعود بیٹھ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ سر راس مسعود نے علامہ سے کہا:

"لیجیے، آپ کے ایک بڑے مجرم کو پکڑ لایا ہوں۔" میں نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ وہ ہنسے، فرمایا: "آؤ جی، حفیظ جی! ایہہ تاں بہت برے ہتھ پھسے او" (یہ تو بہت برے ہاتھ پھنس گئے ہو۔)

جواب دیے بغیر میں گم صم بیٹھ گیا۔ خلاف معمول آج خود ہی اپنے حقے کی نے میری طرف پھیر دی۔ بھلا سر راس کو تاب کہاں۔ "اقبال! تم میرے بیٹے کا مزاج خراب کر دو گے۔" پھر میری طرف مخاطب ہوئے:

"پہلے وہ نظم سناؤ۔ تمھارے جرم کی سزا مل جائے تو حقہ بھی گڑ گڑا لینا۔"

سید سر راس مسعود کی طرف سے یہ انتہائی قدر افزائی تھی لیکن میرے حواس غائب تھے۔ میں نے عرض کیا "مجھ سے ڈاکٹر صاحب کے سامنے شعر پڑھا نہیں جاتا۔" سید راس مسعود نے کہا "منہ میری طرف کر لو۔ سمجھ لو تم علی گڑھ میں ہو۔ جس طرح وہاں سب کو تڑپاتے اور مجھے رلاتے رہے ہو۔ ہمارا اقبال بھی تو جان لے۔"

یہ مرگ مفاجات کی صورت تھی۔ نظم سنانی ہی پڑی۔ مجھے یاد ہے میں نے خود بھی اس

سے پہلے کبھی ایسا لطف اس نظم سے نہیں لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب حقہ پیتے رہے۔ نظم سنتے رہے۔ بعض شعروں کو دوبارہ بھی پڑھوایا۔ جب تک میں ٹیگور کی خواب آور شاعری کا حسن اور اس کا اثر اپنی ذات پر بیان کرتا رہا، وہ بار بار، بہت خوب کہتے رہے۔

پھر جہاں میں نے اقبال کی شاعری کو ایک تلاطم خیز دریا کہا اور ٹیگور کی پر بہار نہر یا ندی کو چھوڑ کر اس دریا کے کنارے کنارے ڈگمگاتے ہوئے چلنے کے شعر سنائے تو علامہ میری طرف حیرت اور غور سے دیکھنے لگے۔ جب یہ شعر آیا کہ:

دردکی چیخیں اٹھیں میرے شکستہ ساز سے

آب دیدہ ہوگیا دریا مری آواز سے

تو مکرر پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دیکھا سید راس مسعود ہی کی نہیں علامہ اقبال کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ یہ شعر کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد میں نے یہ شعر سنایا:

میرا نغمہ، نغمہ دریا سے کم آواز تھا

ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا

تو ڈاکٹر صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا:

''ہم رنگ بھی ہم آہنگ بھی...... بلند آواز، بلند آواز بہت شیریں۔''

نظم ختم ہوئی تو سر راس مسعود نے مجھے بغل گیر کر لیا۔ میرا ماتھا چوما، کہا ''دیکھا اقبال میرا بیٹا اللہ نے حالی کا بدل ہمیں عنایت کر دیا ہے۔''

آج یہ الفاظ لکھتے ہوئے اے کاش سر راس مسعود ہی میرے تلخ آنسوؤں کو دیکھ سکتے۔

مجھے اس تقریب سعید پر ناز کیوں نہ ہو۔ میں عمر بھر اس کو بھول نہیں سکتا۔ ہاں میں بھول نہیں سکتا کہ ایک نظم تو کم از کم میں نے زندگی میں ایسی بھی لکھی ہے جس کو اقبال نے فقط سنا ہی نہیں، پسند کیا بلکہ متاثر بھی ہوئے اور بقول تاثیر اپنی ایک نظم میں میری بندش کے الفاظ بھی استعمال فرمائے۔ (تن تیرانہ من)

نظم ہو چکی۔ میں نے حقہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چائے البتہ آج جو بسکٹوں کے ساتھ خوشی خوشی شکم رسید کر ڈالی۔

حضرت نے کہا، یہ پہلی نظم ہے جس میں کسی ہندوستانی شاعر نے میرے کلام کی روح

بیان کی ہے۔ پھر مجھ سے اس کی نقل طلب کی۔ میں نے اسی وقت بیٹھ کر نقل کر دی۔

بعد ازاں ایک دن آیا کہ علامہ نے مجھے جالندھر سے علی بخش کو بھیج کر طلب فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو آپ درد گردہ میں مبتلا تھے اور بہت ہی بیمار۔ مجھے دیکھتے ہی کراہتے ہوئے بولے ''آ گئے حفیظ جی، بیٹھ جاؤ۔''

میں بیٹھ گیا تو فرمایا ''یہ درد گردہ شاید جان لے کے رہے۔''

پھر کہا ''حفیظ! تم میرا مرثیہ لکھنا۔''

یہ سن کر میری چیخیں نکل گئیں۔ عرض کیا ''میری اور مجھ ایسے ہزاروں کی جانیں خدا آپ کی عمر میں جوڑ دے گا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کو آرام آ جائے گا۔''

وہ بہت رنجور تھے، پہلے تو خاموش رہے۔ پھر فرمایا ''کوئی نعت سناؤ۔'' میں نے ''میرا سلام لے جا'' سنائی۔ علامہ زار زار روتے رہے۔ ہر بند کو دو دو مرتبہ سنتے اور روتے۔ پھر کہا ''شاہنامہ میں سے ولادت رسول ﷺ'' کے اشعار سناؤ۔ میں نے سنائے۔ اب ان کو ذرا سکون سا ہوا۔ فرمایا ''میرے لیے دعا کرو۔''

اور بھی چند واقعات ہیں جو میں نے اپنی زیر ترتیب کتاب میرا اقبال، میرا گرامی میں وضاحت سے درج کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب میری زندگی میں شائع ہوتی ہے یا نہیں، یہ کون جانتا ہے۔ بہر حال میرے لیے اقبال سے دوری بھی حضوری ہے۔

## حواشی از جعفر بلوچ

(۱) پروفیسر محمد منور کو انٹرویو دیتے ہوئے حفیظ صاحب نے اس شاعر دوست کا نام نشتر جالندھری بتایا ہے۔

❁❁❁

# عُمرِ عزیز کے بہترین لمحے!●

حفیظ ہوشیارپوری

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل گیا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد
(اقبالؔ)

علامہ اقبال سے میری پہلی ملاقات گورنمنٹ کالج کے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ہوئی۔ ان دنوں ہمارے کالج میں احباب کا ایسا گروہ موجود تھا جسے ڈاکٹر صاحب کی تعلیم اور فلسفۂ شعر سے خاص عقیدت تھی۔ ہم عموماً شام کے وقت ''نیو ہوسٹل'' یا ''کواڈرینگل'' سے ''لارنس گارڈن'' کی سیر کا ارادہ کر کے نکلتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ راستے میں ہمارا ارادہ بدل جاتا اور ہم ڈاکٹر صاحب کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر پہنچ جاتے۔ ڈاکٹر صاحب کے ''جاوید منزل'' میں چلے جانے کے بعد بھی ایسی ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن کالج سے اس گروہ کے منتشر ہو جانے کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

''قادیانیت'' کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے پہلے اور دوسرے بیان کی اشاعت کے درمیانی عرصے میں ہم اکثر ان کے پاس جایا کرتے تھے اور گفتگو کا موضوع عام طور پر ''قادیانیت'' ہوا کرتا تھا۔ ہماری تعداد پانچ چھ کے قریب ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہر ایک کو فرداً فرداً کسی موضوع پر مفصل گفتگو کرنے کا موقع نہ ملتا تھا، اس لیے اس زمانے کی کوئی خاص بات یاد نہیں، نہ اس وقت ہمیں ان کے ''ملفوظاتِ عالیہ'' کو محفوظ کرنے کا خیال تھا کیونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ

● بصد شکریہ، محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 127۔134۔

اس سرچشمۂ علم وادب کے فیض سے ہم بہت جلد محروم ہو جائیں گے۔

اس کے بعد دو تین مرتبہ پروفیسر تبسم کے ساتھ، ایک دفعہ عرشی صاحب کے ساتھ اور اکثر تنہا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ان میں سے جو ملاقاتیں مجھے یاد ہیں اس مضمون میں ان کا ذکر کروں گا۔ تین سال کا ذکر ہے کہ میں گورنمنٹ کالج کی ''مجلسِ فلسفہ'' کے لیے ''بیسویں صدی میں فلسفہ اور سائنس'' کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ رہا تھا۔ چند کتابیں پڑھنے کے بعد مزید استفادہ کے لیے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

میں نے جدید سائنس کے فلسفیانہ اور روحانی رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اُس ''روحانیت'' کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو مغرب کے موجودہ سائنس دانوں خصوصاً سر آرتھر اڈنگسٹن اور سر جیمز جینز کی تحریروں سے منسوب کی جاتی ہے۔ اور کیا موجودہ سائنس واقعی مذہب کی طرف آرہی ہے؟

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہمیں ان حالات سے خوش نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ سائنس انیسویں صدی کی سائنس کے خلاف، جس کی بنیاد ''میکانیت'' اور ''مادیت'' پر تھی، ایک ردِ عمل ہے۔ چونکہ مادہ کی ماہیت کے متعلق اب سائنس کا نظریہ بدل گیا ہے اس لیے موجودہ انقلاب کو بعض لوگ ''روحانیت پرستی'' پر محمول کرتے ہیں۔ ممکن ہے مادہ کے متعلق پھر ہمارا نظریہ بدل جائے اور ''روحانیت آمیز'' خیالات کی یہ عارضی روخس وخاشاک کی طرح بہہ جائے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقات کے انتہائی مراحل پر سائنس کا حیرت و استعجاب سے دوچار ہو کر فلسفہ اور روحانیت کے دامن میں پناہ لینا اس کے اعترافِ عجز وشکست کی دلیل ہے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے حقیقت کو پالیا ہے۔ جہاں سائنس ختم ہوتی ہے وہاں سے فلسفہ شروع ہوتا ہے۔ اور حیرت واستعجاب، جو سائنس کا انجام ہے، فلسفہ کا آغاز ہے۔ جو کوئی نئی بات نہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک لطیفہ بھی ارشاد فرمایا، جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جب میں نے عرض کیا کہ جیمز جینز ''قادرِ مطلق'' کو ایک بہت بڑا ریاضی دان سے تشبیہ دیتا ہے اور اس کے نزدیک یہ عالم امکاں ایک ریاضی کے مسئلے کی مانند ہے جو اس کے ''ذہن لامحدود'' کی تخلیق ہے تو آپ نے ہنس کر جواب دیا کہ اس طرح آپ بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا ''شاعرِ مطلق'' ہے اور

یہ دنیا جو اس کی تخلیق ہے ایک ایسی نظم ہے جس کا مطلع اور مقطع ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔

کچھ عرصہ بعد اسی مجلس کے لیے میں ایک اور مقالہ تیار کر رہا تھا جس کا موضوع یہ تھا: دی کونسپشن آف ویلیو آف ان ماڈرن فلاسفی[ 'فلسفہ جدید میں قدر کا تصور ] اس مقالے کے بیشتر حصے کی بنیاد میرے پہلے مقالے پر تھی لیکن مختلف کتابوں کے مطالعہ کے بعد بھی ''قدر'' یعنی value کی ماہیت میرے لیے ایک معمہ تھی۔ خصوصاً یہ مسئلہ کہ ''قدر'' کا وجود ''خارجی'' ہے یا ''داخلی''۔ اس کے متعلق متضاد نظریے میری نظر سے گزرے تھے اور میں کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔

شکوک رفع کرنے کے لیے پھر علامہ سے رجوع کیا۔

میں نے اس مسئلے پر دو نظریے پڑھے تھے:

(۱) ''قدر'' ایک خارجی حقیقت کے انکشاف کا نام ہے جس کا منبع ''نفسِ انسانی'' کی حدود سے باہر ہے۔

(۲) ''قدر'' نفسِ انسانی کی تخلیق ہے اور اسے باہر اس کا وجود نہیں۔

پروفیسر رادھا کرشن نے جو پہلی بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں ان متضاد نظریوں کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

(۱) ''قدر'' اُس حقیقت کے انکشاف کا نام ہے جس کا منبع روحِ مطلق ہے۔

(۲) ''قدر'' نفسِ غیر مطلق کی استعداد کا انتہائے کمال ہے۔

میں نے علامہ مرحوم سے دریافت کیا کہ اس مسئلے پر آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

آپ نے جواب دیا کہ دونوں نظریے درست ہیں۔

میں نے کہا: ''وہ کس طرح؟''

آپ نے فرمایا کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور تصویر ان میں سے کسی ایک کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ''قدر'' کا وجود بیک وقت ''خارجی'' اور ''داخلی'' ہے اور اس کو محض ''خارجی'' یا محض ''داخلی'' تصور کرنے کی بنیاد اُس غلطی پر ہے جس میں مغرب اور مشرق دونوں شریک ہیں۔ کوئی خالص ''مادی'' یا کوئی خالص ''روحانی'' نقطۂ نظر ''قدر'' کی ماہیت کی تسلی بخش تشریح نہیں کر سکتا۔ فلسفے کی یہ روایت ہے کہ وہ عام طور پر ''روح'' اور ''مادہ'' دونوں میں سے ایک

کو حقیقت تصور کر کے دوسرے کو "سراب" سمجھ کر ترک کرتا رہا ہے۔ حالانکہ دونوں کے امتزاج کا نام "حقیقت" ہے۔ یہی روایتی غلطی مسئلہ "قدر" پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ اور اس لیے دو متضاد نظریے پیدا ہو گئے ہیں۔ "قدر" کا سرچشمہ خارجی ہے، لیکن اس کی تخلیق میں انسانی استعداد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی دو آرٹسٹ بعینہ ایک ہی چیز نہیں بنا سکتے۔ دونوں کے عمل سے اپنی اپنی انفرادیت، Individuality نمایاں ہوگی۔ اس کے برعکس دو سائنسدانوں کے لیے اپنے اپنے مشاہدات و تجربات سے ایک ہی "قانونِ فطرت" اخذ کرنا ممکن ہے۔

پھر جدید سائنس کی روشنی میں اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ دنیا ایک اتفاق ظہور ہے یا اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔ مجھے اس کے متعلق سر جیمز کے نظریوں میں تضاد نظر آتا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے علامہ سے کہا کہ جیمز کے نزدیک ایک طرف تو دنیا کسی مقصد کے پیش نظر پیدا کی گئی ہے کیونکہ وہ "خلاق"، Creator کا قائل ہے۔ اور جہاں "خلاق" کا تصور ہوگا وہاں مقصد ہونا ضروری ہے لیکن دوسری طرف وہ اس عالم امکان کی ہیبت ناک وسعتوں میں انسان کو "اسٹرونومی" کی رو سے ایک نہایت ہی غیر اہم اور بے بس چیز تصور کرتا ہے۔ "غیر محدود قوتِ تخلیق" کا عقیدہ رکھنے کے باوجود اس کا یہ نظریہ نہایت مایوس کن ہے۔

اس تضاد کے متعلق آپ نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کی متضاد باتیں تمام موجودہ سائنس دانوں کے ہاں پائی جاتی ہیں اور کہا کہ اسٹرونومی کا مطالعہ واقعی انسان کو پست ہمت کر دیتا ہے۔ میں ہمیشہ نوجوانوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔

میں بعض لوگوں سے اس قسم کی باتیں سنا کرتا تھا کہ اقبال کے فلسفے میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے تمام افکار اصل میں مغربی فلسفیوں کے افکار ہیں۔ ان مغربی فلسفیوں میں نیٹشے اور برگساں کا نام وہ اکثر لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک صاحب کہا کرتے تھے کہ اقبال نے انسانیت کی تکمیل یا خودی کے مرفع کا مسئلہ نیٹشے کے نظریۂ "فوق البشر" سے لیا ہے۔ اسی طرح "قوتِ عمل" یا "حرکت" اور "مکان و زمان" کے نظریے جو اقبال کے ہاں پائے جاتے ہیں وہ "برگساں" کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ ایک صاحب نے، جنہوں نے "شوپنہار" کے "عزم للحیات"، will to be، کا نام سن رکھا تھا اور اس لفظ کے معانی اور شوپنہار کے مایوس کن فلسفۂ حیات کے کسی خاص موضوع کے متعلق علامہ اقبال اور ایک مغربی فلسفی کے نظریے مکالمے کی صورت میں پیش کیے

جائیں تا کہ ان لوگوں پر جنہیں مغربی فلسفیوں تک رسائی کے موقعے نہیں ملتے وہ اختلافات واضح ہو جائیں جو علامہ اقبال کو فلسفۂ مغرب سے ہیں۔

چنانچہ میں نے اس سلسلے میں تین نظمیں لکھیں۔ ایک کا موضوع ''خدا'' تھا جس میں ''ذاتِ مطلق'' کے متعلق نیٹشے اور اقبال کا مطالعہ تھا۔ باقی دو نظموں ''عزم للحیات'' اور ''عزم للقوت'' میں علی الترتیب شوپنہار اور اقبال اور نیٹشے و اقبال کے مکالمے تھے۔ میں نے یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لیے علامہ سے اجازت طلب کی اور ایک خط کے ساتھ یہ تینوں نظمیں ان کی خدمت میں بذریعہ ڈاک ارسال کیں۔ اس خط کے جواب میں آپ کا یہ گرامی نامہ موصول ہوا:

لاہور، یکم نومبر ۳۶ء

جناب حفیظ صاحب السلام علیکم

''آپ کا خیال بہت اچھا ہے مگر اردو میں خیالات کا ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے آپ کو بہت غور وفکر کرنا ہوگا۔ بحیثیتِ نظم ''عزم للحیات'' اوروں سے بہتر ہے۔ آپ جس وقت چاہیں تشریف لا سکتے ہیں۔''

محمد اقبال

اس کے بعد خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا لیکن افسوس کہ گونا گوں مصروفیتوں کی وجہ سے نظموں کا یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ ہم مردہ پرستوں کی ''زود پشیمانی'' غور کے قابل ہے۔ ابھی آپ کے جسد خاکی کو سپردِ خاک بھی نہ کیا گیا تھا کہ بعض ایسے لوگوں نے بھی مرحوم کی کتابیں خرید کر یا مانگ کر پڑھنی شروع کر دیں جو اس سے پہلے آپ کے کلام سے بالکل ناآشنا تھے یا علامہ کی شاعری کے متعلق ان کی معلومات محض بانگ درا کی چند نظموں تک محدود تھیں۔ اس صورتِ حالات کے پیش نظر جب کہ ڈاکٹر صاحب ''جاوید منزل'' سے ''منزل جاوید'' کو جا چکے ہیں، ان غلط فہمیوں کا دور کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے جو ان کے فلسفیانہ افکار کے متعلق پڑھے لکھے عوام میں مشہور ہیں۔ اس لیے اس سلسلے کی طرف دوبارہ توجہ کروں گا۔

۲۱ فروری ۳۷ء کو ''انجمن اردو پنجاب'' کی طرف سے ''یومِ غالب'' منایا گیا۔ میں اس تقریب پر پیغام لینے کے لیے مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صبح کا وقت تھا۔ آپ ''جاوید منزل'' کے صحن کے مغربی کونے میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکائی

ہوئی تھیں اوران پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان میں درد یا اسی قسم کی اور تکلیف ہے۔ مجھے دیکھ کر فرمایا: ''نیازی صاحب ہیں؟'' میں نے جواب دیا ''نہیں! میں حفیظ ہوں'' یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک دو مرتبہ پہلے بھی انہیں مجھ پر نیازی صاحب کا شبہ ہوا تھا۔ خیر، میں چار پائی کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مزاج پرسی کی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ''یومِ غالب'' کے لیے پیغام کی درخواست کی۔ اس پر آپ لیٹ گئے اور کچھ دیر خاموش رہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مجھے تکلیف ہے۔ آپ جس قسم کا پیغام چاہتے ہیں خود لکھ لیں۔ میں دستخط کردوں گا۔ چنانچہ میں نے غالب کے متعلق چند اس قسم کی سطور لکھیں جو عام طور پر ایسی رسمی تقریبوں کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ اس وقت یاد نہیں رہا کہ میں نے کیا لکھا تھا۔ میں نے یہ پیغام انہیں پڑھ کر سنایا اور دستخط کے لیے ان کی خدمت میں پیش کرنے ہی کو تھا کہ آپ جوش کے عالم میں فوراً اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے ''معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غالب کا کلام پڑھا ہی نہیں۔ آپ اُس کے متعلقہ شعر سے بے بہرہ ہیں۔'' اگر یہ الفاظ کسی اور کی زبان سے نکلتے تو شاید مجھے اپنی علمی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس نہ ہوتا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں کس کے سامنے اور یہ الفاظ کس کی زبان سے نکلے ہیں، اس لیے ندامت کے احساس سے چپ رہا۔ کوئی دو منٹ کی خاموشی کے بعد آپ نے فرمایا ''لکھیے!'' آپ بولتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ پھر جو کچھ لکھا تھا پڑھ کر سنایا اور آپ نے دستخط کر دیئے۔

چونکہ یہ پیغام غالب و بیدل کے فلسفۂ شعر اور ان کے روحانی تعلق کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے اور اس کا محفوظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے اس لیے میں اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں:

''اپنا پیغام تو میں کیا دوں گا البتہ غالب کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو آج ''یومِ غالب'' منا رہے ہیں۔ ان کا پیغام یہ ہے:

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ امن است

مرزا آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت کا قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ لیکن اگر آپ اسے قبول کرنے کا فیصلہ کرلیں تو اس کے فارسی کلام کی حقیقت اور ان کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ اول یہ کہ عالم شعر میں مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ دوم کہ مرزا بیدل کا

فلسفۂ حیات غالب کے دل ودماغ پر کہاں تک موثر ہوا۔ اور مرزا غالب اس فلسفہ حیات کو سمجھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کل کے وہ نوجوان جو فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اس نقطۂ نگاہ سے غالبؔ کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھائیں گے۔''

یہ بات موجب اطمینان ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے ''غالب اور بیدل'' پر ایک محققانہ مقالہ لکھ کر علامہ کی زندگی ہی میں ان کی یہ خواہش پوری کر دی جس کا اظہار انہوں نے اپنے پیغام میں کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے اکثر ملاقات کرنے والوں نے جہاں مرحوم کو ''رقت انگیز'' کیفیت میں آنسو بہاتے دیکھا ہے وہاں آپ کے منہ سے علمی وادبی لطائف کے پھول جھڑتے بھی دیکھے ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی ایک دو ایسے لطیفے یاد ہیں:

ایک دفعہ عرشی صاحب اور پروفیسر تبسم صاحب کی معیت میں آپ کے پاس گیا تو ان مضمونوں اور نظموں کا ذکر چھڑ گیا جو آج کل اردو کے عام رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ علامہ مرحوم اس بات پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے کہ مجھے ضربِ کلیم کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

میں نے یہ شعر پڑھا اور مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کے ان اشعار کی طرف اشارہ کیا جو آپ نے ''حکمتِ فرعونی'' کے عنوان کے تحت عصرِ حاضر کے متعلق لکھے ہیں ؎

دختران اُو بزلفِ خود اسیر — شوخ چشم و خودنما خُردہ گیر
ساختہ، پرداختہ، دل باختہ — ابرواں مثلِ دو تیغ آختہ
ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر — سینۂ ماہی بہ موج اندر نگر!

اس کے بعد علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان فارسی اشعار میں آپ نے عورت کا ذکر جس والہانہ انداز میں کیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ شعر کیا آپ پر بھی صادق نہیں آتا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ اس شعر میں ''عورت شاعر پر سوار ہے''

لیکن مثنوی کے فارسی شعروں میں ''شاعر عورت پر سوار ہے'' اور دونوں میں فرق ظاہر ہے۔

مرحوم چونکہ خود نہایت خوش ذوق تھے اس لیے جب کسی سے کوئی لطیفہ سنتے تو بے اختیار داد دیتے۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے پوچھا کہ آپ اقبال کے فلسفۂ شعر کی توضیح کن الفاظ میں کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا: ''اقبال قرآن کا شاعر ہے اور شاعر کا قرآن ہے'' اس کے بعد میں علامہ سے ملا تو خلیفہ صاحب کے اس فقرے کا ذکر کیا۔ آپ بے حد محظوظ ہوئے۔ خلیفہ صاحب کا یہ فقرہ محض ادبی لطیفہ ہی نہیں بلکہ اسے علامہ کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس بعض لوگ ان کے اشعار کے معنی پوچھنے جایا کرتے تھے۔ اگر چہ ذاتی طور پر اس سلسلے میں مجھے ان کے پاس جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن مشہور ہے کہ آپ خاموش رہا کرتے تھے۔ چنانچہ قبلہ تاثیر صاحب بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ علامہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے شعروں کا مطلب آپ بیان کر کے ان کے معانی کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔ دو ایسے حضرات کو میں بھی جانتا ہوں جو آپ کے پاس اس غرض سے گئے۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے میری گزارش کے جواب میں فرمایا کہ ''یہ شعر میں نے آپ کے لیے نہیں لکھا'' دوسرے فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ارشاد کیا ''میرا کام لکھنا تھا میں لکھ چکا۔ سمجھنا آپ کا کام ہے۔''

میں اس مضمون کو ایک ایسے واقعہ کے ذکر کے بغیر ختم نہیں کر سکتا جو میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کے ''روحانی تصرف'' کی دلیل ہے۔

اب سے دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں ہوشیار پور میں اپنے برادرِ اکبر شیخ عبدالرشید صاحب راحل کے پاس بیٹھا مثنوی ''مسافر'' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ہم نظم کے آخری حصے پر پہنچے تو برادرِ محترم اس مصرع پر آ کر رک گئے ؏

''صدق و اخلاق و صفا باقی نماند''

اور دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد فرمانے لگے کہ اس مصرع کے اعداد ۱۳۵۷ھ ہیں۔ دیکھیں دو سال کے بعد اس مصرع سے کس کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ میں یہ بات سن کر ہنس دیا اور مصرع کے اعداد گنے تو واقعی ۱۳۵۷ھ تھے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ اس الہامی مصرعے

کے اندر خود مصنف کی تاریخِ وفات مضمر ہے۔ اس واقعہ کی یاد میرے ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے اس مصرعے سے تاریخ نکالی تو بھائی صاحب نے اپنے خط میں یہ قصہ یاد دلایا۔

اقبال فی الحقیقت "صدق و اخلاص و صفا" کا مجسمہ تھا۔ وہ ہماری نگاہوں سے روپوش ہے لیکن اس کی یہ صفات ہمیشہ باقی رہیں گی۔ اقبال زندۂ جاوید ہے۔ مرنے کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک موت کی بظاہر کامیاب یورش پر ایک لطیف طنز تھی۔ کیونکہ ؎

چشمِ عالم سے وہ چھپ سکتا ہے مر سکتا نہیں

❁❁❁

# علامہ اقبال کا مشورہ•

حکیم احمد شجاع

''بہر حال کسی قطعی اقدام سے پہلے میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اپنے فیصلے کو اس عظیم الشان انسان کی رائے سے مضبوط اور مستحکم کروں جس کی فطرت حق شناس کی تجلی زندگی کی کئی مشکل راہوں میں میری شمع ہدایت بن چکی تھی اور جو اس نظر فطری سعادت کے باعث بعد میں حکیم الامت کے عالی قدر لقب سے مشہور ہوا۔ لاہور آ کر میں نے پاک پتن شریف کے مسلمانوں کی یہ نفسیاتی کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روئداد سر محمد اقبال کو سنائی۔ وہ پہلے تو حسب عادت میری باتیں غور سے سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ جب میں اپنی کہانی سنا چکا تو فرمایا۔

''جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب، ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے

• بصد شکریہ، حکیم احمد شجاع، خون بہا، لاہور، ص 438-441، بحوالہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ، ص 374-376۔

مشہور ادیب اور شاعر حکیم احمد شجاع علامہ اقبال کے دیرینہ نیاز مند تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''خون بہا'' میں علامہ اقبال کے بارے میں بھی اپنی بعض یادداشتیں قلمبند کی ہیں۔ پاک پٹن کے قیام کے دوران انہوں نے وہاں فریدیہ سوس قائم کیا۔ وہ اسے علی گڑھ کے انداز پر چلانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے علامہ اقبال سے مشورہ لیا جس کی تفصیل انہوں نے کتاب کے صفحات ۴۳۸-۴۴۱ پر درج کی ہے۔

بدل گئی ہے۔ ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ ملا اور یہ درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں آگرے کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا''۔

پھر اس مفکر عظیم کی آنکھیں جواب آنسوؤں سے لبریز تھیں فضا کی وسعتوں میں کچھ دیکھنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہیں ہمیں نظر نہیں آتا۔ پھر اس طرح فضا میں نظریں گاڑے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی لے میں جو ان کے آنسوؤں کے رکے ہوئے طوفان کو اپنے اندر جذب کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ یہ اشعار پڑھنے لگے:

کل ایک شوریدہ بارگاہ نبی ﷺ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا کہ
مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
غضب ہیں یہ رہبران خود، میں، خدا تری قوم کو بچائے
مسافران رہ حرم کو کلیسا دکھا رہے ہیں

اس مرد کامل کے جذب اور شدت احساس کی اس وقت یہ کیفیت تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں اپنی ذمے داری کے احساس سے کانپ اٹھا۔ میری یہ کیفیت دیکھی تو فرمانے لگے۔

''تمہاری فطرت میں ایک جوہر ہے جو ابھی تربیت کا محتاج ہے تمہارے جوش کی شراب ابھی ناپختہ ہے اسے ذرا سی دیر اور خم میں رہنے دو کچھ دن میرے پاس اگر رہو میں تمہیں ان باتوں کو بھلا دینا سکھا دوں گا جو تم نے کتابوں میں پڑھی ہیں۔ میں مدت سے ایک دیوانے کی تلاش میں ہوں شاید تمہارا جنون میری فطرت کے رموز سے آگاہ ہو جائے''۔

میں نے یہ محبت بھرے الفاظ سنے تو سمجھ گیا کہ اقبال کا دل آج بھی میرے لئے اسی طرح شفقت سے لبریز ہے جس طرح پندرہ برس پہلے تھا۔

# حکیمِ مشرق•

حکیم محمد حسن قرشی

میں نے اپریل ۱۹۰۹ء کی ایک سہ پہر کو پہلے پہل ڈاکٹر محمد اقبال کو دیکھا۔ اس وقت وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں اپنی مشہور عالم نظم شکوہ سنا کر عوام و خواص سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی عمر ان دنوں پینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی، مگر اُس وقت بھی ان کی شہرت پنجاب کی حدود سے باہر نکل چکی تھی۔ اور پنجاب میں تو ان کا نام بچہ بچہ کی زباں پر تھا۔ میں خود بھی ابھی بچہ تھا۔ تیرہ سال کی عمر ہوگی۔ فورتھ ہائی میں پڑھتا تھا۔ اقبال کی نظم ''بلبل کی فریاد'' مجھے بے حد پسند تھی۔ مگر اس زمانے میں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ نظم اقبال کی ہے۔ البتہ ''ہندوستان ہمارا'' اور ''چین و عرب ہمارا'' نے ڈاکٹر اقبال سے وابستگی پیدا کر دی تھی اور انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں زیادہ تر ڈاکٹر اقبال کی زبان سے ان کا کلام سننے کے لیے گجرات سے آتا تھا۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسے ان دنوں علمی اور ادبی میلے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، شہزادہ ارشد گورگانی، حضرت ناظم، شاہ سلیمان سیوہاروی وغیرہ سحر بیان خطیب اور شاعر اس مجلسِ قومی میں شریک ہوتے اور پرستارانِ علم و ادب ہندوستان کے ہر گوشہ سے کھینچ کے چلے آتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال نے اس مجلس میں دو ایک ہی سال کے اندر نمایاں جگہ حاصل کر لی تھی اور یورپ سے واپسی کے بعد تو اس مجلس کی شوکت و عظمت زیادہ تر اقبال کے نغموں کی رہین منت تھی۔

• بعد شکریہ، محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 57۔66۔

۱۹۰۹ء کے سالانہ جلسہ میں سب کو اقبال کی نظم کا انتظار تھا اور جب ڈاکٹر صاحب نے اپنی سحر انگیز لَے میں نُدرتِ تخیل کے اس شاہکار کو پڑھنا شروع کیا تو تمام مجمع مسحور نظر آتا تھا۔

نظم کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں ایک جگہ اکابر کا مجمع تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ سب نظم کی تعریف کر رہے تھے۔ مولوی محبوب عالم اس وقت جسٹس کرامت حسین صاحب جج ہائیکورٹ الہ آباد کو اسٹیشن پر چھوڑنے گئے تھے۔ اس لیے نظم نہیں سن سکے۔ ان سے سب کہہ رہے تھے کہ اس مرتبہ تو اقبال نے کمال کر دیا۔ افسوس آپ نہیں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اقبال کی نظمیں ہمیشہ بلند ہوتی ہیں۔ اقبال کے مشہور عاشق خواجہ صمد ککڑ وان کے بارہ میں کہہ رہے تھے کہ میرے اقبال کا تخیل بہت بلند ہے۔

گجرات میں ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے میں لاہور مقیم رہا۔ اور پھر دہلی چلا گیا، جہاں طبیہ کالج کے ساتھ پہلے متعلم اور پھر پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہا۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر صاحب کی نظمیں سننے کے لیے انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ جوابِ شکوہ انجمن کے جلسہ میں نہیں پڑھا گیا۔ جنگِ بلقان کے متعلق موچی دروازہ کے ایک جلسہ میں سنایا گیا۔ اس جلسہ کا انتظام مولوی ظفر علی خاں صاحب نے کیا تھا۔ جلسہ میں آغا حشر مرحوم بھی شریک تھے۔ انہوں نے ایک نہایت دلچسپ تقریر میں بیان کیا کہ وہ بھی ایک نظم سنانا چاہتے تھے، مگر حضرتِ اقبال کے سامنے کسی رنگ کا جمنا مشکل ہے، اس لیے وہ نظم نہیں کہہ سکے۔ غالباً آغا صاحب کے ذہن میں اس وقت ان کی مشہور نظم ''شکریہ یورپ'' کا تخیل آ چکا تھا۔

نظم سے پہلے جو مظاہرہ ہوا، وہ اس زمانہ میں بھی اقبال کی ہر دلعزیزی کا ایک دلآویز منظر تھا۔ پہلے تو رونمائی کا سوال پیدا ہوا جس میں جوابِ شکوہ کے ہر صفحہ کو مختلف اصحاب نے خریدا۔ اس کے بعد جب نظم شروع ہوئی تو ہر طرف سے آواز بلند ہوئی: ''گا کر، گا کر'' مگر جب ڈاکٹر صاحب نے پکار کر کہا کہ اس نظم کا مفہوم گانے سے ادا نہیں ہو سکے گا تو سب خاموش ہو گئے۔ نظم کے اختتام پر اس کی سینکڑوں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ یہ تمام روپیہ بلقان فنڈ میں دیا گیا۔

شکوہ کے علاوہ میں نے اسرارِ خودی کے بعض اجزا اور خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام کو انجمن کے جلسوں میں سنا۔ خضرِ راہ کو ڈاکٹر صاحب نے نہایت درد انگیز لَے میں پڑھا تھا جس سے مجمع پر رقت کا عالم طاری تھا اور جب وہ

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو

کہہ کر خود بھی آبدیدہ ہو گئے تو تمام مجمع کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

انجمن کے جلسوں میں ڈاکٹر صاحب کی نظمیں اکثر طویل ہوا کرتی تھیں۔ بعض اوقات نظم ایک ہی مجلس میں ہوتی تھی۔ اور بعض اوقات دو جلسوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک ایسی ہی صورت میں ڈاکٹر صاحب نے یہ شعر پڑھا:

درمیانِ انجمن معشوق ہرجائی مباش
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر

اس وقت ایک جلسہ کے صدر مرزا سلطان احمد اور دوسرے جلسہ کے صدر فقیر افتخار الدین تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی نظموں کے علاوہ ان کی متعدد سیاسی اور علمی تقریریں سننے کے اتفاق ہوا۔ اُن میں سے بعض اہم علمی خطبات انگریزی میں پڑھے گئے جو اپنے بلند علمی مطالب کی وجہ سے غیر معمولی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

دہلی اور بمبئی میں مطب کرنے کے بعد صحت کی خرابی کی وجہ سے جب مجھے لاہور ٹھہرنا پڑا تو ڈاکٹر صاحب کے ہاں حاضر ہونے کا بارہا ارادہ کیا۔ ایک مرتبہ شفاالملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی مرحوم کے ساتھ جانے کی سعی بھی کی، مگر ایک صاحب راستے میں مل گئے اور یہ آرزو برنہ ہو سکی۔

ایک عرصہ کے بعد پنجاب طبی کانفرنس کی تحریک شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں پبلک جلسے ہوتے رہے جن کے صدر سر محمد شفیع مرحوم، سر عبدالقادر وغیرہ ہوتے تھے۔ ایک جلسہ کی صدارت ڈاکٹر صاحب کے متعلق تجویز کی گئی۔ یہ غالباً ۲۸ء کا ذکر ہے، کچھ اَطِبّا ان کی خدمت میں گئے اور ان سے اس تجویز کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب جلسوں کی صدارت سے ہمیشہ احتراز کیا کرتے تھے۔ اور اس زمانے میں طب یونانی کے چنداں معترف بھی نہیں تھے، اس لیے انہوں نے انکار کیا اور طب یونانی کے متعلق چند شبہات ظاہر کیے۔ ان اطبا نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اگر آپ کو ان اعتراضات کے جواب مطلوب ہیں تو ہم ایک دوسرے طبیب کو لائیں گے۔ آپ ان سے سوال و جواب کر لیں، مگر مطمئن ہونے کے بعد جلسہ کی صدارت ضرور فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے وعدہ کیا اور وقت کے تعین فرمایا۔ چنانچہ دوسرے روز اطباء کرام مجھے ساتھ لے

گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے متعدد اعتراضات کیے جن کے جوابات میں دیتا رہا۔ مگر وہ پھر برابر اعتراضات کرتے رہے۔ یہ سلسلہ دو تین گھنٹے جاری رہا۔ معلوم نہیں وہ مطمئن ہوئے یا نہیں، مگر انہوں نے صدارت کا وعدہ کر لیا۔ اس کے چند دن بعد محمڈن ہال میں جلسہ ہوا۔ میں نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر طب یونانی کی صفات اور خوبیوں پر ایک طویل تقریر کی جسے پسند کیا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں طب یونانی کی حقیقت و اہمیت کے متعلق حوصلہ افزا الفاظ ارشاد فرمائے۔ سب نے خیال کیا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی۔

اس کے بعد صرف دو ایک مرتبہ حاضری کا اتفاق ہوا اور بعض امور کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔

آج سے تین سال پہلے جب وہ میکلوڈ روڈ سے جاوید منزل چلے گئے اور ان کی بیگم صاحبہ شدید علالت میں مبتلا ہوئیں تو انہوں نے یاد فرمایا۔ بیگم صاحبہ ڈاکٹروں کے زیر علاج تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ یونانی علاج شروع کیا جائے۔ اس کے متعلق وہ چاہتے تھے کہ حکیم نابینا صاحب دہلی سے تشریف لائیں اور میں بھی مشورہ میں شریک ہوں۔ مگر اس انتظام سے پہلے ہی بیگم صاحبہ رحلت فرما گئیں۔

میں نے اس ملاقات میں محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اور اس کی بڑی وجہ حکیم عبدالوہاب کی معجز نما کامیابی ہے۔ ڈاکٹر صاحب عرصہ تک سنگِ گردہ میں مبتلا رہے اور جب ڈاکٹر حضرات ان کے لیے عملیہ (اپریشن) کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں بتلاتے تھے اور عملیہ کے لیے بھی وہ آنا جانا ضروری قرار دیتے تھے تو حکیم نابینا صاحب کے علاج سے ان کو فائدہ ہو گیا اور وہ طب یونانی کے مداح و معترف ہو گئے۔

بیگم صاحبہ کی رحلت سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کو ایک خاص تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ وہ عید کی نماز پڑھ کر آئے اور گرم دودھ ملا کر سویاں کھائیں۔ سویاں کھاتے ہی ان کی آواز بیٹھ گئی۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی مگر آواز نہ کھلی۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے حکیم نابینا صاحب کی طرف رجوع کیا جن کے علاج سے ان کو معتد بہ فائدہ ہوا۔

اگرچہ ان کو حکیم نابینا صاحب کے علاج سے بہت فائدہ تھا اور ان کی دوائیں مستقل طور پر جاری رکھتے تھے مگر کچھ عرصہ سے وہ کبھی کبھی مجھے بھی یاد فرما لیا کرتے تھے اور اپنے مرض کے

متعلق مشورہ کرلیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں خود بھی حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس وقت بھی پہلے عموماً وہ اپنے مرض، علاج اور غذا کے متعلق سوالات کرتے۔ اس کے بعد ادبی، سیاسی، مذہبی مذاکرات ہوتے۔ اس عرصہ میں ان کا قلب ضعیف معلوم ہوتا تھا۔ نبض ضعیف و رقیق تھی اور غسل خانے تک جانے سے بھی دم پھول جاتا تھا۔ اس کے ساتھ بعض اوقات دَم کشی بھی شروع ہو جاتی تھی جو درحقیقت ضعفِ قلب کا نتیجہ تھی۔

گزشتہ دسمبر سے ان کی صحت زیادہ گرنا شروع ہوئی۔ سانس کے دورے ہر رات کو ہونے لگے۔ ضعفِ قلب کی شکایت بھی ہو جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی بائیں شانے میں درد بھی ہو جاتا تھا۔ درحقیقت ان کا قلب عرصہ سے ماؤف تھا اور اب تدریجاً پھیل گیا تھا۔ اس کے ساتھ جگر بھی بڑھ گیا اور پاؤں پر ورم بھی آ گیا تھا۔

اس عرصہ میں زیادہ تر یونانی علاج ہوتا رہا جس سے ان کو نسبتاً فائدہ رہتا تھا۔ کبھی کبھی بعض اصحاب کے توجہ دلانے پر ایلوپیتھی کی طرف رجوع کرتے اور بہترین ڈاکٹر نہایت کاوش سے علاج کرتے مگر عموماً ان سے کم فائدہ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ پھر یونانی علاج کی طرف رجوع کر لیتے۔

اس عرصہ میں مجھے روزانہ حاضری کا اتفاق ہوتا رہا۔ اگر کسی وجہ سے تاخیر ہو جاتی تو سید نذیر نیازی صاحب یا میاں محمد شفیع صاحب یا میاں علی بخش کو بھیج دیتے۔ میں اکثر رات کو آٹھ نو بجے جاتا اور گیارہ بجے تک وہیں ٹھہرتا۔ بعض اوقات شام کو سات بجے اس خیال سے جاتا کہ نو بجے واپس آ جاؤں گا مگر پھر بھی گیارہ بجے تک ٹھہرا لیتے۔

شام کے علاوہ کبھی کبھی میں صبح کی سیر کرتے ہوئے چلا جاتا تھا۔ بعض اوقات رات کو تکلیف ہوتی تھی تو صبح پانچ بجے ہی شفیع صاحب کو بھیج دیتے تھے۔ اکثر مجھے جگا کر ساتھ لے جاتے۔ کبھی کبھی وہ تین بجے دن کو بھی یاد فرما لیتے تھے۔ مگر ایسا عموماً کم ہوتا تھا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ میں نے اضطراب سا محسوس کیا اور اسی وقت چلا گیا۔ اور جا کر دیکھا تو ڈاکٹر صاحب بے چین ہیں۔ اضطراب کا تذکرہ کرنے پر فرمانے لگے، میں تکلیف محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ آپ آ جائیں۔

رات کی صحبت میں چودھری محمد حسین صاحب، سید نذیر صاحب نیازی اور میاں محمد شفیع

صاحب بالالتزام ہوا کرتے تھے۔ اکثر راجہ حسن اختر صاحب بھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب اور دوسرے حضرات بھی کبھی کبھی آ جایا کرتے تھے۔ میں وہاں بیٹھ کر پہلے حالات معلوم کرتا پھر نبض دیکھتا اور جگر اور پاؤں وغیرہ کی حالت دیکھتا۔ اس کے بعد دواؤں میں مناسب ردوبدل کرتا۔ پھر ڈاکٹر صاحب مرض کے متعلق سوالات کرتے جن کے جوابات دیتا۔ وہ ہمیشہ سے بہت بڑے نقاد تھے، مگر آخری ایام میں ان کی قوتِ تنقید بڑھ گئی تھی۔ اور میں خود بھی بعض اوقات پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ خود انہیں یہ احساس تھا کہ ان کو مطمئن کرنا کسی قدر مشکل ہے۔ آخری ایام میں جب مجھے راولپنڈی جانا پڑا اور میں نے یہ تجویز کیا کہ میری غیر حاضری میں بعض میرے دوسرے اطبا ان کی نگرانی کرتے رہے تو انہوں نے کہا کہ وہ لوگ مجھے مطمئن نہیں کر سکیں گے۔

مرض کے متعلق ان کے سوالات کے جوابات دینے میں ایک بہت بڑی دِقت یہ تھی کہ ان کے مزاج میں بے حد ذکاوت اور نزاکت پیدا ہو چکی تھی اور اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کی بعض علامات کو دوسرے اسباب کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے تو وہ اس پر اس طرح جرح کرتے کہ معالج پریشان ہو جاتا۔

غذا کے متعلق ان کی حِس اور بھی لطیف ہو چکی تھی۔ تقریباً ہر دوسرے اور تیسرے روز اس امر کی خواہش کرتے تھے کہ ان کی غذا کی فہرست میں اضافہ کیا جائے:

''اگر پلاؤ کی اجازت نہیں تو کھچڑی میں کیا حرج ہے۔ یہ سادہ غذا ہے۔''

''آپ ایک دو روز کھچڑی کھا لیجئے۔''

''ہاں تو کھچڑی بھنی ہونی چاہیے جس میں گھی کافی ہو۔''

''گھی کم ہونا چاہیے۔، کیونکہ جگر بڑھا ہوا ہے۔''

''تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہوگی۔ اچھا کم از کم اس میں دہی تو ملا لیا جائے۔''

''مگر آپ کو کھانسی اور تولید بلغم کی شکایت ہے جس میں دہی مضر ہے۔''

''تو پھر اس میں کھچڑی کھانے سے نہ کھانا اچھا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کو پلاؤ اور کباب بے حد مرغوب تھے اور اسے وہ اسلامی غذا کہا کرتے تھے۔ ان کے لیے بے حد اصرار تھا اور جب لطائف الحیل سے میں انہیں ٹالتا رہا تو راولپنڈی

جانے سے پہلے انہوں نے دو تین مرتبہ اصرار کیا کہ ایک روز آپ کی دعوت یہاں ہو اور آپ میرے سامنے پلاؤ کھائیں تا کہ اگر میں پلاؤ کھا نہیں سکتا تو کم از کم کھاتے دیکھ تو لوں۔

دوا کے بارے میں بھی ان کی طبیعت بہت لطافت پسند تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ دوا خوش ذائقہ، قلیل المقدار اور سریع الاثر ہو۔ حکیم نابینا صاحب کی دواؤں کو وہ اسی لیے پسند فرماتے تھے اور مجھے بھی ان کے رجحان کی وجہ سے ایسی ہی دوائیں تیار کرانا پڑیں جن کی وہ اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے جس قدر میں قریب ہوتا گیا اس قدر ان کی عظمت کا مجھے زیادہ احساس ہوتا گیا۔ یہ امر تعجب انگیز تھا کہ فلسفہ کی گہرائیوں پر اس قدر عبور حاصل کرنے کے باوجود وہ مذہب سے اس قدر متاثر تھے۔ جب تک ان کو قریب سے نہ دیکھا جائے اس شیفتگی اور عشق کا اندازہ کرنا مشکل ہے جو ان کو اسلام اور حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا۔ ایک رات میں ان کی خدمت میں تھا کہ حضور ﷺ کی سنت کا ذکر شروع ہو گیا۔ تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے آپ نے اس کی پیروی کی بے حد تاکید فرمائی۔ ثابت کیا کہ آپ کا پیکرِ اطہر مجسم اسلام ہے۔ آپ اسلام اور ایمان کی تفسیر اور خود حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ دریافت کرنا ہو تو قرآن مجید کا ہر حرف اس کی طرف اشارہ کرتا جائے۔

قرآنِ حکیم سے ان کو بے حد شغف تھا۔ وہ بچپن سے بلند آواز سے قرآن پڑھنے کے عادی تھے۔ قرآن حکیم پڑھتے ہوئے وہ بے حد متاثر معلوم ہوتے تھے۔ آواز بیٹھ جانے کا انہیں سب سے زیادہ قلق یہ تھا کہ وہ قرآنِ عزیز بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے۔ بیماری کے دنوں میں بھی جب کبھی کسی نے قرآن حکیم کو خوش الحانی سے پڑھا تو ان کے آنسو جاری ہو گئے۔ اور ان پر لرزش کی کیفیت طاری ہو گئی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بے حد احترام کرتے تھے اور اگر جدید تعلیم یافتہ مسلمان محمد صاحب کہتا تو بہت تکلیف محسوس کرتے۔

اگرچہ جمہور ان کو زیادہ تر شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے مگر خود شاعری کو اپنے افکار کے پھیلانے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کو اس وقت بے حد تکلیف ہوتی جب کوئی ان سے دوسرے شاعروں کی طرح اشعار سنانے کی فرمائش کرتا تھا۔ میں نے ان سے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ

غالب نے یہ آپ کے لیے کہا ہے:

مانبود یم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود کواہش آں کرد گودِ فنِ ما

ان کے شعر کہنے کی حالت بھی دوسرے شعراء سے کچھ الگ تھی۔ فرماتے تھے کہ سال میں چار پانچ ماہ تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے میں بلا ارادہ شعر کہتا رہتا ہوں۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے گھر میں دوسرے کام بھی کرتا رہتا ہوں۔ مگر زیادہ تر طبیعت کا رجحان شعر گوئی کی طرف ہوتا ہے۔ ان دنوں عموماً رات کو شعر گوئی کے لیے بیدار رہنا پڑتا ہے۔ میرے استفسار کرنے پر فرمایا کہ میں نے زیادہ سے زیادہ ایک رات میں تین سو اشعار کہے ہیں۔ چار پانچ ماہ کے بعد یہ قوت ختم ہو جاتی ہے تو غور و فکر کے بعد کچھ شعر کہے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ آورد ہوتی ہے اور وہ آمد۔ دونوں طرح کے کہے ہوئے اشعار میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ اس حالت کو ڈاکٹر صاحب حمل سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور اس حالت کے اختتام کو وضع حمل سے۔

حضرت علامہ اقبال کی صحبت میں ان کی سیرت کے متعلق جو تاثرات ہوئے ان کی تفصیل ایک دوسرے مضمون کی متقضی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مرض کی حالت میں مد و جزر ہوتا رہتا تھا۔ مگر یونانی علاج سے انہیں کافی فائدہ ہو گیا تھا۔ بہ ظاہر ایک حد تک ان کی حالت امید افزا ہو گئی تھی۔ تاہم اندرونی عوارض واثرات کم و بیش باقی رہتے تھے۔ اسی عرصہ میں مجھے پنجاب کی طبی کانفرنس میں راولپنڈی جانا پڑا۔ میرے جانے کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب کی طبیعت یک بیک زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ صورت دیکھ کر انہوں نے مجھے واپس آنے کے لیے تحریر فرمایا۔ مگر میں جلد تعمیل ارشاد نہ کر سکا۔ میرے پہنچنے سے پہلے لاہور کے معروف ترین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ علاج شروع کر چکا تھا جس سے دو روز کچھ فائدہ محسوس ہوا مگر انیس اپریل کو حالت خراب ہونی شروع ہوئی۔ تھوک میں خون آنے لگا تھا اور نبض بہت خفیف ہو چکی تھی۔ شام کو جب میں نے اور تین چار ڈاکٹروں نے دیکھا تو حالت اطمینان بخش نہیں تھی۔ تاہم حواس اس طرح صحیح و سلیم تھے اور ظاہری حالت میں کوئی خاص تغیر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں اس رات بارہ بجے تک پاس بیٹھا رہا۔ چودھری محمد حسین صاحب، سید

نذیر نیازی صاحب، پروفیسر مظفر الدین صاحب اور شفیع صاحب بھی موجود تھے۔ ایک آدھ دفعہ میں نے اجازت چاہی تو فرمایا کہ ابھی ٹھہریں، اور علی بخش کو بلا کر کہا کہ حکیم صاحب کے لیے چائے بناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی میں نے کھانا نہیں کھایا۔ گھر جا کر کھانا کھاؤں گا۔ فرمانے لگے، پھر تو آپ کو کھانا کھانا چاہیے تھا۔ شفیع صاحب نے کہا کہ سب نے حکیم صاحب کو کہا تھا، مگر انہوں نے اعراض کیا۔ فرمانے لگے، یہ ہمیشہ اعراض کرتے ہیں۔ جب آخری دفعہ رکا تو میں نے علی بخش سے کہا کہ اب چائے بنوالاؤ۔ اس پر علی بخش سے فرمایا کہ میم صاحبہ نے جو بسکٹ بنائے ہیں حکیم صاحب کو کھلاؤ۔ چنانچہ میں نے اور چودھری صاحب نے اور نیازی صاحب نے چائے پی۔

اس عرصہ میں شفیع صاحب ڈاکٹروں کی تجویز کی ہوئی دوا لے آئے اور حضرت نے ایک خوراک پی لی۔ پینے کے بعد بہت بے چینی محسوس کی اور فرمانے لگے کہ مجھے متلی ہو رہی ہے۔ میں نے اسے قے کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ خون آ رہا تھا اور خطرہ تھا کہ قے سے رگ نہ پھٹ جائے، میں نے گرم پانی اور نمک کے غرغرے کرنے اور دانہ الائچی چبانے کے لیے کہا۔ اس سے بے چینی کم ہوئی۔ مگر فرمانے لگے کہ ابھی متلی باقی ہے۔ پھر میں نے اکسیر عنبری دی تو اس سے متلی رفع ہو گئی۔

اس کے بعد ایک دوسری ڈاکٹری دوا پینی تھی مگر اس سے انکار کیا اور فرمانے لگے کہ ڈاکٹری دوائیں خلافِ انسانیت ہیں، کیونکہ ان میں مریض کے ذوق کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ پھر فرمایا کہ میڈیکل سائنس زندگی کی سائنس معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہے۔ ڈاکٹر قیوم صاحب نے کہا کہ دوسری دوا خواب آور ہے، اس کا پینا ضروری ہے۔ فرمانے لگے کہ مجھے ان دونوں سے نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس میں شانہ کے درد کو روکنے والے اجزا بھی ہیں تو فرمایا کہ اگر مکسچر میں سے دافع درد اجزا کو الگ کر کے دے سکیں تو پی لوں گا کیونکہ خواب آور اجزا سے مجھے نیند نہیں آتی۔

جب ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بحال ہو گی تو میں اجازت لے کر اپنے رفقا کے ساتھ چلا آیا۔ میرے آنے کے بعد کچھ دیر تک نیند آئی۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ اور بے چینی شروع ہو گئی۔ تین بجے کے قریب میاں محمد شفیع صاحب کو میرے پاس بھیجا۔ مکان کا دروازہ بند تھا مگر باہر ملازم سویا ہوا تھا۔ شفیع صاحب نے اسے کوئی دوسرا آدمی سمجھ کر نہ جگایا اور چند آوازیں دیں۔ جواب نہ پا کر واپس چلے گئے۔ انتقال سے ایک ہفتہ پہلے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر آپ کو رات کو بلانا

ہو تو کس طرح بلایا جائے۔ میں نے کہا کہ آپ بلا تکلف آدمی بھیج دیں۔ نیچے ملازم سوتا ہے وہ جگا لے گا۔ اس پر خاموش ہو گئے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مطمئن نہیں ہوئے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ایک گھنٹی (bell) لگوالی جائے۔ میں نے اس کا انتظام کرنا چاہا، مگر بد قسمتی سے جلد ہی راولپنڈی چلا گیا۔ واپسی پر ڈاکٹروں کا علاج شروع ہو چکا تھا اس لیے اس طرف خیال نہ آیا۔ اس سے پہلے جب رات کو تکلیف ہوتی تھی تو عموماً ڈاکٹر جمعیت سنگھ صاحب کو بلا لیتے تھے۔ مگر آخری رات کو ڈاکٹری علاج ہونے کے باوجود مجھے یاد فرمایا اور جب شفیع صاحب ویسے ہی واپس چلے گئے تو فرمایا کہ افسوس قرشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔ اس کے بعد پونے پانچ بجے راجہ حسن اختر صاحب کو بلوایا اور ان سے فرمایا کہ قرشی کو بلا لائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ رات بہت دیر سے گئے ہیں اور اس وقت ان کو بیدار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس پر یہ قطعہ ارشاد فرمایا جس کی اس قدر شہرت ہو چکی ہے:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب نے اس قطعہ کا مطلب سمجھتے ہی کہا کہ میں ابھی حکیم صاحب کو لا رہا ہوں۔ وہ پانچ بج کر پانچ منٹ پر جاوید منزل سے نکلے۔ اس کے بعد فرمایا کہ پلنگ ساتھ کے کمرے میں لے چلو۔ جب اندر پلنگ لے گئے تو فرمایا کہ کندھا دبایا جائے۔ علی بخش نے شانہ دبایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ دل پر تکلیف ہے اور اس کے ساتھ ہی پانچ بج کر چودہ منٹ پر جان جاں آفریں کو سپرد کر دی۔

میں جب جاوید منزل پہنچا تو معلوم ہوا کہ طلوعِ آفتاب کے ساتھ علم و ادب کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا ہے۔ وہ اس وقت پہلو کے کمرے میں پلنگ پر اکیلے پڑے تھے۔ میں نے چادر منہ سے سرکائی اور یہ خیال کیا کہ حسب معمول ''آیئے حکیم صاحب'' کی شیریں آواز سامع نواز ہوگی۔ مگر یہ خیال ایک ایسی آرزو بن کر رہ گیا جس سے ہمیشہ دل میں خلش پیدا ہوتی رہے گی۔ آخری وقت میں اُن کے یاد کرنے کی یا تو یہ وجہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ میں ان آخری

لمحات میں اُن کے پاس رہوں یا اُن کا خیال ہوگا کہ ان خطرناک لمحات میں جواہر مہرہ، اکسیر عنبری وغیرہ استعمال کراؤں کیونکہ بارہا ایسا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی نبض بہت کمزور اور طبیعت نڈھال ہوگئی اور جواہر مہرہ وغیرہ کے استعمال سے طبیعت سنبھل گئی۔ بہر حال کوئی بھی وجہ ہو میر۔ے لیے یہ امر موجب اضطراب رہے گا کہ میں اُن کی خواہش کے باوجود آخری لمحات میں اُن کے پاس نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی موت کا ہم میں سے کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ جب رات کو گیارہ بجے تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو سب کا خیال تھا کہ ہم سب جاوید منزل جائیں گے۔ چودھری محمد حسین صاحب ان کو دن بھر کے واقعات سنائیں گے جو اُن کے جنازہ کے پُرعظمت جلوسِ جمہور کی اشکباری اور شاہی مسجد کے باغ میں اُن کی تدفین کے انتظامات پر مشتمل ہوں گے۔ راجہ احسن اختر صاحب مزار کے نقشے اور مجلسِ اقبال کی تشکیل کے متعلق اُن سے مشورہ کریں گے۔ سید نذیر نیازی صاحب اُن کو بغداد کا کوئی ایسا خواب آور افسانہ سنائیں گے جس سے وہ ہمیشہ کے لیے سکھ کی نیند سو جائیں۔ میاں محمد شفیع اور میاں علی بخش اُن کے کندھے کو اس طرح دبائیں گے کہ پھر وہ کبھی درد کی شکایت نہ کریں گے۔ اور میں اُن کی نبض دیکھ کر ایسی خوشگوار دوائیں اور لذیذ غذائیں تجویز کروں گا کہ اُن کے کام و دہن جنت کے لذائذ و نعائم کا سا لطف محسوس کرنے لگیں۔

اب بھی صبح نماز کے وقت جب کوئی جگانے کے لیے آواز دیتا ہے تو میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اٹھ بیٹھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو پھر تکلیف ہوگئی ہے جو صبح ہی صبح انہوں نے یاد فرمایا ہے۔ شفیع صاحب دوسرے تیسرے روز مطب میں آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر بدن میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی حالت بتانے کے لیے آئے ہیں۔ مگر پھر جب وہ کہتے ہیں کہ شیخ عطا محمد صاحب (ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی) بخار میں مبتلا ہیں، علی بخش کو سینہ میں درد ہے، عزیزی جاوید اقبال کو کھانسی ہے تو میں کھو سا جاتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں چھوڑ کر بادلوں سے بھی پرے بہت دُور کسی ایسے مقام پر چلے گئے ہیں جو اُن کے تخیل کی طرح بلند و بے پایاں ہے اور جہاں دوستوں کی آہ و بکا اور عزیزوں کے نالہ و شیون کا گزر نہیں ہے۔

❁❁❁

# علامہ اقبال اور سیاسیات•

حکیم محمد حسن قرشی

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب برصغیر پاک و ہند میں ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، تو مسلم لیگ، نیشنل کانگرس اور خلافت کانفرنس کے دوش بدوش اس جہاد آزادی میں شریک ہوئی۔ پھر جب ترک موالات کی تحریک کی ناکامی کے ردعمل کے طور پر ملک میں انتشار اور فسادات کا ایک دور شروع ہوا۔ اخبار سٹیٹس مین کے الفاظ میں حکومت برطانیہ نے سائمن کمیشن کی احمقانہ تجویز پیش کی۔ جس سے برصغیر پاک و ہند میں اتفاق و اتحاد اور جوش و خروش کی نئی لہر پیدا ہو گئی۔ اس وقت بھی آل انڈیا مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں سائمن کمیشن کے مقاطعہ میں بیش از بیش حصہ لیا۔ مگر اس حالت کو دیکھ کر انگریزوں کے بعض وفا کیش اصحاب مضطرب

---

• بصد شکریہ، ہفت روزہ ایشیا لاہور، ۲۴ اپریل ۱۹۶۱، بحوالہ، رحیم بخش شاہین مرتبہ، اوراق گم گشتہ، ص 103-99۔

حکیم محمد حسن قرشی ۱۸۹۶ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں طبی تعلیم کا آغاز کیا اور دہلی میں تکمیل کے بعد طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بمبئی میں مطب کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں لاہور آ کر انجمن حمایت اسلام کے طبیہ کالج سے منسلک ہو گئے۔ بیس برس تک کالج کے پرنسپل رہے۔ آپ کی متعدد طبی تصانیف میں ''جامع الحکمت'' اور ''طبی فارما کو پیا'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ پنجاب طبی کانفرنس کے بانی اور عرصہ دراز تک اس کے صدر رہے۔ حکومت ہند اور حکومت پاکستان کی تمام کردہ متعدد طبی کمیٹیوں وغیرہ کے رکن اور صدر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اقبال کے مرض الموت میں آپ نے بڑے خلوص اور محنت سے علاج معالجہ کیا۔

و بے قرار ہو گئے اور انہوں نے لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ہی ایک نامیکدہ بنانے کا ارادہ کر لیا۔ ان کی آرزو تھی کہ اس میں وہی چہل سالہ شراب اطاعت جام وفاداری میں بھر کر قوم کو پلائیں اور سائمن کمیشن کے استقبال کے لئے مسلمانوں کے دیدہ ودل کو فرش راہ بنائیں۔

اس زمانے میں پروفیسر عاشق محمد صاحب (دیال سنگھ کالج) کے والد حکیم جلال الدین مرحوم میرے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب مرحوم سے سیاسیات کے متعلق اکثر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ایک دن انہوں نے تجویز کیا کہ میں سیاسیات حاضرہ کے متعلق علامہ اقبال صاحب کا نقطہ نظر معلوم کروں۔ چنانچہ وسط دسمبر ۱۹۲۷ء کی ایک شام کو میں حکیم صاحب مرحوم کے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ علامہ مرحوم اس زمانے میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ اس کوٹھی کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ مگر اب اس کے کچھ حصے میں عمارت بن گئی ہے۔ جب ہم کوٹھی میں پہنچے تو گہری شام ہو چکی تھی۔ حضرت علامہ کھانا کھانے اندر تشریف لے گئے تھے۔ ہمیں علی بخش نے بڑے کمرے میں بٹھایا، تھوڑی دیر میں علامہ باہر تشریف لے آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی عجلت سے باہر آئے ہیں، کیونکہ اس وقت بھی وہ غذا کا لقمہ چبا رہے تھے۔ اس سے پہلے میں دو تین مرتبہ حضرت علامہ کا نیاز حاصل کر چکا تھا۔ مگر اب تک خصوصی مراسم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی مزاج پرسی کی۔ حکیم جلال الدین صاحب مرحوم نے علامہ صاحب سے کہا۔ یہ ہمارے دوست آپ سے سیاسیات حاضرہ پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت علامہ نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ فرمائیے۔

میں نے موجودہ سیاسیات پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ ظاہر ہے کہ اسلام اور غلامی میں نسبت تضاد ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں محکوم مسلمانوں کے لئے کوئی ضابطہ حیات تجویز نہیں کیا گیا۔ بلکہ غلامی کو تعزیر و عقوبت قرار دیا گیا۔ اس حالت میں مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ موجودہ جہاد آزادی میں مقدمتہ الجیش کی حیثیت سے معرکہ آراء ہوں۔

## ہندوؤں کی بالا دستی قبول نہیں

حضرت علامہ اقبال نے فرمایا۔ کہ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں پیش پیش ہونا چاہئے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا موجودہ تحریک کے نتیجے میں مسلمان آزاد ہو سکیں

گے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان انگریز کی جگہ ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔ پھر فرمایا: اس سے کیا فائدہ مرتب ہوگا۔

لیکن میں نے عرض کیا کہ اس خطرے کو رفع کرنے کے لئے مسٹر محمد علی جناح نے چودہ نکات مرتب کئے ہیں اور مولانا محمد علی جوہر کی بے تکان مساعی سے دہلی کے جلسے میں انہیں منظور کیا گیا ہے۔ بمبئی کی کانگریس کمیٹی ان کی تصدیق کر چکی ہے اور امید ہے کہ مدراس میں نیشنل کانگریس اپنے کھلے اجلاس میں ان کو منظور کر لے گی۔

علامہ مرحوم نے فرمایا۔ ہندو اس وقت اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے سنگٹھن کر رہے ہیں اور اسی لئے وہ جگہ جگہ فسادات کو ہوا دے رہے ہیں تاکہ جو بزدلی اور احساس کمتری ہندوؤں میں پایا جاتا ہے، اس کو دور کیا جائے۔ اسی لئے مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کسی سمجھوتے پر رضامند ہو سکیں گے۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ اگر مسلمان زعماء ہندو لیڈروں کی سب شرطیں مان لیں اور بلا شرط مفاہمت کی پیش کش کریں۔ جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کریں گے۔

میں نے عرض کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر انگریز سے جنگ نہیں لڑی جا سکتی اور اس جنگ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ انگریز کے کمزور ہو جانے کی صورت میں اسلامی ممالک پر انگریز کی گرفت کمزور ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ آپ کے نظریہ کے مطابق برصغیر کے مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے، جب بھی ہم ہی فائدے میں رہیں گے۔ کیونکہ ہم تو پہلے ہی سے غلام ہیں۔

## ہندوؤں کی سیاست

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ سیاست یہ ہے کہ ہندو نہیں چاہتا کہ وہ انگریز کو برصغیر سے نکال کر اس سے قطع تعلق کر لے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ خواہش ہے کہ داخلی آزادی حاصل کر کے مسلمان اور دیگر اقوام پر حکومت کرے۔ اس طرح برطانیہ مطلق کمزور نہیں ہوگا بلکہ ہندوؤں کی اعانت سے زیادہ قوی ہو جائے گا۔ اگر کانگرس برصغیر کے لئے واقعی کامل آزادی کی طلب گار ہو تو مجھے اس کا ساتھ دینے میں تامل نہ ہوگا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کی رائے میں حصول آزادی کے لئے

کیا پروگرام ہونا چاہئے۔ انہوں نے فرمایا میری رائے میں اس امر کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے کہ برصغیر کے ہر باشندے کو اسلحہ رکھنے کی اجازت ہو اور اگر کانگرس اس غرض کے لئے قانون کی خلاف ورزی کرے تو میں اس تحریک میں شامل ہوں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۹۲۷ء میں بھی علامہ مرحوم یہی چاہتے تھے کہ مسلمان برصغیر پاکستان و بھارت میں مستقل قوم کی حیثیت سے جادہ آزادی پر گامزن ہوں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ان کے دماغ میں پاکستان کے نقوش نہیں ابھرے تھے۔ مگر بین الاقوامی استقلال کا وہ تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

علامہ مرحوم نے علیٰ وجہ البصیرت یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ ہندو کسی صورت میں بھی مفاہمت کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے۔ چنانچہ نکات جناح کے متعلق مدراس کانگرس میں سمجھوتہ ہونے کے بعد نہرو رپورٹ میں ان سے رجعت، پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مفاہمت سے گریز اور آخر میں کیبنٹ اسکیم سے احتراز اس پر شاہد ہیں۔

اسی طرح ان کی یہ رائے بھی ابھی تک شرمندہ تردید نہیں ہوئی کہ ہندو انگریز سے وابستگی کا آرزومند رہے گا۔

## تین جلسے

لاہور لیگ کے سائمن کمیشن کے ساتھ تعارف کی وجہ سے ان دنوں لاہور بڑا سیاسی اکھاڑہ بن گیا تھا۔ اس سلسلے میں تین بڑے جلسے ہوئے۔ ایک جلسہ میاں سر محمد شفیع مرحوم کی صدارت میں موچی دروازے کے باہر ہوا۔ اسی میں ایک مقرر نے کہا۔ ہم سب ڈاکٹر صاحب کا احترام کرتے ہیں۔

## لم تقولون مالا تفعلون

اس کے بعد علامہ صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ میرے نادان دوست کو یہ معلوم نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی شاعر تھے۔ پھر امام کا یہ شعر پڑھا ؎

مشکوت الي وكيع لئو حفظي     فا وصا فی علی ترك العاصي

دوسرا جلسہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی صدارت میں ہوا۔ اس میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور لالہ لاجپت رائے نے تقریریں کیں۔ مولانا محمد علی نے بانگ درا کو ہاتھ میں لے کر فرمایا۔

''ہمیں تو علامہ صاحب نے ہی آزادی کا درس دیا۔ پھر آج سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کی دعوت کیوں دی جاتی ہے''؟

تیسرا جلسہ سائمن کمیشن کی آمد پر موری دروازہ کے باہر پنڈت مالویہ کی صدارت میں ہوا تھا۔ اسٹیشن پر لالہ لاجپت رائے پولیس کی لاٹھیوں سے مجروح ہو گئے تھے۔ اس لئے جلسے میں بہت جوش وخروش تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے زخمی شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا:۔

''آج کا واقعہ برطانوی اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا''۔

پنڈت مالویہ نے پھر ایک زوردار تقریر کی۔ مگر سب سے ہنگامہ خیز تقریر ایک شعلہ بیان خطیب بخاری کی ہوئی۔ انہوں نے اسٹیشن کے واقعہ کو انتہائی بے چارگی کا مظہر قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ''ہمارے احتجاج کا کیا اثر ہو سکتا ہے جب انگریز خیال کرتا ہے کہ برصغیر میں بھیڑ اور بکریاں بستی ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ جو لولا لنگڑا انگریز ہوتا ہے اسے یہاں بھیج کر ہماری تذلیل کرتے ہیں۔ اب سب سے بڑے حاکم موجودہ وائسرائے لارڈ ارون کو لیجئے۔ ان کا ایک ہی ہاتھ ہے، لینے کا ہے دینے کا نہیں۔ آپ حکومت خوداختیاری کس سے لیں گے''۔

ایک لاکھ کا مجمع جو یکسر آہ بنا ہوا کراہ رہا تھا، واہ واہ میں تبدیل ہو کر قہقہہ زار بن گیا۔

بات کوئی تو ہنسی کی نکلے
خندۂ صبح قیامت ہی سہی

# علامہ اقبال کی شخصیت کے چند پہلو

حکیم محمد یوسف حسن

## ابتدائیہ

اتفاق کی بات ہے کہ چودھویں صدی کے نامور فلسفی کے زمانہ میں، ہم بھی زندہ تھے اور ان کی بارگاہ میں کبھی کبھی ادب سے جا کر ایک طرف بیٹھ جاتے تھے۔ یہ قریباً دور سے ایک نظر دیکھنے کی جرأت ہی کہی جاسکتی ہے۔ اکثر دوسرے ہی لوگ علامہ سے سرگرم گفتگو ہوتے تھے اور ہم جیسے لوگ صرف سامعین میں ہی شمار ہوتے تھے۔

کبھی ضرورت پر، ہم بھی عرض حال کرتے ورنہ ادب سے خاموش بیٹھے رہنا ہی اپنا حصہ تھا، یہ سب کچھ اس وقت کی بات ہے جب ہم نیرنگ خیال شان وشکوہ سے نکالتے تھے اور ہماری یہ انتہائی خوش بختی تھی کہ نیرنگ خیال کے پہلے ہی پرچہ کی اشاعت پر اعلیٰ حضور نے چند سطور میں نیرنگ خیال کے طلوع ہونے کا تذکرہ فرمایا۔ یہ مختصری تحریر کتنی جامع، کتنی پر مغز اور کتنی بابرکت تھی کہ انھی چند حروف نے نیرنگ خیال کی بنیادیں مستحکم کردیں اور ہمارے حوصلوں اور ارادوں کو پرواز بخشی۔ چار سال بعد جب ۱۹۲۸ء میں ہم نے پہلا سالنامہ شائع کیا تو دوبارہ اعلیٰ حضرت نے چند سطور سے ہمارا حوصلہ بڑھایا تھا۔

اور پھر ۱۹۳۲ء میں ہم نے نیرنگ خیال کی سوچیں ایک عظیم اور عالمگیر ''اقبال نمبر'' کی اشاعت کے لیے جمع کرنی شروع کردیں۔ یہ اللہ کا کرم خاص تھا کہ اس تن ناتواں اور ذرائع محدود کے مالک نے نیرنگ خیال کا جو اقبال نمبر شائع کیا اسے کئی خصوصی مراتب حاصل ہوئے۔ نیرنگ خیال کا اقبال نمبر ۱۹۳۲ء کے زمانہ میں اپنی واحدیت اور یکتائی کا دعویدار ثابت ہوا اور اس عہد جدید میں برصغیر ہندوستان میں کوئی بھی اقبال نمبر ابھی شائع نہیں ہوا تھا، نہ دنیا کے کسی اور خطہ

میں اور کیا یہ فضل وکرم الٰہی کا ظہور نہیں کہ اولیت کے ساتھ نیرنگ خیال کے اس اقبال نمبر کو عظیم ہونے کا بھی حق حاصل ہوا۔ آج تک سو اخباروں اور رسالوں کے اقبال نمبر شائع ہو چکے ہیں اور ہر ایک کی مساعی اور کوششیں قابل تعریف وتوصیف ہیں لیکن جو عظمت ''نیرنگ خیال'' کے اقبال نمبر کو حاصل ہوئی اس تک اور کوئی نہ پہنچ سکا۔ بڑے بڑے علمائے فلسفہ اور شعروسخن کے ماہرین جب بھی اقبال کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے تو وہ اکثر نیرنگ خیال کے اقبال نمبر کے مضامین کے حوالوں سے ہی اظہار خیال فرماتے تھے۔

یہ کامیابی صرف اس عقیدت کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوئی جو علامہ اقبال کی نظر کیمیا اثر کے صلہ میں ہماری جھولی میں آن پڑی تھی۔

اقبال پر لکھنے والے اب چند نہیں چند سو بلکہ چند ہزار اہل قلم ہیں جنھوں نے شعروفن، فلسفہ ودانش، دین وملت اور تہذیب وتاریخ کی روشنی میں اقبال کے کلام کو پرکھا اور اس کی خوبیوں اور خصوصیات کو بے نقاب کیا۔ اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور رہتی دنیا تک لوگ برابر مختلف زاویوں سے اظہار خیال کرتے رہیں گے۔

میں نے اپنے اس مضمون میں دانشوروں سے پہلو بچاتے ہوئے ان کے عقیدت مندوں میں قریب سے کھڑے ہو کر جو کچھ دیکھا اس میں سے چند حقائق کے موتی یکجا کر دیئے ہیں کہ ایسی باتیں انسانی زندگی کے اہم ترین جواہر پارے ہوتے ہیں اور ایسی معمولی باتوں کی طرف شاذ ونادر ہی توجہ دی جاتی ہے اور اگر توجہ دی جاتی ہے، وہ ایک وقتی باہمی بات چیت کا موضوع ہوتی ہے جس کا کوئی ذکر بعد میں مستقل ریکارڈ کی صورت حاصل نہیں کر سکتا۔ میں نے کوشش کر کے کچھ باتیں ایک جگہ فراہم کر دی ہیں تا کہ ایک مضمون کی شکل میں جمع کر کے محفوظ کر دوں۔

نیاز مند خاکسار

حکیم محمد یوسف حسن، ایڈیٹر نیرنگ خیال راولپنڈی

۲۷ اپریل ۱۹۷۷ء (عمر ۸۷ سال)

## علامہ اقبال اور نکاح خوانی

علامہ اقبال کے چند احباب ایسے بھی تھے جن کے ہاں وہ خود بھی تشریف لے جاتے

تھے۔ ان میں نواب ذوالفقار علی خاں کا خاص مقام تھا۔ ان کا گھرانہ ان چند لوگوں میں سے تھا جہاں اقبال خود جاتے تھے۔

ایک اور بزرگ گھرانہ میاں نظام الدین مرحوم کا گھر تھا جہاں اقبال التزام کے ساتھ سال میں ایک دو مرتبہ ضرور جاتے تھے۔ ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے جب علامہ اقبال نے تاثیر کا نکاح پڑھا تھا اور اس مقصد کے لیے علامہ موصوف نظام الدین صاحب کے مکان بازار بارود خانہ تشریف لائے تھے۔

جب پروفیسر تاثیر صاحب کیمبرج یونیورسٹی (انگلستان) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری انگریزی زبان میں حاصل کر کے عازم وطن ہوئے تو کیمبرج کی ہی تعلیم یافتہ ایک انگریز خاتون جو گریجویٹ تھیں، آپ کے ساتھ نکاح پر رضامند ہو گئیں اور وہ بھی آپ کے ہمراہ لاہور آ گئی تھیں۔ ان دنوں پروفیسر تاثیر صاحب کے علم و فن کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ پروفیسر تاثیر پہلے ہندوستانی یا ایشیائی تھے جنھوں نے انگریزی زبان میں کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس زمانہ میں یہ بڑا اعزاز تھا۔

اب تاثیر صاحب اور ان کے اعزہ کو یہ مسئلہ پیش آ گیا تھا کہ اس انگلش خاتون کو کون صاحب مسلمان کریں جو اس کا نکاح بھی تاثیر صاحب سے پڑھ دیں۔ گویا اس وقت انگریزی دان عالم دین کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ حضرت علامہ اقبال کو جب اس الجھن کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ وہ خود ہی اس تقریب میں شامل ہو کر خاتون کو مسلمان بھی کریں گے اور خود اس کا نکاح بھی پڑھیں گے۔

چنانچہ ۱۹۳۶ء کے اس مبارک دن، میاں نظام الدین صاحب کے مکان واقع بارود خانہ (بازار میں) چند احباب اس تقریب سعید کے موقع پر جمع ہوئے تھے کہ حضرت علامہ اقبال بھی ایک موٹر سے اترے۔ آپ نے ململ کی کلاہ دار پگڑی سر پر رکھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں پشاور طلائی جوتی تھی۔ شلوار کُرتہ پہنے کندھوں اور جسم پر پھولدار چادر ڈالے آپ ایک کٹر ملا دکھائی دے رہے تھے۔

حضرت علامہ اقبال نے شستہ انگریزی زبان میں انگریز خاتون سے بات چیت شروع کی۔ سب سے پہلے انھیں خدا کے احکام سنائے۔ قرآن مجید کی بعض آیتوں کا ترجمہ

انگریزی زبان میں سنایا۔ اس طرح سے جب لڑکی نے اسلام کی وحدت اور رسول اکرم ﷺ کی نبوت کا دل سے اقرار کر لیا اور قرآن مجید کو ایک الہامی کتاب تسلیم کر لیا تو علامہ نے خاتون کے مسلمان ہو جانے کا اعلان کیا اور اس کے بعد علامہ اقبال نے خطبہ نکاح پڑھا۔ میاں بیوی میں ایجاب وقبول ہوا اور یہ کام بھی بخیر وخوبی سرانجام پایا۔

سب طرف سے مبارک سلامت کے نعرے بلند ہوئے تا ثیر اور دلہن کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ حاضرین کی تواضع مٹھائیوں اور مشروبوں سے ہوئی۔

## اقبال کی فارسی میں شعر گوئی کی ابتداء کیسے ہوئی

سر عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچے میں یہ حقیقت واضح فرمائی تھی کہ علامہ اقبال کی اردو شاعری سے جو فائدہ ملت اسلامیہ اور مملکت پاک و ہند کو پہنچا ہے، وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن جو کثیر فوائد علامہ کی فارسی شاعری سے دنیائے اسلام اور علمائے عالم مستشرقین اور محققین علم وفن کو حاصل ہوئے وہ لامثال ہیں اور اس کا سلسلہ دائمی ہے اور صدیوں قرنوں تک جاری رہے گا۔ اگر علامہ اقبال یہ قدم نہ اٹھاتے تو ان کی شاعری محدود ہو کر رہ جاتی۔

سر عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ علامہ اقبال کسی دوست کے ہاں مدعو تھے اور وہاں ان سے فارسی غزل کی فرمائش کی گئی۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ انہوں نے کبھی ایک آدھ شعر سے زیادہ فارسی میں نہیں کہا مگر اتفاق دیکھیے۔ اس معمولی سے واقعہ نے ان پر ایسا اثر کیا کہ وہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹتے ہوئے باقی وقت فارسی میں اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی مجھے ملے تو دو تازہ فارسی غزلیں تیار تھیں جو انھوں نے زبانی سنائیں۔ ان غزلوں کے لکھنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا احساس ہوا۔ اس لیے یورپ سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے مگر زیادہ وقت فارسی زبان میں لکھنے پر صرف کرتے تھے اور ان کی طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا اور جب فارسی راستہ یہاں تک صاف ہو گیا تو اصل کام جو ڈاکٹر صاحب کا عظیم الشان کام یا کارنامہ بننے والا تھا یعنی مثنوی اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی کی تصنیف کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اسرار خودی اور رموز بےخودی سے اقبال کا نام اقصائے عالم میں مشہور ہوا۔ ہندوستان کا علم دوست طبقہ بھی فارسی کا گرویدہ تھا۔ ایران، ترکی انگلستان اور جرمنی ممالک کے علمائے وقت

فارسی زبان سے بہرہ مند تھے۔ جس طرح یورپ میں فرانسیسی سارے یورپ کی علمی زبان ہے اسی طرح فارسی ہندوستان، افغانستان، ایران، ترکی اور عربوں کے علاوہ دنیا بھر کے علمائے فلسفہ کی زبان تھی۔ وہ اس زبان کو سمجھتے تھے۔ اس لیے فارسی میں علامہ کے فلسفہ وشعر نے انقلاب عظیم پیدا کرنے کا کام کیا۔ اس سلسلہ میں اقبال کی تینوں کتابیں اسرار خودی، رموز بے خودی، اور پیام مشرق ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فارسی نے دنیائے اسلام پر وہ اثر کیا جو اردو زبان سے کبھی پورا نہ ہو سکتا تھا۔

## فی البدیہہ نظم، شعر گوئی اور ترنم!

حضرت علامہ کے فی البدیہہ نظم یا غزل کہہ دینے کی متعدد حکایتیں موجود ہیں۔ خود ہمارے ساتھ اس ضمن میں دو واقعات پیش آئے تھے جن کا تذکرہ کر دینے سے علامہ کے مزاج اور اطوار کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً جب ہم نیرنگ خیال کا شہرہ آفاق اقبال نمبر مرتب کر رہے تھے جو دنیائے اقبال میں پہلی پیشکش کی حیثیت رکھتا تھا اور جس سے قبل اقطاع عالم پر کوئی اقبال نمبر جلوہ افروز نہ ہوا تھا اور کس قدر عزت یا اہمیت علامہ کی نظر میں ہماری ہو سکتی تھی؟ ان دنوں ہم دو تین بار فوٹو گرافر کی معیت میں آپ کی کوٹھی پر حاضر ہوئے تھے۔ تصویریں بھی کھینچی گئی تھیں جو صرف علامہ اقبال کے مختلف پوز تھے۔ ان تصوروں میں ہم عقیدت مندوں کی کسی تصویر کا سوال ہی نہ تھا، نہ ہونا چاہیے تھا مگر جب ہم نے علامہ حضور سے عرض کیا کہ حضور اقبال نمبر کے لیے آپ اپنا کلام بھی عطا فرمائیں تو آپ نے فرمایا کہ جب اقبال نمبر شائع ہو رہا ہو تو مجھے اس میں اس طرح کلام نہیں چھپوانا چاہیے اور صاف انکار کر دیا تھا۔

ایسے وقت پر انکار کر دینا، یہ علامہ اقبال کا ہی حصہ ہے ورنہ ہر بڑے سے بڑا شاعر اپنی بیاضوں سمیت ایڈیٹر صاحب کے دولت کدہ پر پہنچا ہوتا اور اپنے متعلق شائع ہونے والے نمبر کو شعروں، غزلوں اور نظموں سے بھر دیتا ہے۔

اقبال کی شعر گوئی سے متعلق عبدالقادر لکھتے ہیں:

"شیخ محمد اقبال طالب علمی سے فارغ ہو کر وہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہو

گئے تھے۔ اب دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل علمی میں بسر ہونے لگے۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ یہ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی دھن میں شعر کہتے جاتے اور دوست احباب کاغذ پنسل لیے لکھے جاتے تھے۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ حافظہ ایسا پایا تھا کہ ایک دن کے تمام اشعار دوسرے دن برابر سنا دیتے تھے اور کچھ فراموش نہ ہوتا تھا۔''

عبدالقادر مدیر مخزن نے شیخ محمد اقبال کی شعر گوئی کی جو مختصر سی کیفیت بیان کی ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں شعر و سخن کے لیے ایک دریا یا سمندر موجزن تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ کبھی ایک دن رات میں وہ اتنے شعر کہتے تھے کہ کاغذوں کے انبار لگ جاتے اور کبھی آپ مہینوں شعر گوئی کی طرف مائل ہی نہ ہوتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اشعار کسی جذبہ کے تحت ہوتے تھے اور اس جذبہ کے تحت وہ الہامی شاعری کی طرح فرفر لکھتے جاتے تھے اور جب یہ جذبہ رکا پڑا ہو تو آپ مہینوں شعر نہ کہتے تھے۔

## اقبال اور حمایت اسلام

یہ فخر صرف انجمن حمایت اسلام لاہور کو حاصل تھا کہ وہ انجمن کے ہر سالانہ اجلاس میں بڑے التزام سے اپنی نظم پڑھا کرتے تھے اور جسے سننے والوں کی تعداد دس ہزار اشخاص سے متجاوز ہوتی تھی۔ اقبال کی اس نظم کا اتنا چرچا تھا کہ لوگ سال سال بھر سے اس کے انتظار میں ہوتے تھے۔

## اقبال کی نظمیں اور ترنم

شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ''اول اول جو نظمیں پڑھی جاتی تھیں وہ تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں۔ اس طرز میں بھی ایک لطف تھا مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسہ عام میں شیخ محمد اقبال سے بہ اصرار کہا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند تھی۔ جب اقبال نے اپنا کلام ترنم سے پڑھا تو ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا۔ لوگ جھومنے لگے۔ جب حمایت اسلام کے جلسہ میں اقبال نظم پڑھتے تو دس بارہ ہزار عوام کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ جب تک نظم

پڑھی جاتی لوگ دم بخود بیٹھے رہتے تھے۔"

عبدالقادر نے شیخ اقبال کے ترنم کا مختصر اور مبہم سا تذکرہ فرمایا ہے۔ چونکہ اقبال کا کلام اتنا بلند پایہ اور موثر تھا کہ وہ کسی ترنم کا محتاج نہ تھا۔ یہ بھی صحیح ہے مگر میں بھی اس ترنم کا شیدائی اور ان مجلسوں میں بیٹھنے کا خوش قسمت سامع ہوں۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں صرف اگر ترنم کی بات کروں تو یقین کیجیے کہ ان کی آواز کا طلسم میں کسی طرح بیان نہیں کر سکتا۔ وہ کوئی روحانی یا آسمانی یا ملکوتی آواز تھی جو ہم سنتے تھے۔ ترنم کے لیے ایک طرز بیان بھی ہوتی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اتنی رسیلی موثر آواز کے لیے انھیں کسی طرز بیان و ادا کی ضرورت نہ تھی۔ نہ وہ کسی گانے والے ماہر کی طرح گاتے تھے۔ نہ ان کے چہرہ سے کسی رنگ، سلوٹ یا جدوجہد کا اظہار ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ملکوتی آواز تھی اور بلا جبر و اکراہ اور کوشش کے ظاہر ہوتی اور سننے والے کو مدہوش بنا دیتی تھی بلکہ محو حیرت۔

مجھے ساغر، سیماب، حفیظ جالندھری اور رفعت سلطان سے اور دہلی، لکھنؤ، بمبئی، حیدر آباد، کلکتہ اور بہت دور دور شاعروں کا کلام سننے کا اتفاق ہوا ہے اور ان میں بڑے بڑے نامی گرامی شاعر تھے جو اپنے طلسمی ترنم سے حاضرین کو والہ و شیدا بنا لیتے تھے مگر جو قوت اور اثر میں نے اقبال کے ترنم میں دیکھا ہے، وہ کچھ اور ہی چیز تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسانی نہیں ملکوتی آواز ہے۔ میں نے جامع مسجد میں ہزاروں آدمیوں کو زمیں پر تڑپتے لوٹتے دیکھا ہے۔ جو دیوانوں اور مدہوشوں کی طرح گریہ وزاری میں مبتلا تھے۔ ایسا اثر کسی انسانی ترنم سے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ آپ اس کو مبالغہ نہ سمجھیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

## فی البدیہہ نظم

ایک دن میں نے علامہ سے گزارش کی کہ نیرنگ خیال کے لیے کوئی نظم دیجیے۔ انہوں نے فرمایا "نئی چیز کوئی نہیں ہے۔"

میں نے یاد دلایا کہ جب میں پچھلی مرتبہ حاضر ہوا تھا تو آپ نے حاضرین کو ایک شعر سنایا تھا:

یہ پنڈت یہ بنیے، یہ مُلّا یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے

کہنے لگے: ''اور کوئی شعر نہیں ہو، او ہی ایک ہے۔'' پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا: ''اچھا لکھو۔''

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے　　یہ تکیے یہ مندر یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ بنیے یہ مُلا یہ لالے　　یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی　　وطن کیا ہے اک نوع سرمایہ داری
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری　　وہ دیکھو چلی آرہی ہے سواری
نئے جال لائے پرانے شکاری　　غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

جب فی البدیہہ اتنے اشعار لکھوا چکے تو فرمانے لگے ''اگر یہ شعر کام آسکیں تو چھاپ دیجیے مگر مجھے اس کی نقل دیتے جایئے۔''

## اقبال کی عوام میں روشناسی

ابھی ڈاکٹر محمد اقبال دنیائے ادب میں روشناس نہ ہوئے تھے اور چند ایک گھریلو کالجی مشاعروں میں ہی انھوں نے اپنا کلام سنایا تھا اور ان دنوں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جناب عبدالقادر نے مخزن کے نام سے ایک اردو ماہنامے کا آغاز فرمایا۔ یہ ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہے۔

شیخ عبدالقادر مخزن کے پہلے شمارہ کے لیے اقبال صاحب کے پاس پہنچے اور ان کا کلام طلب فرمایا۔ اقبال نے معذرت کی کہ کوئی چیز تیار نہیں ہے۔ عبدالقادر نے اصرار کیا اور کہا کہ وہ نظم جو آپ نے ہمالہ کے عنوان سے پڑھی تھی، وہی دے دیجیے۔ اقبال کا یہ خیال تھا کہ ابھی اس میں مزید اصلاحیں کریں۔ اس لیے وہ ٹالنا چاہتے تھے مگر ایڈیٹر صاحب زبردستی ہمالہ والی نظم لے آئے جو مخزن کے پہلے شمارہ کی زینت بنی۔ اس طرح پہلی بار اقبال کی شاعری پبلک سے روشناس ہوگئی۔

## ترجمان حقیقت

عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچہ میں اس بات کا بھی تذکرہ فرمایا ہے کہ بعض رسائل اور اخبارات اس عہد میں ڈاکٹر صاحب کو ترجمان حقیقت کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان کی

تصانیف کے خاص مقاصد کے تحت یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس کے مستحق تھے کہ انھیں اس لقب سے ملقب کیا جائے اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا۔

علامہ اقبال کے کلام میں بعض اشعار اور مصرعے ایسے تھے کہ ان پر ایک ایک وسیع مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ یہ بلندی اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔

## شفاخانہ حجاز!!

مجھے مہینے میں ایک دو بار علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کی سعادت ضرور حاصل ہوتی تھی۔ کبھی تاثیر و چغتائی اور عبداللہ چغتائی بھی ہمرکاب ہوتے تھے۔ ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولانا ظفر علی خاں بے حد گھبرائے ہوئے آئے۔ علامہ نے پوچھا ''خیر باشد؟''

''خیریت کہاں ہے!''

''کیوں؟''

''حکومت انگلشیہ نے ایک سرکلر لیٹر تمام اخبارات کے نام بھجوایا ہے کہ حکومت اپنی طرف سے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے پانچ لاکھ کی رقم کا عطیہ دے گی اور پانچ لاکھ روپے تمام مسلمان اس فنڈ کے لیے جمع کریں۔ دس لاکھ روپے کے سرمایہ سے حجاز میں ہسپتال بنوائے جائیں گے کیونکہ حج کے موقع پر حاجیوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔''

''پھر؟''

مولانا تو پہلے ہی پریشان اور مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا کہ ''یہ انگریزوں کی چال ہے۔ سیاست ہے۔ قوموں کا دل موہنے کی۔ افسوں گری ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس طریقہ سے دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ یہ فرنگی جہاں بھی رفاہی ادارے بنواتے ہیں، ہسپتال قائم کرتے ہیں۔ وہاں انھی ترکیبوں سے اپنے پاؤں جماتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اپنا اثر رسوخ پھیلا کر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اسی لیے اب حجاز بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے گیا۔''

یہاں تک پہنچ کر علامہ کی حالت بہت متاثر ہو گئی۔ ان پر رقت طاری ہو گئی اور مجھے خطرہ پیدا ہو گیا کہ مولانا ظفر علی اب روئے کہ روئے!!

علامہ نے فرمایا ''مولانا آپ کے شبہات میں وزن ہے اور معاملہ بے شک سنجیدہ ہے

مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ تدبیر ہو ہی جائے گی۔ آپ شام کے قریب اپنا چپڑاسی بھیج کر کچھ شعار منگوا لیجیے گا۔ میں چند شعر لکھ دوں گا۔ وہ اپنے اخبار میں چھاپ دیجیے۔ پھر نہ کوئی چندہ دے گا، نہ اس تحریک کی کوئی قدر و اہمیت ان کے دل میں پیدا ہوگی۔ نہ ہسپتال بنیں گے اور نہ فرنگی کی چال کامیاب ہوگی۔“

چنانچہ علامہ نے ”شفاخانہ حجاز“ کے نام سے ایک نظم لکھی جو روزنامہ زمیندار میں دوسرے دن صبح کے شمارے میں شائع ہوگئی۔ نظم کے چھپنے کی دیر تھی کہ تمام ممالک میں آگ لگ گئی۔ سوئی ہوئی قوم بیدار ہوگئی۔ اس نے وہ خطرات بخوبی محسوس کر لیے جو حجاز میں فرنگی ہسپتالوں سے وجود میں آسکتے تھے۔ نظم ملاحظہ ہو:

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا
کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانہ حجاز
ہوتا ہے تری خاک کا ہر ذرہ بے قرار
سُنتا ہے تو کسی سے جو افسانہ حجاز
دست جنوں کو اپنے بڑھا جیبؑ کی طرف
مشہور تو جہاں میں ہے دیوانہ حجاز
دارالشفا حوالیٔ بطحا میں چاہیے
نبض مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیے
میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمر دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا
رکھتے ہیں اہل درد مسیحا سے کام کیا

# جنگ طرابلس

علامہ اقبال کے کلام کی تاثیر کا کچھ مزید رنگ دیکھنے کی اگر آپ کے دل میں حسرت یا تڑپ ہے تو لیجیے اس سلسلہ میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں، خاکسار بھی اس کا شاہد ہے یعنی چشم دید گواہ! اس زمانے میں شاہی مسجد لاہور میں مسلمانان لاہور نے ایک جلسہ عام کیا تھا جس میں زندہ دلان پنجاب جمع ہوئے۔ اس جلسہ میں مسلمانوں کے کئی لیڈر بلکہ بھی لیڈر موجود تھے۔ سر شفیع، سر فضل حسین، میاں نظام الدین، مولوی محبوب عالم، میاں عبدالعزیز وغیرہ وغیرہ۔ اول چند ریزولیوشن پڑھے گئے۔ اس کے بعد علامہ اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ ہجوم میں پندرہ بیس ہزار مسلمان ہوں گے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ جذبات پر قابو رکھنا محال ہو رہا تھا۔ آئے دن یورپین حکومتیں اسلامی ریاستوں کو اجاڑنے اور ان پر قبضہ جمانے کے لیے کسی نہ کسی ملک پر چڑھائی کر دیتی تھیں۔ ان دنوں طرابلس اور اٹلی والوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ ان ہی ایام میں علامہ اقبال نے جنگ طرابلس پر ایک نظم لکھی تھی اور اب آپ ہی کے منہ سے سنی جانے والی تھی۔

نظم پڑھنے سے پہلے سر شفیع، میاں فضل حسین اور مولوی محبوب صاحب ایڈیٹر روزنامہ پیسہ اخبار نے بڑی آتشیں تقریریں کیں جن میں اٹلی کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا تھا۔

جب علامہ نے نظم سنانی شروع کی تو مجمع پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ اس وقت فرش پر ایک سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ اس بات کو کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں کہ علامہ کے کلام کے علاوہ آپ کی آواز میں کیسی تاثیر تھی اور دلسوز آواز میں پڑھنے والوں میں آپ کا کیا مقام تھا؟

(اس موقع پر) حضرت علامہ نے وہ نظم سنائی جو ''بانگ درا'' میں بعنوان ''حضور رسالت مآب ﷺ میں'' شامل ہے۔ علامہ نے جب پوری دلدوزی اور سرشاری سے یہ شعر پڑھا:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

تو لوگوں کا تجسس بڑھا، سوال پیدا ہوا۔ بھلا وہ کیا چیز ہوگی جو جنت میں بھی نہیں ملتی۔

اس کے بعد جب علامہ نے یہ شعر پڑھا:

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ چیخ و پکار، نالہ و بکا، آہ و فغاں سے مسجد کی دیواریں لرزنے لگیں۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ لوگ پاگلوں کی اور دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑنے لگے۔ کوٹ اتار کر پھینک دیئے، پگڑیاں اور ٹوپیاں فضا میں اچھال دیں۔ زمین پر اس طرح لوٹنے اور تڑپنے لگے جیسے کسی نے ان کو ذبح کر ڈالا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی موت کے سانحہ پر یا کسی بھی موقع پر ایسا دلخراش منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ جلسہ خود بخود برخاست ہو گیا۔ لیڈران عظام جلد از جلد سٹیج سے کھسک گئے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم مسجد سے باہر کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کا رخ قلعہ کی طرف ہو گا یا شہر کی طرف؟

اس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے دن میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حاضرین میں سے کسی نے علامہ اقبال کی شاہی مسجد میں پڑھی جانے والی نظم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا ''حضور اس دن خیریت ہی گزر گئی ورنہ پبلک کے جوش کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو گیا تھا کہ کوئی ہنگمۂ شدید نہ ہو جائے۔''

اس پر علامہ نے فرمایا۔ ''اچھا ہی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے جذبات کو قابو میں کر لیا ورنہ کسی بھی ایک شعر سے آگ لگائی جا سکتی ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ ابھی میری قوم تیار نہیں ہے۔''

اس سلسلہ میں وہ فوٹو بھی پیش کر رہا ہوں جو اس موقع پر مشہور ناول و افسانہ نگار میاں ایم اسلم نے لیا تھا جسے اس حقیقی واقعہ نگاری کا ایک جزو سمجھنا چاہیے۔ یہ فوٹو بے حد اہم دستاویز ہے۔

## حکومت انگلشیہ کے ریاستوں سے خصوصی تعلقات

قیام پاکستان سے قبل جب سلطنت انگلشیہ کو ہندوستان پر واحد حاکمانہ اختیارات تھے تو ملک کے مختلف صوبوں، ریاستوں اور قوموں سے مختلف قسم کے تعلقات بھی ہوتے تھے اور انگریز کی دانش مندی ہمیں جگہ بہ جگہ (جا بہ جا؟) ان خصوصی معاہدوں میں نظر آتی تھی جہاں انگریز بہادر ریاستوں کو اس انداز میں اپنا غلام بنائے رکھتا تھا جس سے خود مختار ریاست کی حکمرانی میں

انگریز کا عمل دخل قائم ودائم رہتا تھا۔ چنانچہ بعض والیان ریاست سے یہ معاہدہ کچھ اس شکل میں تھا کہ ریاست کے وزیر اعظم کی تقرری وائسرائے ہند کے حکم نامہ کے ماتحت ہوا کرے گی اور وہ جس شخص کو چاہیں گے ریاست کا وزیر اعظم مقرر کریں گے۔

اس طرح سے نامزد ہونے والا وزیر اعظم بظاہر ریاست کے نواب کے ماتحت ہوتا تھا لیکن در پردہ وہ وائسرائے ہند کے تمام احکام کے مطابق ریاست کا نظم ونسق چلاتا تھا اور وزیر اعظم کے ہاتھ میں نواب ایک کٹھ پتلی رہ جاتا تھا۔

چنانچہ ریاست بہاولپور میں جو بھی وزیر اعظم بنا کر بھیجا جاتا تھا، وہ وائسرائے بہادر کے حکم کے ماتحت متعین ہوکر بہاولپور جاتا اور ریاست پر انگریزی حکمرانی کا ذریعہ کار بنتا تھا۔

جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں ان دنوں ریاست بہاولپور میں جو صاحب وائسرائے ہند کی طرف سے نامزد وزیر اعظم تھے، ان کی اور نواب صاحب بہاولپور کی آپس میں بنتی نہ تھی وہ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ پہلے تو خود نواب صاحب وائسرائے بہادر کو شکایتیں لکھتے رہے کہ موجودہ وزیر اعظم سے میری جان چھڑائی جائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔ مجبور ہو کر نواب صاحب کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کو جو بیرسٹر بھی تھے، اس مقصد کے لیے اپنا وکیل بنانا پڑا۔ ان کے بعض رفقا نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ ممکن ہے سر اقبال کی وکالت سے ان کی مقصد براری ہو جائے۔ چنانچہ نواب صاحب کا ایک آدمی علامہ کے پاس پہنچا اور صورتحال بیان کی۔ ڈاکٹر صاحب نے معاملہ کو بحیثیت بیرسٹر جانچا۔ ہامی بھر لی اور چار ہزار فیس مقدمہ کی طے پائی۔

چنانچہ علامہ لاہور سے دہلی روانہ ہوئے اور اسٹیشن سے سیدھے وائسرائے بہادر کے دفتر میں جا پہنچے اور سیکرٹری کو اپنا کارڈ دیا۔

سیکرٹری نے کہا کہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر ملاقاتی اپنا نام رجسٹر میں لکھتا ہے۔ اس کے بعد رجسٹر اندر بھجوایا جاتا ہے۔ جسے بلانا مقصود ہوتا ہے اسے بلا لیا جاتا ہے، لہٰذا آپ بھی کارڈ دینے کی بجائے رجسٹر میں اپنا نام لکھیں۔

اس پر اقبال نے کہا ''اگر وائسرائے میرے کارڈ پر ملنا نہ چاہیں گے تو میں واپس چلا جاؤں گا مگر عام لوگوں کی طرح رجسٹر میں نام نہ لکھوں گا۔''

مجبوراً سیکرٹری کو کارڈ لے کر اندر جانا پڑا۔ وائسرائے نے کہا، میں ان سے ملوں گا،

نہیں بٹھایا جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے ملاقاتیوں کے کمرے میں آئے۔ ملاقات ہوئی، ائسرائے نے آمد کا سبب پوچھا'' کیسے آنا ہوا؟''

علامہ اقبال نے کہا کہ وہ بحیثیت ایڈووکیٹ ریاست بہاولپور کے نواب صاحب کی طرف سے پیش ہوئے ہیں۔ ریاست کا وزیر اعظم آپ کے حکم سے ریاست میں متعین تو ہے مگر اب صاحب اور وزیر اعظم میں تعلقات خوشگوار نہیں ہیں جس سے نواب صاحب کو بھی تکلیف ہے اور کاروبار سلطنت میں بھی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

وائسرائے بہادر نے فرمایا مگر یہ سب کچھ ضابطہ کے مطابق ہے اور نواب صاحب کو سے پسند کرنا چاہیے۔ علامہ اقبال نے کہا کہ معاملہ تو بالکل معمولی ہے۔ حکمران کی سیاست کا منتہا یہ ہونا چاہیے کہ وائسرائے اور ریاست کے درمیان تعلقات انتہائی خوشگوار ہوں۔ ان تعلقات کی سلامتی اور ترقی سے حکومت انگلشیہ اور حکومت بہاولپور کے تعلقات میں روز افزوں اضافہ ہوگا مگر وزیر اعظم کی دراندازی اور نا قبولیت سے اس عظیم مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ آپ کو اپنی پالیسی کی کزی قوت بحال رکھنے کے لیے ایسے فروعی معاملات پر وزیر اعظم کی حمایت ترک کر دینی ہیے۔ اگر آپ اس وزیر اعظم کو وہاں سے تبدیل فرما دیں اور کوئی دوسرا شخص ریاست میں یر اعظم مقرر کر دیں جو نواب صاحب کو بھی پسند ہو تو اس سے حکومت انگلشیہ کے وقار کو کوئی ضعف نہیں پہنچتا بلکہ استحکام ملتا ہے۔ اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں اور وائسرائے بہادر نے وعدہ مالیا کہ وہ وزیر اعظم بہاولپور کی تبدیلی کے احکام جاری کر دیں گے۔

وائسرائے کو ایک تو علامہ اقبال کے مرتبے کا علم تھا۔ دوسرے علامہ نے بات بھی کچھ اس ڈھب سے کی تھی کہ وائسرائے کو انکار کرتے نہ بنی۔

جب یہ بات طے ہو گئی تو وائسرائے نے کہا کہ'' آپ پرسوں میرے ساتھ ڈنر کھائیں۔''

علامہ نے فرمایا'' مجھے تو آج واپس جانا ہے۔''

''اچھا تو کل سہی۔''

''مگر میں تو آج ہی واپس جاؤں گا، کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔''

وائسرائے نے کہا ''میری خواہش تھی کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی خوشی حاصل کرتا۔''

''اگر یہ خواہش ہے تو کھانا آج بھی کھا سکتے ہیں۔''

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یہ علامہ اقبال تھے جو وائسرائے کی بات کو رد کرنے یا اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی ہمت رکھتے تھے ورنہ کسی بڑے سے بڑے افسر لیڈر یا والئی ریاست کو مجال نہ تھی کہ وہ وائسرائے کے حکم کے خلاف زبان بھی کھول سکتا۔

چنانچہ وائسرائے بہادر نے علامہ کو دوسرے کمرے میں جگہ دی اور وہیں دوپہر کے بعد علامہ کے ساتھ وائسرائے نے ڈنر کھایا اور علامہ اسی شب لاہور واپس چلے آئے۔

## حسن کارکردگی مگر حرص ولالچ (کذا) سے پاک:

نواب بہاولپور اور وائسرائے کے درمیان جو صورت پیدا ہو گئی تھی، اس میں علامہ اقبال نے جس خوبصورتی سے کامیابی حاصل کی تھی، وہ آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ اب اتفاق سے میں اس دن بھی علامہ موصوف کے پاس موجود تھا۔ چودھری محمد حسین (ایم اے) جو پریس برانچ لاہور کے سپرنٹنڈنٹ تھے وہ بھی موجود تھے کہ تار چپڑاسی سائیکل پر آیا اور اس نے علامہ کے نام کا تار دیا تو چودھری محمد حسین نے دستخط کر کے تار لے لیا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''پڑھیے، کس کا تار ہے؟''

چودھری صاحب نے فرمایا: ''نواب صاحب بہاولپور کی طرف سے آیا ہے۔ انھوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ملاقات کے لیے بہاولپور آیئے۔''

ڈاکٹر صاحب ایک آدھ منٹ خاموش رہے۔ پھر آپ نے کہا ''کیا نواب صاحب نے مجھے اپنا ملازم سمجھ لیا ہے؟''

چودھری صاحب نے پوچھا ''کیا جواب دوں نواب صاحب کو؟''

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''لکھ دیجیے، فرصت نہیں۔''

اس تار کا پس منظر کسی دوسرے موقع پر چودھری صاحب نے مجھے سنایا تھا جس میں ریاست بہاولپور کی وکالت کرنا، دہلی جانا، وائسرائے سے ملاقات کرنا ریاست کے وزیر اعظم

کے جھمیلے کو دور کرانا، خود اسی دن ڈنر وائسرائے کے ساتھ کھانا سب کا تذکرہ تھا اور جسے میں اس مضمون کے سلسلہ میں ان حقائق وواقعات میں شامل کرنے کے قابل ہوا جو سچے وقائع سے تعلق رکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر علامہ اقبال بہاولپور تشریف لے جاتے تو یہ وزیر اعظم کی تبدیلی میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، علامہ موصوف کو ضرور دس پندرہ ہزار انعام ریاست کی طرف سے یا جاتا مگر اس مرد خود آگاہ کو کون ان باتوں پر آمادہ کرسکتا یا تحریک کرسکتا تھا۔ وہ مقدمہ کے چار ہزار تو لے سکتے تھے مگر انعام کے حرص ولالچ (کذا) میں بہاولپور کا سفر کر کے نواب صاحب کے سامنے گپیں ہانکنے والے اور خوشامدی کا روپ نہ دھار سکتے تھے۔ انھوں نے صاف جواب دلوادیا کہ انھیں فرصت ہی نہیں کہ وہ بہاولپور حاضری دیں۔

## چوالیس سال پہلے کا واقعہ

چوالیس سال پہلے کی بات ہے کہ اردو کے نامور ادیب حضرت نیاز فتح پوری کی عادت تھی کہ وہ چڑھتے سورج کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر اقبال کے بارے میں پوری دیدہ دلیری سے لکھا اور اس پر نیرنگ خیال لاہور کو سختی سے نوٹس لینا پڑا تھا۔ یہ گزرے زمانے کی باتیں ہیں، اب اس کا وقت نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کو دہرائیں۔ میں صرف چند سطریں اس اداریہ کے آخری پیرے سے نقل کرتا ہوں:

''ہم نے حضرت نیاز کی زہریلی تحریک کے ان جملوں کو نقل کر کے رسالہ کو ناپاک نہیں کیا جو ان کے صحیفہ میں شائع ہوئے تھے۔ ہم یوپی کے سخن فہم اصحاب کو عموماً اور لکھنؤ کے اہل الرائے حضرات کو خصوصاً توجہ دلاتے ہیں کہ وہ حضرات فتح پوری کی اس سفیہانہ تحریر پر سختی سے نوٹس لیں اور پوری کوشش کریں کہ امت مرحومہ کے سربرآوردہ اور واجب التعظیم بزرگوں کی اس درجہ توہین پر وہ اظہار ندامت کریں اور اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو اطبائے لکھنؤ ان کے سر پر جو ''جن'' (۱) مسلط ہے اس کے نکالنے کا انتظام فرمائیں۔'' نیرنگ خیال جنوری ۱۹۳۰ء

اس پر محترم محمد طفیل مدیر ''نقوش'' اپنی کتاب مکرم میں تبصرہ فرماتے ہیں:

"یہ ہے ایڈیٹر کی قابلیت یا اس کا مقام گفتگو کہ نازک مرحلوں سے بھی سرخرو گزرے ورنہ اس جھگڑے میں اہل زبان کا ناراض ہو جانا لازمی امر تھا۔ (ایسے مواقع پر اکثر معقولیت اور نامعقولیت کو بھی دھیان میں نہیں رکھا جاتا) مگر حکیم صاحب نے اس معاملہ کو پوری ہوش مندی سے سنبھالا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سنا تھا کہ اس معاملہ میں اہل اردو بھی حکیم صاحب کے ہمنوا تھے اور نیاز صاحب کے رویئے کو ناپسند کر رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں تلخ نوائی میں شیریں کلامی۔"

یہ ایک ایسا عجیب موقع تھا جب علامہ اقبال کے حضور میں ان کے حمایتی خوب اچھل اچھل کر باتیں بناتے۔ اجی حضرت! ہم یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے۔ ان کے چھکے چھڑا دیں گے۔ چنانچہ میں نے (ایڈیٹر نقوش نے) حکیم صاحب سے پوچھ ہی لیا: "آپ نے اس وقت علامہ اقبال کی وکالت تو خوب کی تھی، علامہ بھی خوش ہوئے تھے یا نہیں؟"

حکیم صاحب کہنے لگے "وہ ان چیزوں سے بالا تھے۔ میں نے جب ادب سے وہ پرچہ علامہ کی خدمت میں پیش کیا تھا تو وہ نوٹ پڑھ کر صرف مسکرا دیئے تھے زبان سے کچھ نہ کہا، مجھ میں بھی ہمت نہ تھی کہ پوچھ لیتا۔ "کیسا رہا یہ اداریہ؟"

محمد طفیل نے پوچھا "آپ کے علامہ سے تعلقات کیسے تھے؟"

"آج لوگ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہمارے علامہ سے بڑے تعلقات تھے، ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ہر آدمی یہ کہہ رہا ہے کہ علامہ میرے دوست تھے۔ مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے مگر میں اس ضمن میں یہ کہوں گا کہ میں تو ان کے ہاں حاضری پر ہی فخر کیا کرتا تھا۔ میری نہ ان سے دوستی تھی، نہ وہ مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ علامہ کی مجھ پر یہی مہربانی بہت تھی کہ انھوں نے مجھے اپنے ہاں بیٹھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لذت بیداری مجھے اسی چوکھٹ سے ملی تھی ورنہ میں اس سے آشنا ہی نہ تھا۔" یہ سب علامہ کی دور سے فیض بخشی تھی ورنہ من آنم کہ من دانم!

## شاعر کا مقام

ہندوستان کے ایک نواب (شاید نواب جونا گڑھ) لاہور آئے۔ انھوں نے سر عبدالقادر کے ہاں قیام فرمایا تھا۔ نواب صاحب نے سر عبدالقادر سے کہا "میں دو کاموں کے لیے

آیا ہوں۔ ایک تو میں لاہور دیکھنا چاہتا ہوں۔ دوسرے اقبال سے ان کا کلام سننا چاہتا ہوں۔"

دنیا خوب جانتی ہے کہ سر اقبال اور سر عبدالقادر میں گہرے دوستانہ روابط تھے۔ عبدالقادر نے کہا "لاہور کی سیر تو میں بخوبی کرا دوں گا مگر علامہ اقبال سے کلام سنوانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے:

"ہاں میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کی خاطر دعوت کروں گا جس میں علامہ کو بھی مدعو کروں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی صورت از خود پیدا ہو جائے کہ علامہ اپنا کلام سنا دیں ورنہ فرمائش کی جرأت تو مجھ میں ہے اور نہ کسی اور میں!"

اللہ اللہ یہ ہے شاعر کا مقام!

حواشی:

(۱) ان دنوں حضرت نیاز فتح پوری ایک رسالہ "جن" بھی شائع کرتے تھے۔ (حکیم یوسف حسن)

# اقبال کا طرزِ تدریس•

خادم محی الدین

جس زمانے میں علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر فلسفہ مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں پروفیسر خادم محی الدین گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اور علامہ اقبال کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون ''کالج کا زمانہ'' میں اقبال کے طرزِ تدریس پر اس مضمون میں یوں روشنی ڈالی ہے۔

''(علامہ اقبال) اخلاقیات اور الٰہیات پر نہایت سہولت سے لیکچر دیا کرتے تھے اس کے علاوہ انگریزی نثر بھی پڑھاتے رہے لیکن ان کا خاص مضمون تو فلسفہ ہی تھا اور اس کے ادق نکات ایسی وضاحت سے بیان فرماتے کہ مضمون آئینہ ہو جاتا تھا۔ چونکہ پروفیسر بریٹ کی طرح برق رفتار نہ تھے اور ہماری ذہنیت سے واقف تھے اس لئے میں ان کے لیکچروں کا بیشتر حصہ کلاس میں قلمبند کر لیتا تھا۔ گھر جا کر ہر لیکچر کے نوٹ دوبارہ صاف کر کے لکھ لیتا۔ کورس پورا ہوا تو میں فلسفہ میں امتحان دینے کے لئے بالکل تیار تھا''۔

❀❀❀

• بصد شکریہ، سہ ماہی، صحیفہ لاہور، ۱۹۵۸، بحوالہ رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ۔ ص 265۔

# اقبال...... چند یادیں، چند تاثرات●

خالد صوفی (۱)

میری والدہ ماجدہ (۲) کے بیان کے مطابق حکیم الامت حضرت علامہ اقبال مجموعی طور پر بڑے خوش طبع واقع ہوئے تھے۔ دوران گفتگو چھوٹے چھوٹے چٹکلے بلا تکلف بیان کرتے جاتے تھے لیکن خدا نے انہیں بیان کا ایسا سلیقہ عطا کیا تھا کہ کسی حالت میں بھی وہ تہذیب کے دائرے سے تجاوز نہیں کرتے تھے، انہیں جتنا مسلمانوں کی مذہب سے بے خبری اور بیگانگی پر دُکھ ہوتا تھا کسی دوسری بات پر نہ ہوتا تھا۔ جب کبھی بھی کوئی مذہب سے بے خبری کی بات کر دیتا تو وہ بے حد ملول ہو جاتے اور اکثر اوقات ان کے آنسو تک نکل آتے۔ رسول اکرم ﷺ سے انہیں اس قدر عقیدت تھی کہ خاص طور پر زندگی کے آخری ایام میں بھی حضور ﷺ کا نامِ مبارک دوران گفتگو آتا تو بے اختیار ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں اور آواز کانپنے لگتی۔ ان کی گفتگو ہمیشہ بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہوتی تھی اور انہیں اپنے خیالات مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا اور یہی وجہ تھی کہ سننے والے کبھی ان کی باتوں سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ محفل ہو یا گھر صرف وہ خود ہی بولتے جائیں بلکہ وہ دوسروں کی باتیں بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتے تھے اور کبھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ والدہ صاحبہ بتاتی ہیں کہ "چچا جان ہمیشہ پنجابی میں بات چیت کرنے کو ترجیح دیتے اور بعض اوقات اردو میں بھی اظہار خیال کرتے البتہ جب بھی کوئی دقیق مسئلہ ہوتا تو اسے انگریزی میں بیان فرماتے۔

---

● بصد شکریہ، رسالہ مفکر، اقبال نمبر، مرے کالج، سیال کوٹ، 1975 بحوالہ صابر کلوروی، مرتبہ اقبال کے ہم نشین، ص 262۔265۔

نانا جان قبلہ اپنا زیادہ وقت گھر پر ہی گزارتے تھے اور جلسوں وغیرہ میں کبھی کبھار ہی شمولیت فرماتے تھے۔ سینما اور دوسرے کھیل تماشوں کا شوق انہیں بالکل نہیں تھا۔ جوانی میں انہوں نے اکثر مشاعروں میں شرکت کی مگر بعد میں انہوں نے مشاعروں میں شامل ہونا بھی بالکل ترک کر دیا۔ ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ مطالعہ تھا۔ چنانچہ فارغ اوقات میں زیادہ تر مطالعہ ہی فرماتے تھے اور اکثر اوقات مطالعہ میں اس قدر محو ہو جایا کرتے تھے کہ گرد و پیش کا بالکل ہوش نہ رہتا تھا۔ اس سلسلے میں میری والدہ مکرمہ ایک واقعہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ "ایک دفعہ بڑے زور کا زلزلہ آیا۔ چچا جان (علامہ مرحوم) اس وقت اپنے بستر میں لیٹے کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ زلزلہ اس قدر شدید تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری دنیا تہ و بالا ہو جائے گی۔ گھر کے تمام افراد سراسیمہ تھے، میں ان دنوں بچی تھی، گھبراہٹ میں کبھی دوڑتی ہوئی چھت پر چڑھ جاتی۔ کبھی نیچے اُتر آتی مگر چچا جان اسی طرح بستر میں لیٹے رہے اور مطالعہ جاری رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ البتہ میرے بھاگنے دوڑنے اور چچی جان (والدہ جاوید) کے مجھے منع کرنے سے قدرے ان کی توجہ ہٹی اور انہوں نے صرف ایک بار کتاب سے نگاہیں ہٹا کر میری جانب دیکھا اور فرمایا...... "وسیمہ! اس طرح مت بھاگو۔ اپنی چچی کے پاس بیٹھ جاؤ۔" اتنا کہا اور پھر کتاب پڑھنے لگے۔

علامہ مرحوم کو اپنے والدین سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اپنے والد ماجد کو تو وہ پیر و مرشد مانتے تھے اور اپنی والدہ مرحومہ سے انہیں بے انتہا پیار تھا جس کی ہلکی سی جھلک ان کی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" (۳) سے ملتی ہے جو انہوں نے اپنی والدہ کی وفات پر کہی تھی، جہاں تک مجھے علم ہے شاید ہی دنیا کے کسی شاعر نے اتنی بلند پایہ نظم اپنی والدہ کے متعلق کہی ہو۔ یوں تو پوری نظم ہی ایک جگہ ایک خاص مقام کی حامل ہے اور اس کا ایک ایک شعر اپنے اندر معانی و مطالب کا بحرِ ذخار پوشیدہ رکھتا ہے مگر ذیل میں درج چند اشعار والدہ کے ساتھ ان کے دلی لگاؤ کی بڑی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں ؎

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور — دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم — صحبت مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں — پھر اُسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

نانا جان قبلہ اپنے والدین کو کیا مقام دیتے تھے، اس کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا

ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ابھی تک حج کرنے کیوں نہیں گئے تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ "میں تو ہر سال حج پر جاتا ہوں۔" پوچھنے والا بڑا حیران ہوا اور کہا کہ ہم نے تو کبھی اس کے متعلق نہیں سنا کہ آپ حج پر گئے ہوئے ہیں تو حکیم الامت نے بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا...... "میں ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں سیالکوٹ جاتا ہوں اور وہاں اپنے والدین کی خدمت میں حاضری دیتا ہوں۔ یہی میرا حج ہے۔"

میری والدہ مکرمہ بیان کرتی ہیں کہ "چچا جان کی زندگی بڑی قناعت پسندانہ اور درویشانہ قسم کی تھی۔ اگر وہ چاہتے تو بے اندازہ دولت جمع کر سکتے تھے مگر انہوں نے کبھی بھی دولت کو اپنا نصب العین نہیں بننے دیا۔" اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ جب حضرت علامہ نے انگلستان سے واپس لوٹ کر وکالت شروع کی تو بے شمار مقدمات ان کے پاس آنے لگے مگر انہوں نے ہمیشہ ہی صرف اتنے کام کو ہاتھ ڈالا جس کی آمدن ان کے ماہانہ اخراجات کے لیے کافی ہوتی، وہ اپنی آمد و خرچ کا حساب بڑی باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ ہر ماہ خرچ کا تخمینہ پہلے ہی لگا لیتے اور جب تخمینے کے مطابق کام مل جاتا تو مزید مقدمے لینے سے انکار کر دیتے۔ وہ بڑے سیدھے سادے انسان تھے اور دنیا کے فریب اور اونچ نیچ سے بالکل بے خبر۔ انہوں نے کبھی کسی مقدمے میں غلط بیانی یا غلط ذرائع کا سہارا نہیں لیا۔ میری والدہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ...... "چچا جان اکثر اس بات پر اظہار افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ کس طرح اپنے ضمیر سے لاپروا ہو کر جھوٹی گواہیاں دیتے اور وہ ہمیشہ ہی عدالتوں کے اس غلط نظام سے نالاں رہا کرتے تھے۔"

زندگی کے آخری ایام میں انہیں اپنی قوم کا خیال بہت زیادہ رہا اور وہ اکثر اس کے لیے روتے رہے۔ ایک شب بڑی دیر تک گریہ وزاری کرتے رہے۔ گھر میں سے کسی نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں تو آپ نے فرمایا...... "مجھے اپنی قوم کا خیال بے چین کیے دیتا ہے...... خدا مسلمانوں کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔"

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) خالد نظیر صوفی جو مشہور کتاب اقبال درونِ خانہ کے مصنف بھی ہیں۔

(۲) وسیمہ بیگم جو علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی لڑکی تھیں۔

(۳) مشمولہ بانگ درا صفحہ ۲۲۶۔

# اقبال رحمۃ اللہ سے ملاقات •

خان عبدالغفار خان

ہمارے صوبہ میں کوئی قومی اخبار نہیں تھا، اس لیے میں نے ارادہ کرلیا کہ پختونوں کے لیے اپنی زبان میں ایک پشتو اخبار جاری کیا جائے جو صحیح معنوں میں قومی اخبار ہو۔ چنانچہ بڑی جدوجہد کے بعد مئی ۱۹۲۸ء میں میں نے پشتون کے نام سے اخبار شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پختونوں کو اپنی زبان سے کوئی محبت نہ تھی لیکن جلد ہی یہ اخبار پشتونوں میں ہر دلعزیز ہوگیا اور دنیا کے ہر حصہ میں جہاں بھی پشتون رہتے تھے، اسے منگواتے تھے۔ افغانستان کے امان اللہ خان کو پشتو سے بڑا ربط پیدا ہو گیا تھا لیکن وہاں کے مُلّا، مُلّانوں نے اسے کافر قرار دیا اور اسے افغانستان سے نکال کر ہی دم لیا۔

افغانستان کی تباہی کو ہم لوگ اپنی تباہی تصور کرتے ہیں۔ ہم نے اس مصیبت میں مالی اور جانی طور پر افغانستان کی مدد کی اور اس وقت تک امداد جاری رکھی جب تک نادر خان کامیاب نہ ہوگیا۔ افغانستان کے انقلاب کے وقت اس کے حق میں پروپیگنڈہ کرتے اور امداد فراہم کرنے کے لیے میں ہندوستان گیا تھا۔ پنجاب میں میں نے ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان اور دوسرے بہت سے مسلمان لیڈروں سے ملاقات کی تھی۔ لاہور میں ڈاکٹر اقبال سے ملنے پر میرے خلافت کے ساتھیوں نے میری بڑی مذمت کی۔ وہ کہتے تھے کہ میں ان سے کیوں ملا، وہ تو کسی کام کے آدمی نہیں، وہ تو ایک شاعر ہے۔(۱) اس میں عمل کا مادہ نہیں لیکن آج میں پنجاب کے اخباروں اور لیڈروں کو دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ وہ اسی اقبال کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور یہ

• بشکریہ بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین۔ ص 114-116۔

بھی کہتے ہیں کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے اس کے ہی دماغ میں آیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں کا کوئی گناہ نہیں ہے، دنیا بھر میں یہ قاعدہ جاری ہے کہ زندہ قومیں زندوں کی قدر کرتی ہیں، ہمارے ہاں زندہ انسانوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔

لاہور سے میں لکھنؤ چلا گیا، وہاں کانگریس کا جلسہ تھا۔ اس میں مجھے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے ان دونوں سے میری کوئی جان پہچان نہ تھی۔ جواہر لال نہرو ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ ہی انگلینڈ میں ایک جگہ رہ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک تعارفی خط ان کے نام لکھ دیا تھا، جلسے کے بعد میرے اور نہرو کے درمیان افغانستان کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔

وہاں سے میں دہلی چلا آیا، جمعہ کے روز مولانا محمد علی سے میری ملاقات ہوگئی، وہ بہت اچھے انسان تھے اور میرے بڑے مہربان تھے لیکن ان کے بھائی شوکت علی کوئی اچھے آدمی نہیں تھے مگر ان کا محمد علی پر بڑا اثر تھا، لہٰذا وہ کبھی کبھار محمد علی کو غلط راستے پر چلا دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں محمد علی سے ناراض تھا اور ان سے میں نے قدرے پہلو بچایا مگر انہوں نے مجھے دیکھ ہی لیا، وہ خود میرے پاس چلے آئے اور مسکرادیئے اور ہنسی خوشی میں مجھ سے کہہ دیا ''ہم پٹھانوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔'' پھر میری اُن کی قدرے نوک جھونک رہی، اس کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ امان اللہ خان جس وقت یورپ جارہے تھے اس وقت شوکت علی صاحب نے انہیں ایک سپاسنامہ پیش کیا تھا اور اُن کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے تھے۔ میں بھی اس تقریب میں موجود تھا لیکن وداع کے بعد میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ شوکت علی کو جس قدر توقع تھی، امان اللہ خان نے اتنے پیسے انہیں نہیں دیے، اس لیے وہ امان اللہ خان سے ناراض تھے۔

کچھ دنوں بعد نادر خان کی طرف سے کابل کی فتح کا تار موصول ہوا، اس پر ہم نے بڑی خوشی منائی اور عظیم الشان جلسہ کیا۔ میں نے بھی اس موقع پر ایک تقریر کی۔

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) خان صاحب نے اپنی پہلی ملاقات میں علامہ سے اپنی بات چیت کی تفصیل بیان نہیں کی، حیرت ہے کہ وہ نادر خان کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے ضمن میں علامہ کے کردار کو بھول گئے۔ اس ضمن میں مزید تفصیلات اللہ بخش یوسفی کی کتاب سرحد اور جدوجہد آزادی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

# اقبال کے ہاں•

خضر تمیمی

حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی کے متعلق ایک ہیچ مدان کا کچھ کہنا، چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن ایک صحبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہوگی۔

۱۹۳۶ء قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ ایک طرف تو مجلس احرار اور دوسرے علمائے اسلام اپنی تحریروں اور تقریروں سے ''قصرِ خلافتِ قادیان کی بنیادیں متزلزل'' کر رہے تھے اور دوسری طرف مرزائی صاحبان اپنی طویل اور قاطع دلیلوں سے ''سعید روحوں'' کو راہِ راست پر لا رہے تھے۔ ان ایام میں حضرت ممدوح علیل تھے لیکن طرفین کی وزنی دلیلیں، سیدھے سادھے نوجوان کو سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہی تھیں، اس لیے کئی ایک تشنگانِ ہدایت رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نوجوان بڑی بے تابی کے ساتھ آپ کے ارشاداتِ عالیہ کے منتظر ہیں آپ نے اپنا شہرۂ آفاق مضمون ''اسلام اور قادیانیت'' شائع فرمایا جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں اور وہ دلائل، جو سیاق وسباق کا لحاظ رکھے بغیر سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کر سکتی تھیں، تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں۔ اور نوجوانوں کی متوقع بے راہ روی کا مکمل سدباب ہوگیا۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی، جس کا جواب حضرت علامہ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے

• بعد شکریہ، محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 177۔182۔

عنوان سے تحریر فرمایا۔ اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی رفع ہو گئے۔

قصہ کوتاہ، ہر طرف قادیانیت کے موافق یا مخالف تذکرے تھے جن سے مساجد اور عام جلسہ گاہوں کے علاوہ مکلف کوٹھیوں کے خلوت کدے بھی خالی نہ تھے۔ ان ایام میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں صرف دو ہی فریق رہ گئے ہیں ایک وہ جو قادیانیت کا مخالف ہے اور دوسرا وہ جو اس کے موافق۔ میں نے اس سال پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (فارسی) کا امتحان دیا۔ حضرتِ ممدوح ہمارے ایک پرچے کے ممتحن اعلیٰ تھے اور اس میں ممدوح نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافتِ الٰہیہ اور مجدد کے نظریے کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا جس میں ضمنی طور پر قادیانیت بھی زیرِ بحث آ جاتی تھی۔

اپنے دوست صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم کے ساتھ "جاوید منزل" میں مجھے حضرت ممدوح کی زیارت نصیب ہوئی۔ ہمارے جانے سے پیشتر قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کسبِ فیض کے بعد موٹر میں سوار کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ آپ نے دروازہ تک ان کی مشایعت کی اور پھر ہماری طرف توجہ فرمائی۔ صوفی صاحب کو دیکھ کر تو آپ بس نہال ہی ہو گئے۔

ڈیوڑھی میں، ایک کھری چارپائی بچھی ہوئی تھی جس کے سرہانے چھوٹا سا تکیہ دھرا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پائینتی کی طرف کوئی کپڑا نہ تھا۔ اس پر ایک کتاب کھلی ہوئی پڑی تھی جس کے ایک خاص مقام پر پنسل دھری تھی۔ ایک کاپی شاید مختصر یادداشتوں کے لیے پاس تھی۔ حضرتِ ممدوح صرف سادہ سے کرتے اور شلوار میں ملبوس تھے۔ آخرالذکر پنجاب کی پانچ گزی شلوار اور پائجامے کے بین بین تھی۔ اللہ اللہ مشرق و مغرب کے جملہ علوم کا ماہر خرابیٔ صحت اور زیادتیٔ عمر کے باوجود اب بھی اس شان سے ہمہ تن مطالعہ تھا!

حضرتِ علامہ اور ہم "جاوید منزل" کے گول کمرے میں گئے جس کی مشرقی فضا سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ سب سے پہلے ایک قلفی دار، سادہ، فرشی حقہ لایا گیا جس میں نرم تمباکو بھرا تھا۔ میں نے کڑوے تمباکو کا ذکر چھیڑا تو آپ نے جھنگ کے تمباکو کو سراہا لیکن گلے کی تکلیف کے باعث اس سے لطف اندوز ہونے سے معذوری ظاہر فرمائی۔ ہم میں سے ممدوح کے ساتھ حقہ پینے کا شرف صرف صوفی صاحب قبلہ کو حاصل ہوا۔

ادبیات پر گفتگو شروع ہونے پر، مشرق و مغرب کے ادبیات زیرِ بحث آ گئے جس میں

حضرتِ علامہ سمندر کی سی وسعت کے مالک معلوم ہوتے تھے اور ان کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ جس موضوع پر گفتگو فرماتے تھے یہی معلوم ہوتا تھا گویا ساری عمر آپ نے اسی کے مطالعہ میں صرف فرمائی ہے۔ ضمناً پنجاب کی ادبی روایات پر بھی بات چیت ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ آئندہ ان کے برقرار رکھے جانے کی امیدیں دو نوجوانوں سے وابستہ نظر آتی ہیں ایک (مخدومی پرنسپل) تاثیر (پی ایچ ڈی کینٹب، ایم اے او کالج امرتسر) اور دوسرے (محترمی) محمد اسد خاں صاحب اسد ملتانی بی اے۔

علی بخش چائے لایا اور آپ نے میٹھی چائے پر نمکین کو ترجیح دی۔ چائے کے ساتھ ساتھ مذہبیات کا دور شروع ہوا۔ میں نے جاوید نامہ کی ان تصریحات کے متعلق استصواب کیا

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد

آپ نے جواب میں قادیانیت اور اس کے بانی کی مختلف تحریروں اور دعاوی کے پیش نظر ظاہر فرمایا کہ ثانی الذکر کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لیے بہت موزوں ہے۔ صوفی صاحب بولے کہ آپ سے بڑھ کر موصوف کا تجزیۂ نفسی کون کر سکے گا۔ ارشاد ہوا کہ موضوع واقعی بہت دلچسپ ہے لیکن صحت کی خرابی مانع ہے۔ کوئی نوجوان اس کام کے لیے اٹھے تو اس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کروں گا۔ اس کے بعد آپ نے ان نقصانات کو گنایا جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں مذاہب عالم کو برداشت کرنے پڑے۔ پھر مختلف مذاہب سے اسلام کے امتیازات کو بشرحِ تمام واضح کر کے ارشاد فرمایا کہ اسلام نہ صرف دنیا کے مذاہب میں سے کامل ترین مذہب ہے بلکہ اس سلسلے میں جو ارتقائی بلندیاں انسان کو ودیعت کی گئی ہیں ان کی بھی آخری کڑی ہے۔ آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانیت کی تعلیم، اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے کس طرح منافی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات پر آپ نے ظاہر فرمایا کہ قادیانیت کے ارکانِ اعلیٰ، اسلافِ صالحین کی تحریروں کو محروف کر دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انہیں ایک خاص موضوع پر کی مسلمہ کتب کا علم تک بھی نہیں ہوتا۔

مولوی محمد علی صاحب ایم اے، ایل ایل بی امیر جماعت احمدیہ لاہور کا ذکر بھی درمیاں میں آیا۔ آخر کار میں نے عرض کیا کہ فریقین کی آرا کو ایک طرف رکھتے ہوئے آپ مسئلہ "ختم نبوت" کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ الیوم اکملت لکم دینکم کی

صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میں نے عرض کیا کہ آخر اسلام میں اور فرقے بھی تو ہیں صرف قادیانی صاحبان کی مخالفت ہی کیوں کی جائے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ ان کا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے اور حقیقت میں یہ اسلامی فرقے مختلف گروہ ئے خیال (Schools of thoughts) ہیں جن کے اختلافات فقہ پر مبنی ہیں۔ ہر ایک فرقہ اسلام کے مسلمات پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایمان رکھتا ہے لیکن قانونِ اسلامی کے بعض حصوں کی تشریح میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے۔ فقیہوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے مایا کہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحاب ''خشک'' ہونے کے باوجود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں۔ ایک صاحب اٹھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ں کام اس طرح کیا۔ اس دعوے کی تائید میں وہ ہر ممکن ثبوت (قرآن، حدیث یا دیگر مآخذ سے) بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے صاحب اس کی تردید میں فرماتے ہیں کہ نہیں یہ کام حضور ﷺ نے یوں سرانجام دیا۔ وہ اپنے دلائل الگ پیش کرتے ہیں جس سے مستفسیر کو حضور ﷺ کی رک زندگی کے ایک خاص پہلو کے متعلق موثق معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ جہاں کہیں حضور ﷺ کا ذکر آیا ان جذبات سے عاری مصنفین کے دلوں میں محبت کے سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگ گئے۔ ان حضرات کی زندگی کا محبوب سرمایہ حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے جس کے ہر پہلو کو اس قدر حزم و احتیاط سے محفوظ و ملحوظ رکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ں آپ نے Jealously Gaurd کرتے ہیں کا فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔ اب تم خود اندازہ کرلو کہ ایسی محبوب و مفخر ہستی کے جملہ اعزازات کے لیے کسی اور صاحب کو چن لینا، اسلامی علوم کی فلک رفعت عمارت کے انہدام سے مترادف نہ ہوگا؟ بانیٔ مرزائیت کے کوائف زندگی اور انہی لات میں حضور ﷺ کے مبارک افعال کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے آپ آبدیدہ ہو گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بہتے ہوئے آنسوؤں سے ہم شکوک کے داغوں کو دھوتے اور دلوں کو روشن کرتے، صوفی صاحب کے دولت کدے پر لوٹ آئے۔ سچ ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

# یادِ ایام•

خواجہ عبدالوحید

آٹھ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو رات کے پونے نو بجے میں ریلوے سٹیشن پر ایک چٹھی سپردِ ڈاک کرنے کے بعد میکلوڈ روڈ کے راستہ گھر جا رہا تھا۔ جس وقت میں سر محمد اقبال کی کوٹھی کے سامنے سے گزر رہا تھا، خیال آیا کہ علامہ محترم اس وقت اکیلے ہوں گے اس لیے ملاقات کا اچھا موقعہ مل جائے گا۔ میں بالعموم ایسے ہی اوقات میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پسند کیا کرتا تھا، اس لیے کہ دوسرے لوگ بالعموم آپ کے پاس بیٹھ کر سیاسیاتِ حاضرہ پر گفتگو کیا کرتے تھے جو اقبال کی شخصیت کے لیے میرے نزدیک ایک کمتر موضوع تھا۔ چنانچہ موقع کو غنیمت جان کر میں کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا۔ حضرتِ علامہ برآمدے میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ایک چھوٹی سی کتاب دیکھ رہے تھے۔ سوائے ایک ملازم کے جو آپ کے پاؤں دبا رہا تھا اور کوئی پاس نہ تھا۔

علامہ مرحوم کے ہاں آنے جانے کی دِقت کبھی نہ ہوتی تھی۔ وہ جہاں بڑے سے بڑے آدمیوں کی گرمجوشی کے ساتھ آؤ بھگت نہ کرتے تھے وہاں معمولی سے معمولی حیثیت کے آدمی کے ساتھ بہت حُسنِ سلوک فرماتے تھے۔ نہ کسی کے استقبال کا خاص اہتمام ہوتا تھا نہ کسی کی راہ میں رکاوٹ پیش ہوتی۔ میں ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اس بات کی ضرورت سمجھتا تھا کہ اپنے آنے کی اطلاع دے دوں۔ اس موقع پر اس کی بھی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ آپ نے مجھے خود ہی دیکھ لیا اور اپنے معتاد طریق ''آیئے خواجہ صاحب!'' کہہ کہ مجھے قریب بلا لیا۔ میں سلام مسنون کے بعد مزاج پرسی کر کے جو بیٹھا تو نو بجے شب سے لے کر گیارہ بجے تک بڑی ہی پُرلطف صحبت رہی۔ بے شمار باتیں

• بصد شکریہ، محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 137-142۔

مختلف الانواع موضوع پر ہوئیں اور اس تمام عرصہ میں کوئی اور صاحب وہاں وارد نہ ہوئے۔

جو لطف اور خوشی میں نے ان دو گھنٹوں میں حاصل کی وہ میری زندگی کی ایک بہت ہی غیر معمولی اور بیش بہا چیز ہے۔ میں شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ دو گھنٹے میری زندگی کے بہترین اوقات میں سے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو حضرتِ علامہ نے میرے سامنے کہیں لفظ بلفظ یہاں دہرادوں، لیکن باتوں کی کثرت ہی اس راہ میں مانع ہو رہی ہے۔

ایک بہت بڑی خوشخبری جو ڈاکٹر صاحب نے سنائی یہ تھی کہ وہ اپنے دل میں اس بات کی زبردست خواہش رکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی تعلیم پر اپنے خیالات مفصل طور پر کتابی صورت میں ظاہر فرمائیں۔ وہ فرماتے تھے: ''میں نے اپنے خیالات کا بڑی تفصیل سے اشعار میں اظہار کر دیا ہے لیکن ابھی میرے دل میں ان سے بھی بڑی چیز ہے جسے قرآن حکیم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں۔'' لیکن وہ یہ کام اسی صورت میں یکسوئی کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ پانچ سال کے لیے ان کو افکارِ روزگار سے کامل طور پر فرصت حاصل ہو جائے۔

افسوس کہ دنیائے اسلام کے اس عدیم النظیر فلسفی اور کلیم کے لیے ہندوستان کی مسلمان قوم فراغت کا سامان مہیا نہیں کر سکی۔ مسلمانانِ ہند کی بے سروسامانی اور بے حسی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

حضرتِ علامہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق فرمایا: میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بیکار ہیں، بالخصوص ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان۔'' ان کا خیال تھا کہ اگر کبھی کام آ سکتے ہیں تو غریب مزدوری پیشہ یا دکاندار مسلمان جن کے لیے ان کے دل میں محبت اور عزت ہے اور جن سے مل کر انہیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ ان کے نزدیک مستحقِ التفات نہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ قرونِ متوسطہ کے ڈکٹیٹر بن جائیں تو وہ اس گروہ کو ''ہلاک'' کر دیں۔''

حضرتِ علامہ کی غریبوں سے ہمدردی اور امیروں سے نفرت آپ کے کلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ بالِ جبریل میں ''لینن'' والی نظم کے آخری اشعار کس قدر واضح ہیں ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں سخت بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

وہ تو خدا کی زبان سے فرشتوں کے نام بھی یہ حکم سننا چاہتے کہ

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کا جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ ''اسلام کا مستقبل دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر منحصر ہے نہ کہ ہندی مسلمانوں پر۔''

جاپان کا ذکر آیا تو آپ نے کہا کہ جاپان میں تبدیلِ مذہب دنوں یا ہفتوں کا کام ہے نہ کہ یوروپین ممالک کی طرح صدیوں کا۔ اگر اسلام کا چرچا اس ملک میں شروع ہو گیا تو چند ہفتوں میں تمام جاپانی قوم مسلمان ہو جائے گی۔ اس کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے۔ جاپان کے لیے مسلمان ہو جانے میں یہ فائدہ ہو گا کہ روس کے خلاف اسے چین اور ترکستان میں زبردست اسلامی قوت کی امداد حاصل ہو جائے گی۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء کی شب کو میں سیر کرتا ہوا پھر حضرتِ علامہ کے دولت کدہ پر جا نکلا۔ اس وقت آپ کے پاس قیصر صاحب، استاد عشق لہر اور ایک ''حکیم صاحب'' بیٹھے تھے۔ دس منٹ کے بعد وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے اور حضرتِ علامہ اور میں باتیں کرنے کے لیے رہ گئے۔ قریباً ایک گھنٹہ تک پُرلطف علمی گفتگو ہوا کی۔ ایک موقع پر گفتگو کا رخ اس مسئلہ کی طرف پھر گیا کہ اہلِ یورپ جن باتوں کا صدیوں تک تجربہ کر کے ان سے متنفر ہو چکے ہیں یورپ کے ایشیائی مقلدین انہیں چیزوں کے پیچھے جا رہے ہیں۔ مثلاً آزادیٔ نسواں۔ حضرتِ علامہ نے اس سلسلہ میں عورتوں کے متعلق بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں مثلاً:

I have no faith in women

یا ''عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں۔''

پھر حضرتِ علامہ نے فرمایا کہ عورت کو دماغ کمزور ملا تھا اس لیے کہ creative (تخلیقی) function (قوت) اس کے معاملہ میں دماغ کی بجائے womb (رحم) سے تعلق رکھتی ہے۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت womb (رحم) سے۔

ماہ نومبر ۱۹۳۴ء کے آخری یکشنبہ کے روز تین چار دوستوں کے ہمراہ حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم لوگ قریباً دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھے رہے۔ اس عرصہ میں علامہ محترم کے خیالاتِ عالیہ سے ہم لوگ بہت بڑی حد تک فیض یاب ہوئے اور سب احباب کی رائے میں ہمارا وہ وقت بہت ہی بابرکت شغل میں صرف ہوا۔

حکمت و معرفت کے دریا تھے جو ہمارے سامنے بہتے چلے جا رہے تھے۔ علامہ موصوف نے سیاسیات، اقتصادیات، تصوف، شریعت بھی قسم کے مسائل پر رائے زنی فرمائی۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ایک قوم یا فرد کو حالات کی نامساعدت اور بخت کی رسائی سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بے سروسامانی، اخلاص اور نفرت سے بھی انسان بے شمار فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ ایک مفلس آدمی، جس کے پاس چھن جانے کے لیے کچھ بھی نہیں یا جس کے پاس وہ مال و متاع نہیں جس کی محبت اسے اپنی طرف کھینچ سکے، حق و صداقت کی حمایت میں دلیری اور جرأت دکھا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ میں ملک کی سیاسیات میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے کے لیے شامل نہ ہوا تھا بلکہ محض اس لیے کہ ہندوستان کے آئندہ نظامِ سیاسی میں مسلمانوں کی حیثیت واضح کر دوں اور یہ ظاہر کر دوں کہ اس ملک کے سیاسی ارتقا میں حصہ لیتے ہوئے مسلمانوں کو دوسری اقوامِ ہند میں مدغم نہ ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ ''میں نے اس کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔''

تعلیم کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مسلمانوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنی ہی، لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین ہی سنبھال سکے۔ یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے جو نیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دین بھی کھو رہی ہیں۔

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے روز جو ملاقات ہوئی اس کے دوران میں میں نے حضرتِ علامہ سے ''ادبِ لطیف'' کی تعریف پوچھی تو اس سلسلہ میں ''ادب'' اور ''آرٹ'' پر آپ نے بہت سی

پُراز معلومات اور دلچسپ باتیں ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ آرٹ کے متعلق دو نظریے موجود ہیں۔ اول یہ کہ آرٹسٹ کی غرض محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے اور دوم یہ کہ آرٹ سے انسان کی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے اور اس لیے ہر وہ آرٹ جو زندگی کے لیے مفید ہو اچھا اور جائز ہے، اور جو زندگی کے خلاف ہو جو انسانوں کی ہمتوں کو پست اور ان کے جذباتِ عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابلِ نفرت و پرہیز ہے۔ اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔

اس پر حکومت کے فرائض پر اظہارِ خیالات ہونے لگا اور آپ نے فرمایا کہ حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے لیکن اس اہم ترین فرض کو دنیائے جدید تسلیم ہی نہیں کرتی۔ حکومتیں محض لوگوں کے سیاسی خیالات و رجحانات سے تعلق رکھتی ہیں۔ افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل ہی نہیں سمجھتیں۔

پھر اسلام اور تہذیب حاضرہ کا ذکر ہوا۔ فرمانے لگے کہ اسلام تہذیبِ حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے، اس لیے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ یہ کہ ان چیزوں کو جزوِ اسلام بنالیا جائے۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اب دنیا اسلام کی طرف آرہی ہے اس لیے اگر آج تہذیب مغربی تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اس آنے والے دور کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ جس وقت تہذیبِ جدید کا خاتمہ ہو، مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کر دینا چاہیے۔

آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لیے مردہ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندو قوم کی تباہی میں اس کے فنِ موسیقی کا بہت حصہ رہا ہے۔

میں جب کبھی حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ایسے وقت کی تلاش میں رہتا جبکہ طویل فراغت حاصل ہوتا تا کہ اطمینان کے ساتھ ان کی صحبت بابرکت سے فیضیابی ہو سکے، اس لیے کہ جہاں ان تک رسائی آسان ہوتی وہاں رخصت حاصل کرنا محال ہوتا، اس لیے کہ ان کے ارشاداتِ عالیہ کا سلسلہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کے مثل تھا۔ نہ وہ رکتا اور نہ آدمی رخصت لے سکتا۔ چنانچہ ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو مجھے ایک قادیانی احمدی نے رسالہ دیا جو دراصل مرزا بشیر الدین محمود کا وہ خطبۂ جمعہ تھا جو انہوں نے سر محمد اقبال کے بیانات کے خلاف انہی دنوں دیا

تھا۔ ۱۶ جون کی صبح کو دفتر جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ حضرتِ علامہ کو وہ رسالہ دکھاتا جاؤں۔ وہاں جو ٹھہرا تو ساڑھے بارہ بج گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا کہ انجمن خدام الدین کا انگریزی اخبار اسلام کا آئندہ پرچہ کب چھپے گا۔ میں نے عرض کیا کہ پرچہ پریس میں جا رہا ہے۔ اس پر آپ نے اسی پرچہ کے لیے بیان لکھوایا۔ پھر اس کی کاٹ چھانٹ میں بہت وقت صرف ہوا۔ اس بیان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس چٹھی کی نقل بھی دی جو انہی دنوں اسٹیٹس مین میں شائع ہوئی تھی تا کہ اسے بطور مضمون اسلام میں شائع کر دیا جائے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کے روز حضرت استاذی المحترم مولانا احمد علی صاحب کے فرزند اکبر حافظ حبیب اللہ صاحب کی معیت میں حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حافظ صاحب کو بہت مدت سے ملاقات کا شوق تھا۔ باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو شروع ہوگئی۔ میں نے پوچھا کہ جہاد جارحانہ ہونا چاہیے یا دفاعی؟ فرمانے لگے کہ عام طور پر تو دفاعی ہے لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً، اگر کسی قوم کی بداخلاقی اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ قوموں کے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ہمسایہ مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ وہ بزورِ شمشیر اس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ سلطان ٹیپو شہید نے مالابار کے غیر مسلم وحشی باشندوں سے کہا تھا کہ تم لوگ بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہننا شروع کر دو، ورنہ میں بزورِ شمشیر تمہیں کپڑے پہننے پر مجبور کروں گا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ قرآن میں مسلمانوں کو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعتِ حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیے، اس لیے کہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔ اگر امر و نہی کے فرائض مسلمان ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں تلوار کا ہونا ضروری ہے۔

میری آخری ملاقات حضرتِ علامہ سے ان کی وفات سے قریباً ایک ہفتہ پہلے ہوئی۔ آپ کے مرض الموت میں مَیں قریباً ہر روز ''جاوید منزل'' جاتا لیکن اس خیال سے باہر سے ہی مزاج پُرسی کر لیتا کہ اگر حاضرِ خدمت ہوا تو آپ باتیں کریں گے اور سے آپ کو تکلیف ہوگی۔ یک روز دوپہر کے وقت میں کوٹھی کے احاطہ میں علی بخش کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ حضرت علامہ نے اندر سے دیکھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں آپ کی مزاج پُرسی کر رہا ہوں مجھے اندر بلا بھیجا۔ میں

حاضر ہوا۔ مزاج پرسی کے بعد میں نے پوچھا کہ آج کل علاج انگریزی ہے یا یونانی۔ فرمانے لگے:

(ایلوپیتھی سے میرا اعتقاد بالکل اٹھ چکا ہے)

I have lost all faith in allopathy

اس کے بعد ارشاد ہوا:

There can be no science of medicine, for there is no science of life

(علم طب کی کوئی سائنس نہیں ہو سکتی، کیونکہ زندگی کی کوئی سائنس نہیں)

پھر فرمایا:

How can you have a science of something the reality of which you can not know

(آپ اس چیز کی سائنس کیسے رکھ سکتے ہیں جس کی حقیقت سے آپ نابلد ہوں)۔

اس کے بعد تمدنِ اسلام اور دوسرے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ آپ بڑے جوش سے باتیں کرتے رہے۔ اس وقت آپ کو شدید درد تھا۔ درد کی شدت سے مجبور ہو کر آپ بستر پر الٹے لیٹ لیٹ جاتے لیکن پھر فرطِ جوش سے سیدھے بیٹھ جاتے اور گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیتے۔ میں دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کیوں اندر آیا۔ نہ میں حاضر خدمت ہوتا نہ آپ کو زحمتِ گفتگو ہوتی۔

وفات سے پہلے روز صبح کو میں جاوید منزل گیا۔ حضرتِ علامہ چائے نوش فرما رہے تھے۔ میں سامنے ہو کر زحمتِ گفتگو نہ دینا چاہتا تھا اور بغیر دیکھے بھی نہ رہنا چاہتا تھا۔ شاید فطرت اندر ہی اندر یہ احساس دلا رہی تھی کہ آج اس یگانۂ دہر کی مادی زندگی کا آخری روز ہے۔ اس کے بعد وہ صورت دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ میں درمیانی کمرے میں، جہاں آپ کا بڑا فوٹو آویزاں ہے، بیٹھ گیا۔ آپ چائے پی رہے تھے اور میں اپنی جگہ سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن آنکھیں نہ ملاتا تھا، مبادا پہچان کر اپنے پاس بلا لیں۔ اسی عالم میں بصد حسرت و یاس میں کچھ دیر کے بعد رخصت ہوا۔ اس روز میں نے حضرتِ علامہ کی صورت کی آخری جھلک پائی۔ دوسرے روز علی الصبح ایک دوست یہ روح فرسا خبر لائے کہ علامہ محترم نے اس دنیائے آب و گل سے عالمِ جاوید کا سفر اختیار فرما لیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

# خواجہ عبدالوحید کی ڈائری میں ذکر اقبال•

خواجہ عبدالوحید

بیسویں صدی عیسوی میں عشرہ اول کے نصف آخر میں لاہور میں ایک مکان ''للّی لاج'' (Lily Lodge) کے نام سے تھا۔ بازار حکیماں سے بازار سید مٹھا کو جو راستہ جاتا ہے اور جو اب تحصیل بازار کہلاتا ہے۔ اس کے مشرقی حصے سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ کو ایک محلہ تھا جسے ''تھڑیاں بھابھڑیاں'' کہتے تھے اس محلہ کی بیشتر آبادی جینیوں کی تھی۔ للّی لاج اسی محلہ میں واقع تھا جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس زمانہ میں اس مکان میں لاہور کے روشن خیال بزرگوں کا ہر شام اجتماع ہوتا تھا۔ خاصی رات گئے تک اہم علمی، ادبی اور قومی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اس اجتماع میں شرکت کرنے والے بزرگوں میں سر محمد اقبال، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین(۱) ایسے حضرات شامل تھے اسی محفل میں مولانا ظفر علی خان نے حیدر آباد سے آنے کے بعد لاہور سے ''زمیندار'' شائع کرنے کا پہلی بار اعلان کیا تھا۔

مذکورہ بالا بیشتر بزرگ شہر کے اسی حصے میں رہتے تھے سر عبدالقادر تو تھڑیاں بھابھڑیاں سے ملحق ایک گلی میں رہتے تھے، سر شہاب الدین بازار جج عبداللطیف میں رہتے تھے جو بازار حکیماں سے جانب مغرب واقع ہے۔ اسی محفل کے ایک اور اہم رکن مولوی احمد دین صاحب مصنف ''سرگزشت الفاظ'' لوہاری منڈی کی ایک گلی میں قیام رکھتے تھے سر محمد اقبال جو اس زمانے میں یورپ سے ڈاکٹریٹ اور قانون کی سند لے کر آ چکے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں اس محفل

• بصد شکریہ، ایم آئی ملک، مرتبہ، دبستان اقبال، ۱۹۷۱، بحوالہ رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ، ص 289-304۔

میں شرکت فرمانے لگے تھے (۲)۔ وہ اس زمانے میں انارکلی بازار میں رہتے تھے۔
''للّی لاج'' تین بھائیوں۔ خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش صاحب اور خواجہ امیر بخش صاحب کی مشترکہ جائیداد تھی۔ خواجہ کریم بخش صاحب ان تین بھائیوں میں سے سب سے بڑے تھے۔ راقم الحروف انہی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا (۳)۔

میں نے علامہ مرحوم کو کم وبیش اس زمانے میں دس برس قریب سے دیکھا ہے اور یہ موقع مجھے اپنے مکان ''للّی لاج'' ہی میں ملتا رہا۔ خود ان کے مکان واقع انارکلی میں جانے کا موقع نہ ملا۔ جب میرے چچازاد بھائی خواجہ فیروز دین احمد کی شادی حضرت علامہ کی خواہر نسبتی سے ہوئی تو اس کے بعد میرا آنا جانا ان کے ہاں شروع ہو گیا۔ لیکن وہاں مجھے ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ میں ان کے ہاں بالعموم ان دنوں جایا کرتا تھا جب ان کے صاحبزادے آفتاب اقبال گجرات سے آ کر وہاں قیام کیا کرتے تھے۔ آفتاب صاحب میرے ہم عمر تھے اور خواجہ فیروز دین احمد صاحب کی شادی کے دوران ان سے میرے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے جو آج تک بدستور قائم ہیں اس زمانے میں حضرت علامہ مرحوم ہمارے ہاں آتے حقہ طلب فرمایا کرتے تھے اور بارہا میں خود ان کے سامنے حقہ لا کر رکھا کرتا تھا (۴)۔

۱۹۱۶ء میں میں نے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو خواہش ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا جائے لیکن اس میں دقت یہ آن پڑی کہ گورنمنٹ کالج میں صرف فرسٹ ڈویژن میں انٹرنس پاس کرنے والوں کو داخلہ ملتا تھا اور میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ چونکہ حضرت علامہ اس کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے اس لئے لیفٹیننٹ کرنل جے سٹیفنسن (Lt Col.J.Stephenson) پرنسپل گورنمنٹ کالج سے ان کے گہرے مراسم تھے چنانچہ میں نے حضرت علامہ سے ایک سفارشی رقعہ ان کے نام لیا اور مجھے بغیر کسی دقت کے کالج میں داخلہ مل گیا (۵)۔

۱۹۱۸ء میں ''للّی لاج'' کا مجلسی مرکز ختم ہو گیا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ پرانی محفلیں ختم ہو گئیں اور ان میں شامل ہونے والے سب بزرگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ حضرت علامہ اب میرے رشتہ کے عم محترم مولوی احمد دین کے مکان میں جو بازار حکیماں میں واقع تھا بیٹھنے لگے۔ مولوی صاحب مرحوم اس زمانے میں لوہاری منڈی سے نقل مکانی فرما کر اس مکان

میں آ چکے تھے۔ مولوی صاحب لاہور کے نامور وکلاء میں سے تھے اور برسوں اسلامیہ کالج کمیٹی کے سیکرٹری رہے۔ خاموشی سے علمی کام کرنے والے بزرگ تھے۔ عزیزی مشفق خواجہ نے حال ہی میں ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے(٦)۔

جیسا کہ میرے محترم بزرگ حکیم احمد شجاع صاحب مرحوم نے اپنی تحریروں(٧) میں ذکر فرمایا ہے ''للّی لاج'' کی محفلوں میں حضرت علامہ سر محمد اقبال کی صلاحیتوں کو پنپنے کا بہترین موقعہ ملا اس لئے کہ ان محفلوں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ بہترین ادبی ذوق رکھتے تھے یہ محفلیں شعر و ادب کا بہترین گہوارہ تھیں۔ علامہ محترم ''للّی لاج'' کی ان محفلوں میں اپنی شعری تخلیقات پیش فرماتے اور داد پاتے آپ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں جو طویل نظمیں اس زمانے میں پڑھیں وہ اکثر آپ نے انجمن کے جلس یسے پہلے اسی محفل میں سنائیں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ یہ تمام نظمیں میں نے ''للّی لاج'' میں حضرت علامہ کے قریب بیٹھ کر سنیں اگرچہ ظاہر ہے کہ میں ان کی بہت کم باتیں سمجھ سکتا تھا۔

''علی لاج کی محفلیں ختم ہونے کے دس برس بعد یعنی ۱۹۲۸ء میں میں نے لاہور میں ایک علمی ادارے، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی۔ اس سال لاہور میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا پانچواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے شعبہ عربی و فارسی کی صدارت حضرت علامہ اقبال نے فرمائی۔ میں نے ان کی زیر صدارت ایک مقالہ ''قرآن حکیم اور سائینٹفک سپرٹ'' بزبان انگریزی پڑھا(٨)۔

اب میرا ملنا جلنا حضرت علامہ سے از سر نو جاری ہو گیا۔ تا آنکہ ۱۹۳۴ء میں انجمن خدام الدین (شیرانوالہ دروازہ لاہور) نے اپنا پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''اسلام'' جاری کیا جس کی ادارت کا فریضہ میرے سپرد ہوا۔ حضرت علامہ مرحوم اس اخبار میں دلچسپی لینے لگے اور اس میں شذرات لکھنے میں بارہا میری رہنمائی فرماتے۔ ان کے متعدد مضامین اور بیانات بھی اس اخبار میں شائع ہوتے یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت علامہ قادیانیت پر بڑی کڑی تنقید کرنے لگے تھے آپ کا معرکہ آرا مضمون ''اسلام اور احمدی ازم'' سب سے پہلے اسی اخبار ''اسلام'' بابت مئی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ حضرت علامہ اس اخبار کو بالتزام ملاحظہ فرمایا کرتے تھے اور اس کے مضامین شائع ہونے سے پہلے پڑھ کر یا مجھ سے سن کر ان میں ردوبدل بھی تجویز فرماتے تھے(٩)۔

۱۹۳۴ء میں جب حضرت علامہ نے اپنا مکان "جاوید منزل" میورو ڈ پر تعمیر کرایا تو اسی زمانہ میں میں نے بھی اس سڑک کے دوسری طرف محلہ محمد نگر میں مکان بنا لیا تھا اس لئے میرا آنا جانا آپ کے ہاں روزمرہ کا معمول ہو گیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں گھر سے دفتر جانے کے لئے نکلتا اور یہ معلوم ہونے پر کہ حضرت علامہ گھر پر اکیلے بیٹھے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور اطمینان اسے ان کی باتیں سنتا رہتا اسی طرح رات کو جب میں دوست احباب سے مل کر گھر واپس لوٹتا تو پھر حضرت علامہ کے ہاں رکتا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اب ان کے پاس کوئی صاحب نہیں بیٹھے ہیں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور پھر خاصی رات گئے ان کی باتیں سنتا رہتا۔

میں نے کبھی حضرت علامہ سے کسی مسئلے پر بحث نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ ایک آدھ سوال کر دیا کرتا جس کے جواب میں حضرت علامہ علم کے موتی بکھیرتے رہتے میں بغور ان کی باتیں سنتا اور گھر آکر اپنی ڈائری میں ان کو انہی کے الفاظ میں محفوظ کر لیتا خوش قسمتی سے میرے اس زمانے کی ڈائری کے بعض اجزا آج تک محفوظ رہ گئے ہیں یہ یادداشت انہیں سے مرتب کی گئی ہے۔

اسی سال ۱۹۳۴ء میں جب علامہ مرحوم ابھی اپنی میکلوڈ روڈ والی قیام گاہ میں مقیم تھے جامعہ ملیہ نے مشہور عالم مجاہد حسین رؤف بے کو توسیعی لیکچروں کے لئے دہلی آنے کی دعوت دی میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے خط و کتابت کی اور غازی رؤف بے کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ فوری ۱۹۳۵ء میں لاہور تشریف لائے اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ عام میں انہوں نے تقریر کی۔ اس جلسے کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی۔ اس موقعہ پر خاصی رقم صرف ہوئی اس لئے کہ خود مہمان عزیز کے دہلی سے لاہور آنے کے اخراجات اور واپسی کے اخراجات کے علاوہ ایک بڑے پیمانے پر عصرانے کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑے اس رقم کی فراہمی میں حضرت علامہ نے میری بہت مدد فرمائی انہوں نے خود بھی ان کاموں کے لئے چندہ دیا اور لاہور کے کئی ایک رؤسا سے بھی چندہ دلوایا۔

غازی حسین رؤف بے دور حاضر کے عظیم ترین مجاہدین میں سے تھے۔ جنگ عظیم اول میں ان کے زیر کمان بحیرہ روم (Mediterranean Sea) میں ترکی جنگی جہاز "حمیدیہ" نے تہلکہ مچا رکھا تھا انقلاب ترکیہ کے بعد وہ جمہوریہ ترکیہ کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے بعد میں مصطفیٰ کمال پاشا سے اختلافات کی بناء پر انہیں اپنا وطن چھوڑ دینا پڑا تھا لیکن اس کے باوجود

انہوں نے ہندوستان میں اپنے لیکچروں میں ایک لفظ بھی مصطفیٰ کمال پاشا کے خلاف نہیں کہا۔

اس زمانہ کا ایک دلچسپ قصہ یہ ہے کہ جیسا اوپر بیان کر آیا ہوں میں اکثر اخبار ''اسلام'' کے شذرات اور اداریوں کے لکھنے میں حضرت علامہ سے مشورے لیا کرتا تھا۔ ان مشوروں کے وقت خان بہادر چودھری محمد حسین صاحب (جو حضرت علامہ کے بہت ہی مخلص دوست تھے) اکثر موجود ہوتے تھے وہ اس زمانہ میں پنجاب گورنمنٹ کے پریس ایڈوائزر تھے ادھر میں حضرت علامہ کے مشورے سے اخبار میں مضمون لکھتا ادھر چودھری صاحب کی طرف سے سرکاری چٹھی آجاتی کہ ایڈیٹر ''اسلام'' پریس ایڈوائزر سے آکر ملے اگرچہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اخبار پر میرا نام بحیثیت ایڈیٹر نہیں ہوتا تھا لیکن چودھری صاحب سے ملنے کے لئے ہمیشہ میں ہی جاتا اور وہ فرماتے ''آپ کے اخبار کا فلاں مضمون حکومت کی پالیسی کے خلاف ہے آئندہ ایسا مضمون نہ لکھئے گا'' میں ''بہت اچھا'' کہہ کر واپس آجاتا۔ اب جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی میں نے ایک مضمون ''اسلام'' کے صفحہ اول پر بعنوان ''مشرقی ممالک میں اہل مغرب کے مظالم'' شائع کیا جس میں مختلف انگریزی کتابوں کے ایسے ''اقتباسات جمع کر دیئے گئے تھے جن میں مسلمانوں پر اہل مغرب کے مظالم کی بڑی درد انگیز تفصیل تھی اس پر پریس ایڈوائزر کی طرف سے اطلاع آگئی کہ ''اسلام'' کے ناشر مبلغ پانچ سو روپے کی ضمانت داخل کریں۔ ہم نے ہائیکورٹ میں اس حکم نامے کے خلاف اپیل کی جو نامنظور ہوئی اس پر بجائے زر ضمانت داخل کرنے کے اخبار بند کر دیا گیا تاکہ ضمانت ضبط ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔

حضرت علامہ سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے ایک روز پیشتر ہوئی میں ''جاوید منزل'' کے صحن میں کھڑا ہوا علی بخش مرحوم سے حضرت علامہ کی صحت کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ حضرت علامہ نے کمرے کی بند کھڑکی کے شیشے میں میرا عکس دیکھا اور دوسرے ملازم رحمان سے جوان کے پاؤں دبا رہا تھا پوچھا کہ باہر کون کھڑا ہے اور جب اس نے میرا نام لیا تو آپ نے اس سے کہا ''انہیں اندر بلاؤ'' چنانچہ میں حسب الارشاد حاضر ہوا مزاج پرسی کے بعد آپ نے گفتگو شروع فرمائی جو بہت ہی پر اثر اور فکر انگیز تھی اس روز آپ کی باتوں میں بہت جوش تھا اور آپ بار بار بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتے اور پھر تھک کر لیٹ جاتے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آپ کو شدید تکلف ہو رہی ہے لیکن پ کے جوش کا یہ عالم تھا کہ گفتگو ختم ہونے میں نہ آتی تھی بالآخر میں نے موقع پا کر اجازت لی اور

اس احساس کے ساتھ باہر نکلا کہ آج میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہوئی۔ اگلے روز علی الصبح معلوم ہوا کہ گزشتہ شب حضرت علامہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک اور واقعہ یہاں قابل ذکر ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب حضرت علامہ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت فرما کر واپس وطن تشریف لائے تو میں نے پہلی مرتبہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ''یوم اقبال'' کی تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب بہت ہی کامیاب رہی۔ اس سلسلہ میں ایک عصرانہ بھی حضرت علامہ کے اعزاز میں دیا گیا اس کی مکمل کارروائی روزنامہ 'انقلاب'' مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی لیکن حضرت علامہ کی وفات کے بعد جو''یوم اقبال'' لاہور کی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے زیر اہتمام منایا گیا تھا۔ اسے عام طور پر ''پہلا یوم اقبال'' کہا جانے لگا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر مرحوم جو میرے بہت ہی مخلص دوست اور رفیق کار تھے اور جنہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کے اجلاس ''یوم اقبال'' میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا خود انہوں نے لاہور کے انگریزی روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں قیام پاکستان کے بعد ایک مضمون بعنوان 'پہلا یوم اقبال'' لکھا جس میں ۱۹۳۸ء میں ہونے والے یوم اقبال کو پہلا یوم اقبال قرار دیا۔ میں نے مولانا عبدالمجید سالک کے فرزند ارجمند ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو متوجہ کیا تو انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو متوجہ کیا جن نے روزنامہ انقلاب کی فائلوں میں سے ۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کا پرچہ برآمد کر لیا اور پھر انہوں نے روزنامہ ''کوہستان'' لاہور کی اشاعت مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۲ء میں ایک مضمون بعنوان ''پہلا یوم اقبال'' شائع کیا جس میں ۶ مارچ کی تقریب کی پوری کارروائی نقل کی گئی تھی۔

اب میں اپنی ڈائری کے وہ حصے نقل کرتا ہوں جن میں علامہ اقبال سے ملاقاتوں کی تفصیل ہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۴ء

آج رات ۸ بجے کے قریب ریلوے اسٹیشن سے گھر (۱۰) آتے ہوئے جب میں علامہ اقبال کی کوٹھی (۱۱) کے سامنے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ حضرت علامہ سے ملاقات کر لوں۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ آپ سامنے برآمدے میں چارپائی

پر لیٹے ہوئے ہیں اور ایک چھوٹی سی کتاب دیکھ رہے ہیں سوائے ایک ملازم کے جو آپ کے پاؤں (۱۲) دبا رہا تھا اور کوئی آپ کے پاس نہ تھا میں پونے نو بجے شب سے پونے گیارہ بجے شب تک آپ کے پاس بیٹھا رہا بڑی ہی پرلطف صحبت رہی۔ بے شمار باتیں آپ نے مختلف موضوعات پر فرمائیں اور اس تمام مدت میں ان کے اور میرے علاوہ اور کوئی شخص وہاں نہ آیا۔

جو لطف اور خوشی میں نے ان دو گھنٹوں میں حاصل کی وہ میری زندگی کا ایک بے بہا سرمایہ ہے یقیناً یہ دو گھنٹے میری زندگی کے بہترین اوقات میں سے تھے (۱۳)۔

جی چاہتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو حضرت علامہ نے میرے سامنے ارشاد فرمائیں لفظ بلفظ یہاں دہراؤں لیکن آپ کے ملفوظات کی کثرت مانع ہو رہی ہے ایک بہت بڑی خوش خبری آپ نے یہ سنائی کہ ''میرے دل میں اس بات کی بڑی زبردست خواہش تھی کہ قرآن پر اپنے خیالات تفصیل سے ایک کتاب میں ظاہر کروں'' انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ''میں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی تفصیل سے اپنے اشعار میں کر دیا ہے لیکن ابھی میرے دل میں اس سے بھی بڑی ایک چیز ہے جو قرآن حکیم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں'' اس کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس کام کو ایک ہی صورت میں یکسوئی کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ کم از کم پانچ سال کے لئے ان کو افکار روزگار سے فرصت مل جائے (۱۴)۔''

افسوس کہ دنیائے اسلام کے عدیم النظیر فلسفی کے لئے مسلمان قوم فراغت کا سامان مہیا نہ کر سکی۔ مسلمان قوم کی بے سروسامانی کا اس سے بڑھ کر بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

دوران گفتگو میں حضرت علامہ نے مسلمانان ہند کے متعلق فرمایا کہ میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بیکار ہو گئے ہیں بالخصوص ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ مسلمان۔

آپ کا خیال تھا کہ اگر کبھی کام آ سکتے ہیں تو غریب مزدوری پیشہ یا دوکاندار لوگ۔ جن کے لئے ان کے دل میں محبت اور احترام ہے۔ اور جن سے مل کر انہیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے (۱۵)۔ لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ ان کے نزدیک مستحق التفات نہیں یہاں تک کہ اگر وہ ''ڈکٹیٹر'' بن جائیں تو وہ اس گردہ کو ختم کر دیں (۱۶)۔

اس بات کا افسوس ہے کہ میری ڈائری صرف ۱۴ جولائی ۱۹۳۰ء سے محفوظ ہے اس لئے

ان اوراق میں اس تاریخ سے قبل کے اندراجات نہ ملیں گے۔

چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ چودھری صاحب اور سر فضل حسین کے ذریعے حکومت برطانیہ نے پراونشل آٹانومی کی روح نکال لی۔ موخر الذکر کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ان کا وجود ہمیشہ مسلمانوں کے لئے باعث مضرت رہا ہے اور وقت آرہا ہے کہ ان کی مزعومہ اسلام دوستی اور مسلم نوازی کے بے حقیقت راز سے پردہ اٹھ جاتے (۱۷)۔

کرنسی آفس کے مسلمانوں کو نماز جمعہ کی اجازت نہ ملنے کا معاملہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا کہ ان کے چند نمائندوں کو میرے پاس لائیں تو میں انہیں مناسب مشورہ دوں گا (۱۸)۔

ایک موقع پر جاپان کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ جاپان میں تبدیلی مذہب دنوں یا ہفتوں کا کام ہے نہ کہ یورپین ممالک کی طرح صدیوں کا۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر اسلام کا چرچا جاپان میں شروع ہو گیا تو چند ہفتوں میں پوری جاپانی قوم مسلمان ہو جائے گی۔ اس کی وجہ زیادہ تو سیاسی ہے جاپان کے لئے مسلمان ہو جانے میں یہ فائدہ ہوگا کہ روس کے خلاف اسے چین اور ترکستان کی زبردست اسلامی قوت کی حمایت حاصل ہو جائے گی (۱۹)۔

## ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء

گزشتہ شب میں سیر کرتا ہوا حضرت علامہ کے دولت کدے پر جا نکلا اس وقت آپ کے پاس قیصر صاحب (۲۰)، استاد عشق لہر (۲۱) اور ایک حکیم صاحب (۲۲) بیٹھے تھے۔ وہ لوگ دس بجے کے بعد چلے گئے اور میں حضرت علامہ کے ارشادات عالیہ سننے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ قریباً ایک گھنٹہ تک بہت ہی پر لطف صحبت رہی دوران گفتگو یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ یورپ والے جن باتوں کا صدیوں تک تجربہ کرتے رہے اب ان سے متنفر ہو چکے ہیں یورپ کے ایشیائی مقلدین انہیں چیزوں کے پیچھے لگے ہیں مثلاً عورتوں کی بے مقصد آزادی۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا "I have no faith in women" یعنی مجھے عورتوں پر کوئی اعتماد نہیں (۲۳)۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں پھر آپ نے فرمایا کہ عورت کو دماغ کمزور ملا ہے اس لئے کہ اس کی تخلیقی قوت اس کے رحم سے تعلق رکھتی ہے مرد دماغ سے کام لیتا ہے اور عورت رحم سے۔ جس

عورتوں کا رحم اپنا طبعی کام کرتا ہے یعنی جو بچے جنتی ہیں وہ زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہوتی ہیں بمقابلہ ان عورتوں کے جنہوں نے کبھی بچہ نہیں جنا۔

## ۳۰ نومبر ۱۹۳۴ء

گزشتہ ایک شنبہ کے روز میں تین چار دوستوں کے ہمراہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم لوگ قریباً دو گھنٹے آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔ علامہ محترم نے سیاسیات، اقتصادیات، تصوف و شریعت سبھی طرح کے مسائل پر حکمت و معرفت کے دریا بہائے ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ایک قوم یا فرد کو حالات کو ناساعت اور بخت کی ناموافقت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اخلاص اور فقر سے بھی انسان بے شمار فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ ایک مفلس آدمی جس کے پاس چھن جانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے حق و صداقت کی راہ میں وہ دلیری دکھا سکتا ہے جو ایک صاحب مال و زر نہیں دکھا سکتا۔

پھر آپ نے فرمایا "میں ملکی سیاسیات میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے کے لئے شامل نہ ہوا تھا بلکہ محض اس لئے کہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی حیثیت واضح متعین کر دوں اور یہ ظاہر کر دوں کہ اس ملک کے سیاسی ارتقاء میں حصہ لیتے ہوئے مسلمانوں کو دوسری قوموں میں مدغم نہ ہو جانا چاہئے۔ آپ نے واضح طور پر یہ بھی فرمایا کہ "میں نے گول میز نفرنس میں اس کے سوا اور کسی کارروائی میں حصہ نہیں لیا۔"

تعلیم کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ "مسلمانوں نے دنیا کمانے کے لئے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے۔ یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں اپنا دین کھو رہی ہیں۔

## یکم اپریل ۱۹۳۵ء

کل میں نے حضرت علامہ سے ادب لطیف کی تعریف پوچھی تو آپ نے ادب اور ٹ پر اظہار خیال فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ آرٹ کے متعلق دو نظریے ہیں اول یہ کہ آرٹ کا مقصد محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے۔ وم یہ کہ آرٹ انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے۔ ان کا ذاتی ل یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسانی زندگی کے لئے وقف ہونا چاہئے اور

اس لئے ہر وہ آرٹ جو انسانی زندگی کے لئے مفید ہو جائز ہے اور وہ آرٹ جو زندگی کے لئے مضر ہو نا جائز ہے۔ وہ آرٹ جو انسان کی ہمت کو ست اور اس کے جذبات عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابل نفرت ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہئے۔

اس کے بعد حکومت کے فرائض پر اظہار خیال ہوا اور حضرت علامہ نے فرمایا کہ ''حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے۔ لیکن اس سب سے بڑے فرض کو جدید دنیا تسلیم نہیں کرتی۔ حکومتیں محض سیاسیات سے تعلق رکھتی ہیں اور افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتیں۔

پھر اسلام اور تہذیب حاضرہ کا ذکر ہوا۔ فرمانے لگے کہ اسلام تہذیب حاضر کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے نہ کہ ان چیزوں کو جزو اسلام بنالیا جائے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا اب اسلام کی طرف آرہی ہے اس لئے اگر آج تہذیب مغربی تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہونے کا امکان ہے۔ جونہی تہذیب مغربی کا خاتمہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کر دینا چاہئے۔

آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ بعض قسم کے آرٹ قوموں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے چنانچہ ہندوؤں کی تباہی میں ان کی موسیقی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

## ۲۹ اپریل ۱۹۳۵ء

پرسوں رات حضرت علامہ نے بہت پر جوش باتیں کیں میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ضبط تحریر میں لے آؤں لیکن یہ اس وقت تو ممکن نہیں ہوتا اور گھر آ کر سب باتیں محفوظ کر لینا میرے بس کی بات نہیں اس روز آپ نے دوران گفتگو فرمایا۔

Character is a kind of energy. The more it is dissipated th weaker it becomes

(سیرت ایک قسم کی قوت ہے جتنا اسے بے کار صرف کیا جاتا ہے اتنی ہی یہ کمزور ہو جاتی ہے)

حضرت علامہ کی رائے میں دنیائے اسلام کی فلاح سلطنت برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے۔

## ۴ جولائی ۱۹۳۵ء

کل رات علامہ اقبال کے ہاں گیا تو وہاں پر تاج الدین صاحب مع اپنے دو ساتھیوں کے بیٹھے تھے تھوڑی دیر میں وہ حضرات چلے گئے تو حضرت علامہ کے اور میرے درمیان باتیں شروع ہوئیں کچھ دیر بعد چودھری محمد حسین صاحب تشریف لے آئے حضرت علامہ کی تمام گفتگو بڑے دقیق فلسفیانہ موضوعات پر تھی۔ آپ نے نبوت پر عموی اور نبوت محمدیہؐ پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی حضرت علامہ کا پختہ خیال ہے نبوت محمدیہ کی معنوی حیثیت کو ابھی تک انسان نہیں سمجھا۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بعض بزرگان سلف بھی اس کی کنہ کو نہیں پہنچے وہ مدعی تھے کہ خود ان کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے اور اس موضوع پر وہ تفصیل سے اپنی مجوزہ کتاب ''تمہید القرآن'' میں روشنی ڈالیں گے۔

## ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء

آج پھر حافظ حبیب اللہ صاحب کی معیت میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو چھڑ گئی میں نے پوچھا کہ جہاد دفاعی ہونا چاہئے یا جارحانہ، فرمایا کہ عام طور پر تو دفاعی ہے لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہوسکتا ہے مثلاً اگر کوئی قوم بداخلاقی میں اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے دنیا میں نسل انسانی کی تباہی کا امکان ہو تو مسلمان حکومتوں کا فرض ہے کہ بزور شمشیر اس وقت کو بداخلاقی سے روکیں۔ چنانچہ سلطان ٹیپو نے مالا بار کے وحشی باشندوں کو حکم دیا کہ بجائے برہنہ رہنے کے کپڑے پہننا شروع کر دیں ورنہ بزور شمشیر انہیں کپڑے پہننے پر مجبور کرے گا۔ اس لئے کہ ان کی برہنگی کا اثر ہمسایہ قوموں کے لوگوں پر ہوگا اور ان میں مسلمان بھی شامل ہیں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں کو ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے طاقت کی حمایت ہونی چاہئے ورنہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہے اگر مسلمان امر و نہی کے فرائض سرانجام دینا چاہتے ہیں تو ان کے بازوؤں میں طاقت (۲۴) ہونا ضروری ہے۔

## حواشی:

(۱) اس زمانے میں یہ حضرات صرف ''ڈاکٹر شیخ اقبال'' شیخ عبدالقادر اور چودھری شہاب الدین کے ناموں سے موسوم تھے۔ نائٹ ہڈ کا خطاب ان حضرات کو مدتوں بعد ملا۔

(۲) یہ محفل ۱۹۱۸ء میں منتشر ہو گئی اس لئے کہ والد مرحوم خواجہ کریم بخش سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر وسط ہند کی ایک ریاست میں چلے گئے تھے اور ہم محترم خواجہ رحیم بخش صاحب بھی بسلسلہ ملازمت مشرقی پنجاب میں رہنے لگے تھے میرے دوسرے چچا خواجہ امیر بخش صاحب کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں تھڑیاں بھابڑیاں کے تمام مکانات نذر آتش ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں میں نے اس آتش زدہ علاقے کو دیکھا تو تمام علاقہ جھونپڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔

(۳) میں ۸۔۱۰ برس کی عمر میں ان بزرگوں کی بہت سی باتیں نہ سمجھ سکتا تھا لیکن ان سب کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ بھی مدت تک حاصل رہا۔

(۴) خواجہ فیروز دین مرحوم چچازاد بھائی تھے (خان بہادر خواجہ رحیم بخش کے صاحبزادے) وہ اس زمانے میں علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انگلستان چلے گئے اور ۱۹۱۷ء میں وہاں سے بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے اور لاہور میں انہوں نے وکالت شروع کر دی قیام پاکستان سے قبل وہ لاہور کے چوٹی کے وکلاء میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر پنجاب میں مارشل لاء لگا تو لاہور میں سب سے پہلے جو سرکردہ لوگ سرکاری کارگزاریوں کی بناء پر گرفتار ہوئے ان میں خواجہ صاحب موصوف بھی شامل تھے ان کے ساتھ گرفتار ہونے والوں میں سید محسن شاہ صاحب ایڈووکیٹ لاہور بھی تھے۔

(۵) آفتاب اقبال صاحب بعد میں انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں اس وقت ان کا شمار ممتاز وکلا میں ہوتا ہے۔

(۶) میں نے حضرت علامہ کو شروع سے لے کر ان کی وفات تک (تقریباً تیس برس) حقہ پیتے دیکھا اور کبھی یہ نہیں سنا کہ انہوں نے اس تمام زمانے میں شراب کو ہاتھ لگایا ہو۔

(۷) داخلے کے لئے انٹرویو کے وقت پرنسپل نے حضرت علامہ کی سفارش کی وجہ سے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔

(۸) دیکھئے ''اقبال ریویو'' بابت جولائی ۱۹۶۷ء، مضمون زیرعنوان ''اقبال اور مولوی احمد دین''۔

(۹) ''خون بہا'' شائع کردہ تاج کمپنی لاہور اور لاہور کا چیلسی مجلہ نقوش لاہور، شمارہ نمبر ۱۰۴، جنوری ۱۹۶۶ء۔

(۱۰) اس مقالے کا اردو ترجمہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنے مشہور ماہنامہ ''معارف'' بابت جنوری و فروری ۱۹۳۰ء میں دو اقساط میں شائع فرمایا۔

(۱۱) انجمن خدام الدین کا یہ ترجمان ''اسلام'' ۷ جون ۱۹۳۴ء کو جاری ہوا اور مارچ ۱۹۴۰ء میں بند ہو گیا۔ اس تمام عرصے میں اس کی اشاعت میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔

(۱۲) میں اس زمانے میں مزار داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ سے ذرا آگے بڑھ کر ایک نئی آبادی میں رہتا تھا جو بعد میں ''بلال گنج'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

(۱۳) حضرت علامہ اس وقت تک میکلوڈ روڈ والے مکان میں رہتے تھے اور ''جاوید منزل'' کی تکمیل تک آپ اسی میں رہے۔

(۱۴) اس زمانہ میں حضرت علامہ کی صحت بگڑ چکی تھی اور اکثر ایک (آدمی) آپ کا جسم دبایا کرتا تھا۔

(۱۵) میں نے اس زمانے میں یہ دستور بنالیا تھا کہ حضرت علامہ کے پاس اسی وقت بیٹھتا جب دوسرا کوئی شخص نہ ہوتا اس لئے کہ یہ زمانہ کانگریس اور لیگ کے جھگڑوں کا تھا اور اکثر لوگ اسی قسم کے جھگڑے چھیڑ دیا کرتے تھے میں حضرت علامہ کی خدمت میں ان کے ارشادات عالیہ علمی موضوعات پر سننے کے لئے جاتا تھا اور اس بات کی بھی خاص کوشش کرتا تھا کہ خود کچھ نہ کہوں صرف آپ کو سنتا رہوں چنانچہ میرا اکثر یہ دستور تھا کہ کوئی سوال اسلام کی تاریخ یا تمدن کے متعلق کر دیتا اور اس کے جواب میں وہ جو کچھ فرماتے بغور سنتا رہتا اور پھر اپنے گھر پہنچ کر وہ تمام باتیں من وعن اپنی ڈائری میں ضبط تحریر میں لے آتا میری کوشش تو یہی رہی کہ میں مرحوم کے الفاظ میں من وعن لکھوں تاہم ہوسکتا ہے کہ کہیں کوئی لفظ یا جملہ ان کی زبان سے نہ نکلا ہو لیکن اس کے باوجود امید ہے کہ مفہوم آپ ہی کا ہوگا۔

(۱۶) حضرت علامہ عمر بھر روپیہ جمع نہ کر سکے اب انہیں اس بات کی فکر لاحق ہو چلی تھی کہ وہ چھوٹے بچوں کے لئے زندگی کا کچھ سروسامان مہیا کریں اور اس میں سب سے پہلی ضرورت سر چھپانے کے لئے مکان کی تھی اس کے لئے وہ جدوجہد کر رہے تھے اور ہائی کورٹ میں وکالت کا کام چھوڑنا نہیں

چاہتے تھے اوپر کے الفاظ اسی صورت حال کی غمازی کر رہے ہیں۔

(۱۷) بارہا ایسا دیکھا گیا کہ شہر اور بیرون شہر کے سیدھے سادے ان پڑھ لوگ آپ کے پاس آجاتے تو گھنٹوں آپ کی خدمت میں بیٹھے رہتے آپ خود بھی کھل کر ان سے باتیں کرتے اور ان کی باتیں سنتے بھی۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جہاں ان کے ہاں بڑے لوگوں کے گرم جوشانہ استقبال کا کوئی اہتمام نہ تھا وہاں ان غریبوں کے لئے آپ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی ہر شخص آپ تک بہ آسانی پہنچ سکتا تھا اور ایسے لوگوں سے آپ بہت محبت اور اخلاص سے ملتے تھے۔

(۱۸) حضرت علامہ نے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ''مسلمانوں کا مغربیت زدہ طبقہ سخت پست فطرت ہے (اقبال نامہ)۔

(۱۹) سر فضل حسین مرحوم پنجاب میں مسلم لیگ کے خلاف ہندو مسلمان اور سکھ زمینداروں کی باہمی تنظیم ''یونینسٹ پارٹی'' کے بانی اور زبردست حامی تھے۔ اس پارٹی نے آخر تک حصول پاکستان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ تقسیم ملک سے تھوڑی مدت پہلے مسلم لیگ کو یونینسٹ گورنمنٹ کے خلاف جب زبردست جدوجہد کرنی پڑی اور مسلمانوں اور حکومت پنجاب کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی تو اس وقت حکمران یونینسٹ پارٹی کی قیادت سر خضر حیات ٹوانہ کر رہے تھے جو سر سکندر حیات خاں کے بعد ان کے جانشین اور یونینسٹ پارٹی کی قیادت سر خضر حیات ٹوانہ کر رہے تھے جو سر سکندر حیات خاں کے بعد ان کے جانشین اور یونینسٹ پارٹی کے قائد منتخب ہوئے۔

(۲۰) کرنسی آفس اس زمانہ میں وہی ہوا کرتا تھا جو بعد میں ریزرو بنک اور پھر اسٹیٹ بنک کے سپرد ہوا۔ اس زمانے میں دفتر کے سربراہ یعنی کرنسی آفیسر ایک سخت متعصب ہندو مسٹر کالی چرن تھے جو مسلمان عملے کو طرح طرح سے پریشان کرنے کی عادی تھے۔ ان دنوں وہ مسلمان عملے کو ظہر کی نماز اور نماز جمعہ کی ادائی سے روکا کرتے تھے۔ بعد میں ان کی شکایت وائسرائے کی مجلس منتظمہ کے فنانس کے ممبر کو پہنچائی گئی جس کے نتیجے میں تحقیقات کے بعد ان کا تبادلہ سے کسی دوسری جگہ ہو گیا۔

(۲۱) علامہ مرحوم کا خیال تھا کہ کسی بڑی آزاد قوم کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا دنیا میں اسلام کے لئے موجب احیا ہوگا اس لئے ان کی یہ آرزو تھی کہ جاپانی یا جرمن ایسی کوئی قوم مسلمان ہو جائے ان کی یہ آرزو عین منشائے ایزدی کے مطابق تھی اس لئے کہ قرآن میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان اسلام کے لئے جدوجہد کرنے سے احتراز کریں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی اور قوم کھڑی کر دے گا جو اللہ کی راہ میں

مارنے اور مرنے سے گریز نہ کرے گی۔ ہم عصر مسلمان ملکوں اور قوموں کے متعلق بھی حضرت علامہ کی رائے بالعموم اچھی نہ تھی اس لئے کہ بیشتر ممالک یا تو مغربی استعمار کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے یا مغربی تمدن کے مقلد ہو چکے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جب تک مسلمان قومیں مغربی اقوام کی غلامی سے آزاد نہ ہوں احیائے اسلام کا کام نہیں ہو سکتا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ کھلم کھلا مغرب کے خلاف مسلمانوں کو بغاوت، پر آمادہ کرنے لگے تھے جیسا کہ ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کے صفحات سے صاف عیاں ہے۔

(۲۲) ملک لال دین قیصر لاہور کے مشہور سیاسی کارکن اور پنجابی زبان کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ اکثر تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ لاہور کی ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اس برادری نے قبل از تقسیم ملک اور بعد قیام پاکستان بہت سے ممتاز کارکن اور سرکاری افسر مہیا کئے۔ مثلاً قائداعظم کی وفات کے بعد ملک غلام محمد جو پاکستان کے گورنر جنرل ہوئے وہ اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر محمد منیر، اسٹیٹ بنک کے سابق گورنر مسٹر عبدالقادر اور اٹامک انرجی کمیشن کے سابق چیئرمین ڈاکٹر نذیر احمد، سب اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲۳) استاد عشق لہر پنجابی کے مشہور و معروف شاعر تھے۔

(۲۴) ان حکیم صاحب سے میں واقف نہ تھا اور نہ ان سے اس موقع پر تعارف ہوا۔

(۲۵) اس سے مراد محض یہ تھی کہ قومی زندگی میں قیادت عورتوں کے بس کی چیز نہیں ورنہ حیات اجتماعی میں عورتوں کے مقام کے متعلق ان کے خیالات عالیہ ان کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں ان کے کلام میں جا بجا عورت کے فرائض اصلیہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان فرائض میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت عورت کا فریضہ امومت ہے اور تہذیب حاضرہ کے بدترین نتائج میں عورت کی اولاد سے محرومی ہے چنانچہ ایک موقعہ پر اس تہذیب کا خلاصہ آپ کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

مرد بے کار و زن تہی آغوش

(۲۶) حضرت علامہ کی تمام کتابوں میں ''جہاد'' پر زور دیا گیا ہے اور جہاد کے لئے طاقت مہیا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے ایک مقام پر تو یہاں تک فرما دیا کہ:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

# دانائے راز۔۔۔ڈاکٹر اقبال•

خواجہ غلام السیّدین

اقبال سے آشنائی تو ان کے کلام کے ذریعہ اس وقت تھی جب اس کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا شعور نہ تھا لیکن جب تھوڑا بہت ادبی ذوق اور ان کے کلام کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو بہت جلد یہ شناسائی عقیدت میں تبدیل ہوگئی۔ پھر کئی مرتبہ جب کبھی لاہور جانا ہوا، ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت ملی، کچھ خط و کتابت بھی رہی۔ ایک مرتبہ علی گڑھ میں ان کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا۔ جب وہ یونیورسٹی کی دعوت پر ''اسلامی فکر کی تعمیر نو'' پر اپنے خطبات دینے وہاں تشریف لائے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ بھوپال میں سر راس مسعود کے ہاں مقیم تھے، ان کے ساتھ چند روز گزارنے کا اتفاق ہوا لیکن کتنی مختصر تھیں یہ ملاقاتیں جن میں ایک طرف حافظہ اب تک روشن اور لطف اندوز ہے اور دوسری طرف اس محرومی کی خلش کھٹکتی ہے کہ سمندر کی ہم عصری نصیب ہوئی اور چُن پائے چند خزف ریزے! لیکن پھر سوچتا ہوں کہ شخصیت، علم و فضل، عظمت و کمال کے سرچشموں سے نیازمندی ایسی چیز نہیں جن کو وقت کے گز سے ناپا جائے۔ اس لیے ذاتی صحبت اور ملاقات میں کسب فیض کے جو موقعے ملے اس کے لیے شکر کرنا چاہیے۔ پھر ان کے کلام فکر و کلام کی دولت، جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے، گزشتہ چالیس سال سے میرے مطالعہ میں رہی ہے اور جوں جوں اس پر غور کیا اس کی معنویت اور اس کے حیات بخش پیغام کا نقش میرے دل پر زیادہ گہرا ہوتا گیا ہے۔

---

• بصد شکریہ، خواجہ غلام السدین، آندھی میں چراغ، بحوالہ ،صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 245-251۔

مشاہیر میں سے دو بزرگوں کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال، دوسرے سر سید راس مسعود۔اس عقیدت مندی میں ہندوستان کے ہزاروں، لاکھوں آدمی میرے شریک ہیں کیونکہ ان کی صحبت ایک فیض جاری تھی جس میں ہر قسم کے لوگ آتے اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق مستفید ہوتے۔ طالب علمی کے زمانہ میں مجھے اقبال کی ذات سے بالواسطہ یعنی ان کے کلام کی وجہ سے عقیدت تھی لیکن جب ان کی ملاقات کی نعمت نصیب ہوئی تو مجھے اس حقیقت کا ازسرنو احساس ہوا کہ جو انسان واقعتاً بڑے ہوتے ہیں وہ اپنے کا ...وں سے بھی کہیں زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ان کا روشن دماغ ایک فوارۂ نور تھا جو ایک متحرک لائٹ ہاؤس کی طرح چاروں طرف کے اندھیرے کو روشن کر دیتا تھا۔ان کے خیالات میں جدت او ...گی اور اظہارِ خیال میں ایک خاص ندرت تھی۔وہ جس مسئلے کو بیان کرتے، جس حقیقت کے ...ے سے نقاب اٹھاتے، اس میں ان کا معنی آفریں دماغ عجیب عجیب اور نئے نکتے پیدا کرتا ...ر ان کی لطیف ظرافت خشک سے خشک مسئلے میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دیتی۔وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے لیکن برخلاف عام شعرائے کے جو خود کو براہ راست خدا کا شاگرد ...تے تھے اور مطالعے اور غور کو اپنی شان کے خلاف جانتے ہیں۔

انہوں نے اپنا مطالعہ تمام عمر نہایت سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھا اور ان کی بدولت ان کا علم و عرفان زیادہ تر وسیع اور گہرا اور متنوع ہوتا گیا اور ان کی شاعری ایک آلہ تفریح کے بجائے ہدایت اور معرفت کا سرچشمہ بن گئی۔ان کی شاعری اور فلسفے میں بھی ان کی زندگی کی طرح ایک عالمگیر وسعت اور رواداری تھی۔اس میں جبریل اور ابلیس، رومی اور نطشے، غالب اور گوئٹے، بھرتری ہری اور قرۃ العین سب کے لیے گنجائش تھی کیونکہ یہ تمام شخصیتیں حقیقت کے مختلف پہلو بے نقاب کرتی ہیں۔ان کے دل و دماغ کا مرکز اسلام کی تعلیم کی صحیح اور مبصرانہ تفسیر تھی لیکن انہوں نے کبھی عام مولویوں کی طرح دنیا کے گونا گوں علوم اور مشاہدات اور تجربات سے روگردانی نہیں کی بلکہ ہر طرف کی روشنی سے اپنے مرکزی مقصد کو منور کیا۔عمر کے آخری دور میں ان کی شان فقر بہت بڑھ گئی تھی۔وہ دنیا کی جھوٹی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے اور نسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچ گئے تھے

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر　　　میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ پاسبان کی حاجت تھی، نہ اجازت طلبی کی ضرورت۔ ان کا دروازہ امیر و غریب، عالم و جاہل، دیسی بدیسی سب کے لیے کھلا تھا اور ہر طرح کے لوگ ان کے پاس آتے۔ علمی، سیاسی، مذہبی مسائل پر بحث کرتے۔ مقامی معاملات پر مشورہ کرتے۔ ان کے لطیفے اور چٹکلے سنتے، حقہ پیتے۔ بعض محض زیارت کرتے اور اس بندۂ خدا کے دل میں سب کے لیے جگہ تھی۔ ہر ایک سے اس کی سمجھ اور مذاق کے مطابق مخاطب ہوتے اور انسانیت کے رشتۂ مشترک کا پورا احترام کرتے۔ جب کوئی صلاحیت رکھنے والا شخص ان کی صحبت سے اٹھتا تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ اس کی زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ قدرت بہت کم لوگوں کو اس قدر روشن دل و دماغ بخشتی ہے!

شعر اور فلسفہ کا میل کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ بعض شاعروں کا فلسفیانہ رجحان ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری ان کے فلسفے کی سیل کو نہیں تھام سکتی۔ فلسفہ سے مرعوب ہو کر رہ جاتی ہے۔ بعض شاعر محض زبان کی تراش و خراش اور لطف پر بس کرتے ہیں۔ ان کا کلام یا تو معنی کے لحاظ سے کھوکھلا ہوتا ہے یا ان کے شعروں میں صرف ہنگامی جذبات اور تاثرات کی عکاسی ہوتی ہے اور بس۔ اقبال کا کلام معنی اور بیان دونوں کے اعتبار سے ایک حسین اور فکر انگیز شاہکار ہے جس میں لطف بیان اور معنی آفرینی کا ایک نادر امتزاج پایا جاتا ہے۔ اگر شاعری محض ''معنی منظوم'' ہو تو اس میں کشش نہیں ہوتی۔ اگر صرف لفظوں کا کھیل ہو تو دماغ کو اسیر نہیں کر سکتی۔ اقبال کے کلام کو پڑھتے ساری عمر بیت گئی لیکن اس کی شگفتگی، اس کی نشاط انگیزی، اس کی معنی آفرینی میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس کے نئے نئے پہلو ذہن کے سامنے آتے رہتے ہیں اور اس کی روشنی زندگی کے نئے گوشوں کو منور کرتی ہے۔ ان کا دماغ ایک متحرک فوارۂ نور تھا جس طرف مڑ جاتا جوت جگا دیتا۔ ان کے خیالات میں جدت اور روشنی تھی اور اظہار خیال میں ایک خاص شگفتگی۔ وہ جس مسئلے کو بیان کرتے، جس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے اس میں ان کا معنی آفرین دماغ انوکھے نکتے پیدا کرتا۔ ان کی لطیف ظرافت خشک سے خشک عالمانہ بحثوں میں بھی دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دیتی۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے لیکن برخلاف عام شعرائے کرام کے جو خود کو براہ راست خدا کا شاگرد سمجھتے ہیں اور مطالعہ اور غور و فکر کو اپنی شان کے خلاف جانتے ہیں۔ انہوں نے ساری عمر سنجیدہ مطالعہ کا شغل جاری رکھا اور اس مطالعہ اور فکر خلاق کی بدولت ان کا علم اور

عرفان زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا گیا اور ان کی شاعری محض سرمایۂ تفریح ہونے کی بجائے ہدایت اور معرفت کا سرچشمہ بن گئی۔ ان کے کلام اور فلسفے میں ان کی زندگی کی طرح ایک عالمگیر وسعت اور رواداری تھی۔ اس میں جبرائیل اور ابلیس رومی اور نٹشے، غالب اور گوئٹے، رام اور بھرتری ہری، فاطمہ زہرا اور قرۃ العین سب کے لیے گنجائش تھی کیونکہ یہ تمام شخصیتیں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے کشمیر کے خطبات میں بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ اقبال میں یہ فکری رواداری کس قدر کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور انہوں نے کس عقیدت اور محبت کے ساتھ مثلاً ہندو فلسفیوں، مفکروں اور مذہبی رہنماؤں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے فکر کا مرکز یقیناً اسلام کی تعلیم تھی اور اس کی مبصرانہ تفسیر لیکن انہوں نے کبھی عام مولویوں اور تنگ نظر عالمان دین کی طرح دوسرے مذہبوں کی تعلیم یا جدید علوم اور تجربوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہر طرف سے روشنی لی اور اس سے اپنے مرکزی مقصد کو منور کیا۔

اقبال کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی نئی بات کہنا آسان نہیں لیکن ہر شخص کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے جس سے وہ افراد اور واقعات اور فکری تحریکوں کو جانچتا اور پرکھتا ہے اور شاید اس طرح غیر شعوری طور پر خود کو بے نقاب کرتا ہے۔ اقبال کی سیرت اور فکر کے بہت سے پہلو ہیں جن میں سے صرف دو کے ذکر پر بس کروں گا۔ ایک تو اقبال کی بارگاہ کی شان جس میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے ان کے کلام کی انسان دوستی اور عالمگیریت جو میرے نزدیک ان کی فکر کی سب سے بڑی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

اقبال کا ایک شعر ہے ؎

نہ تخت و تاج میں، نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اقبال کی صحبت میں ایسی ہی ایک بارگاہ کی شان نظر آتی تھی۔ ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں نہ پاسبان کی اجازت تھی، نہ اجازت طلبی کی ضرورت، نہ چھوٹے بڑے گمنام نامور، دیسی بدیسی جاہل عالم، غریب امیر، ہندو مسلمان، سکھ عیسائی کی کوئی تمیز ان کے گھر کی طرح ان کے دروازے بھی تمام انسانوں کے لیے کھلے ہوئے تھے مگر اس میں مختلف لوگوں کے لیے الگ الگ خانے نہ تھے۔ ہر طرح کے لوگ ان کے پاس

آتے اور اس چشمۂ فیض سے اپنے ظرف کے مطابق سیراب ہو کر جاتے۔ بعض علمی، سیاسی، فلسفی، مذہبی مسئلوں پر گفتگو کرنے آتے۔ بعض مقامی معاملات کے بارے میں مشورہ کرنے۔ بعض ان کی گفتگو سے لطف اٹھانے اور ان کے شوخ لطیفوں اور قصوں کو سننے۔ بعض محض گپ کرنے اور حقہ پینے اور بعض شوق زیارت میں۔ کئی مرتبہ یہ تماشا دیکھا کہ وہ اپنے برآمدے میں ایک نیم شکستہ مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور ہر طرح کے لوگ، طالب علم، پروفیسر، مغرب کے ارباب علم وادب، سوسائٹی کے مشاہیر نواز، خواتین، گاؤں کے جاہل لیکن عقیدت مند ملاقاتی۔ ان کے پاس آئے اور وہ سب سے ان کی عقل اور دلچسپی کے مطابق تپاک کے ساتھ باتیں کرتے اور ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے۔ نہ کسی کی جہالت اور آداب مجلس سے ناواقفیت پر چیں بہ جبیں ہوتے نہ کسی کی قابلیت اور وجاہت سے مرعوب۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ کسی مشہور غیر ملکی مفکر سے فلسفہ یا ادب کی گہری حقیقتوں پر گفتگو کر رہے ہیں اور بیچ بیچ میں ان کے نیم جاہل ملاقاتی جن کو اس گفتگو کی سمجھ ہوتی، نہ اس میں دلچسپی حقے کی نے کو ان کی طرف موڑتے اور سلسلۂ کلام کو بے تکلفی سے توڑ کر کہتے "ڈاکٹر صاحب تم حقہ پیو نا۔" اور ڈاکٹر صاحب فلسفے کو ملتوی کر کے ان سے ایک دو باتیں کرتے یا ایک آدھ فقرہ چست کرتے اور پھر اپنی سنجیدہ علمی گفتگو میں مشغول ہو جاتے۔ اس وقت ان کا دماغ کبھی علم و آداب کے خزانے لٹاتا۔ کبھی تاریخ اور فلسفے کے رازوں کو بے نقاب کرتا۔ کبھی ایک تیز نشتر کی طرح زندگی پر تنقید کرتا اور سماجی ناسوروں سے فاسد مادے کو خارج کرتا۔ کبھی اہل سیاست کے بلند آہنگ دعوؤں اور ریاکاریوں کا پول کھولتا۔ لیکن اس تنقید میں نہ مردم بیزاری تھی نہ مردم آزاری۔ ہاں شوخی اور ظرافت ہوتی، برتر فکر اور بہتر زندگی کی ترجمانی ہوتی اور گداز قلب کی دھڑکن اور یہی جذبہ ان کی شاعری میں جاری وساری ہے۔ جب کوئی صاحب ذوق یا باعلم شخص ان کی صحبت سے اٹھتا اسے محسوس ہوتا کہ اس کے ذہن اور زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔

ان کی طبیعت میں فقر اور بے نیازی کا ایک خاص انداز تھا جو صرف انہیں لوگوں کے حصے میں آتا ہے جو دراصل بڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کبھی یہ فکر نہ ہوئی کہ دوسروں پر اپنی عظمت کا نقش قائم کریں اور فکر کیوں ہوتی؟ ہمالیہ پہاڑ کبھی خود اپنی بلندی کا اعلان نہیں کرتا۔ ان کو نہ سر بلندوں سے انکسار تھا، نہ خاکساروں سے سربلندی۔ ہر شخص انسان ہونے کی حیثیت سے انسانی

سلوک کا مستحق تھا بلکہ میں نے کبھی کبھی یہ دیکھا کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ گرم جوشی اور آمادگی سے ملتے اور جن لوگوں کو دولت اور منصب کی وجہ سے دنیا بڑا سمجھتی ہے ان سے ملنے میں تامل کرتے۔ انتقال سے کوئی دو سال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس مسعود کے مقامی دوست اور بیرونی عمائدین برابر ان کے ہاں آتے رہتے تھے اور جب آتے قدرتاً اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے۔ اقبال اکثر یہ کہتے ''کیوں بھئی مسعود کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کو کسی طرح ٹال دو۔'' برخلاف اس کے جب وہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اکثر وہاں کے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باتیں کرتے۔ یہ وہی اقبال تھے نا جنہوں نے کہا ہے ؎

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام
زیدہ ام صدق و صفا اندر عوام

دراصل اقبال کو جو زبردست شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی وہ ان کی غیر معمولی قابلیت اور شاعرانہ کمال کا اعتراف ہے جو خلاف معمول انہیں اپنی زندگی ہی میں حاصل ہوا۔ ورنہ دنیا میں نام حاصل کرنے کے لیے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے اُن سے وہ بیگانہ تھے۔ دنیاوی ترقی مصلحت پسندی چاہتی ہے اور ان کا اصول تھا:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

دنیاوی ترقی کا مطالبہ یہ ہے کہ جو صاحبان قوت اور اختیار ہیں ان کی ہمنوائی کرو اور ان کے خوان کرم سے جو ریزے گریں ان کو شکریئے کے ساتھ قبول کرو لیکن یہاں حق گوئی اور بے باکی کی بدولت اپنوں اور بیگانوں سب کو ناراض کرنے کا حوصلہ تھا اور زہر ہلاہل کو قند کہنے سے انکار۔ انہوں نے کبھی مصلحت اندیشی کے خیال سے اپنی سچی اور بے امان تنقید کی تلوار کو میان نہیں کیا اور کس کس پر تنقید نہیں کی؟ حکومت برطانیہ، حکومت ہند اور حکومت پنجاب پر، ہندوؤں اور مسلمانوں پر، غلامی کی ذہنیت اور آزادی کی بے راہ روی پر، مشرقی تصوف اور مغربی تہذیب پر، سرمایہ داری اور سوشل ازم پر، جمہوریت اور فاش ازم پر، شاعری پر جو افیون کی طرح خواب آور ہو، عقل پر جس کی مہار عشق کے ہاتھ نہ ہو یعنی ان تمام بتوں پر جو افراد اور جماعتوں نے اپنے دل

ودماغ میں بٹھار کھے ہیں اور جن کی پوجا میں وہ اکثر بنیادی صداقتوں کو بھول جاتے ہیں ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذان لا اِلٰہ اِلاَّ اللہ!

اگر وہ زبانِ نثر میں یہ سب باتیں کہتے تو حکومت کو ان کی زبان بندی لازم ہو جاتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ حکومتوں میں ادبی ذوق اور شعر سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

مگر بُت شکنی کتنی ہی ضروری ہو، وہ بت شکن کو ہر دلعزیز نہیں بناتی۔ یہ اقبال کی شاعری کا اعجاز ہے کہ باوجود عمر بھر اس ناگوار فرض کو انجام دینے کے انھوں نے، اُن کی فکر نے، ان کے کلام نے ہماری نسل کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور وہ ہماری ذہنی، جذباتی اور روحانی میراث کا ایک جزوِ عزیز بن گئی ہے۔

# میرا بھائی(۱)●

کریم بی بی/ انٹرویو محمد شفیع

اقبال ۱۸۷۴ء(۲) میں پیدا ہوئے۔ میں ان سے تین سال چھوٹی تھی، ہم گھر میں چار بہنیں اور دو بھائی تھے۔ اس سے پہلے دو بھائی اور دو بہنیں پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیارے ہوئے۔

میرے والد بہت صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کے متعلق ہم بھائی بہنوں کو یہ علم تھا کہ ہم سب جب سو جاتے ہیں تو وہ اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ صاحبِ احوال بزرگ تھے، ایک رات جو میری بڑی بہن جاگیں تو انہوں نے دیکھا کہ ابا کے کمرے میں دودھیا روشنی ہو رہی تھی، دوسرے روز میری بہن نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا تو ابا نے صرف اتنا کہا ''افوہ، تمہیں یہ کیسے پتہ چل گیا؟'' اور پھر اپنے اوراد و وظائف کے لیے ایک دوسری جگہ تلاش کر لی۔

اقبال کی پیدائش سے پہلے میرے والد نے خواب دیکھا کہ ایک کبوتر اڑتا اڑتا ان کی جھولی میں آگرا۔ میرے والد نے سمجھا کہ یہ ایک خوش بخت اور بلند اقبال بیٹے کی پیدائش کی بشارت ہے۔(۳)

میری والدہ غریب الطبع اور روزے رکھنے والی بزرگ خاتون تھیں۔ وہ گھر کا بڑا اچھا نظام رکھتی تھیں۔ والد کو گھر کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گھر کا سارا کام کاج والدہ کے ذمہ تھا، کیا مجال جو وہ گھر کے انتظامات میں ذرہ بھر بھی گڑبڑ پیدا ہونے دیتیں۔

اقبال کے پیدا ہوتے ہی ہمارے گھر کا نقشہ بدلنے لگا۔ میرے والد کی آمدنی جو گزارہ

● بعد شکریہ، آفاق، لاہور، 30 اپریل 1949، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 252-255۔

کے لیے پہلے بھی کافی ہوتی تھی، بڑھ گئی اور ہمیں جیب خرچ کے لیے ایک دھیلے کے بجائے ایک ایک پیسہ ملنے لگا۔ اس زمانہ میں ایک پیسے کے دو بلکہ چار لڈو ملا کرتے تھے۔

والد صاحب یوں تو ہم سب کو ہی پیار کرتے تھے لیکن انہیں اقبال سے خاص شغف تھا۔ انہوں نے اقبال کو کبھی ایک بار بھی تُو یا تُم کہہ کر نہیں بلایا بلکہ جب کبھی اقبال کے متعلق اُن کی غیر حاضری میں والدہ سے بات کرتے تو انہیں جمع کے صیغے میں یاد کرتے تھے مثلاً ''اِقبال ہوریں کتھے نیں؟''

ایک دفعہ والدہ نے کسی بات پر اقبال کے گالوں پر چانٹا رسید کیا تو والد نے انہیں یہ کہہ کر فہمائش کی کہ حضور ﷺ نے تاکیداً فرمایا ہے کہ بچوں کے گال پر چانٹا نہیں مارنا چاہیے۔

اس وقت ہماری نانی زندہ تھیں، ہم دونوں بھائی بہن نانی کے ہاں چلے جایا کرتے اور بیری کے درخت پر چڑھ جاتے اور بیر توڑ توڑ کر کھایا کرتے۔ نانی ہزار جان سے فریفتہ ہو کر اقبال کی بلائیں لیتیں۔

اقبال نے ختمِ قرآن کے بعد مولوی میر حسن کے گھر پر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں لڑکیوں کے سکول میں جاتی تھی۔ بالآخر جب اقبال سکول میں داخل ہوئے تو مجھے یاد ہے کہ وہ چھٹی میں ہوتے تھے اور میں تیسری میں۔

وہ کھلنڈرے بہت تھے۔ سکول سے واپس آتے ہی بستہ پھینک پھانک کر کبوتر اڑانے لیے بھاگ جاتے، پھر بھی اتنے ذہین تھے کہ چوتھی جماعت میں انہوں نے وظیفہ حاصل کیا لیکن نویں جماعت میں فیل ہو گئے۔ اسی طرح ایم اے کے امتحان میں بھی وہ پہلی بار فیل ہو گئے تھے۔

اس زمانے میں سیالکوٹ میں سسّی پنوں کا میلہ لگا کرتا تھا، لوگ سوانگ بھر کر بازاروں میں پھرا کرتے تھے، میں بھی میلہ دیکھنے کے شوق میں راج بازار چلی گئی۔ اقبال نے مجھے وہاں دیکھ لیا۔ سخت برہم ہوئے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر واپس گھر چھوڑ گئے۔ حالانکہ میں بالکل چھوٹی سی تھی۔ وہ جب کبھی مجھے ننگے سر دیکھتے تو ٹوکا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آج تک مجھے سر سے دوپٹہ اتارنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

انہیں پتنگ اڑانے کا بڑا شوق تھا۔ پہروں کوٹھے پر چڑھے پتنگ اڑایا کرتے۔

اقبال نویں جماعت میں تھے کہ ان کی منگنی ہو گئی۔ دسویں جماعت میں ان کا ۔ا۔ہو

گیا۔ اقبال کی پہلی بیوی ان سے عمر میں بڑی تھیں، اس لیے شروع ہی سے ان دونوں کی طبیعت نہ مل سکی۔

دسویں جماعت کے بعد والد نے صلاح کی کہ اقبال کو تجارت میں لگا دیا جائے لیکن والدہ نے اصرار کیا کہ انھیں ضرور پڑھانا چاہیے۔ چنانچہ اقبال کو سیالکوٹ کے مرے کالج میں داخل کرادیا گیا۔

ہمارے ہمسایہ میں ایک بیاہی ہوئی نوجوان لڑکی رہتی تھی جس کا خاوند پردیس گیا ہوا تھا، وہ گاہے بگاہے اپنے خاوند کو مجھ سے خط لکھوانے یا اُس کا آیا ہوا خط پڑھوانے آیا کرتی تھی، اقبال کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے بُرا منایا اور والدہ کو علیحدہ بلا کر کہا کہ بیاہی ہوئی لڑکی کا اپنے خاوند کے نام کنواری لڑکیوں سے خط لکھوانا ٹھیک نہیں۔

جب اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت گئے تو والدہ دن رات ان کے لیے دعاؤں میں مصروف رہتیں۔ ہر بُدھ وار کو اقبال کا خط آیا کرتا تھا۔ میری والدہ نہا دھو کر خط کے انتظار میں کھڑکی کے پاس بیٹھتیں اور جب ڈاکیہ آتا تو ہمک کر اس سے خط لیتیں اور ہم سے کئی بار پڑھوا کر سنا کرتی تھیں۔ اقبال ہر خط میں والدہ کو دعاؤں کے لیے لکھا کرتے تھے۔

جب والدہ کا انتقال ہوا تو ہم سب بھائی بہن سیالکوٹ میں اکٹھے ہوئے۔ اقبال بھی لاہور سے پہنچے۔ انہوں نے والدہ کے جنازے کے قریب کھڑے ہو کر کہا: ”میں تیرے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔“

بات یہ تھی کہ جب اقبال دودھ پیتے تھے تو ہمارے والد کی آمدنی کے متعلق والدہ کو کچھ شک ہو گیا، والدہ نے اقبال کو چھاتی سے دودھ پلانا بند کر دیا اور اپنا زیور بیچ کر انہیں دودھ پلانے کے لیے بکری خرید لی۔ جب تک والدہ کو والد کی کمائی کے متعلق پورے طور پر یقین نہ ہو گیا انہوں نے چھاتی سے دودھ نہ پلایا۔ اس طرح ننھے اقبال کے جسم میں رزقِ حلال کے علاوہ مشتبہ کمائی میں سے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہ جانے دیا۔ اقبال والدہ کے اس احسان کو کبھی نہ بھولے۔

جب ہم اپنے گھروں میں آ گئیں تو اقبال سے ملاقات کم ہو گئی لیکن پھر بھی جب میں میری دوسری بہنیں ان سے ملنے جاتیں تو وہ ہمیں روپے دیا کرتے تھے۔ عید بقرعید کے موقع پر وہ کبھی ہمیں بھولتے ہی نہ تھے۔

ان کے انتقال سے کافی عرصہ پہلے میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ میری چھوٹی بہن بیماری میں ان کے پاس تھیں۔ انھوں نے میرے متعلق پوچھا بھی اور مجھ سے ملنے کی خواہش بھی کی لیکن میں اپنے بیٹے کے ساتھ دہلی میں تھی اور پھر اس کی تبدیلی پر شملہ چلی آئی۔ اس لیے مجھے ان کی بیماری کا پتہ نہ چل سکا۔

ایک روز میرا بیٹا (۴) دفتر گیا تو اخبار ہاتھ میں لیے جلدی ہی واپس گھر آ گیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ بھائی کے مرنے کی وجہ سے دفتروں میں چھٹی ہو گئی تھی، میں جب لاہور پہنچی تو انہیں سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) یہ مضمون علامہ کی چھوٹی بہن کریم بی بی کے ایک انٹرویو سے مرتب کیا گیا ہے جو محمد شفیع نے اُن سے لیا اور آفاق، لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں چھپا۔

(۲) انہوں نے علامہ کا سال یادداشت سے لکھا ہے۔ ان کا قیاس بڑی حد تک درست ہے، جدید ترین تحقیق کے مطابق علامہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔

(۳) یہ واقعہ علامہ کی تقریباً تمام سوانح میں مذکور ہے۔

(۴) غالباً اشارہ اپنے بڑے لڑکے ظفر الحق کی طرف ہے۔

# وضع سادہ•

ڈاکٹر السعد مسعود

حضرت علامہ اقبال کے جوانی کے دور کا تو مجھے علم نہیں البتہ جاوید منزل میں رہائش کا تھوڑا سا زمانہ یاد ہے۔ بچپن میں مجھے دنیا کی اس قابل فخر ہستی کے پڑوس میں رہنے کا شرف حاصل رہا۔ جاوید منزل کے سامنے سے گزرنا سکول کے زمانہ کا معمول تھا، آج سے پچیس سال پہلے ساتویں، آٹھویں جماعت کے طالب علم کا ذہنی شعور کیا ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ تو اس وقت مشکل ہے، البتہ مجھے ایک دو باتیں ابھی تک یاد ہیں۔ ان میں علامہ مرحوم کا لباس بھی ہے۔ میں نے علامہ مرحوم کو سفید قمیص، سفید شلوار، کالی ٹوپی اور کالے جوتے میں نہایت سادگی کے ساتھ ملبوس دیکھا ہے۔ ان کا سفید و شفاف رنگ تو خدا کی طرف سے انہیں ظاہری حسن کے طور پر عطیہ تھا مگر اس پر انہوں نے سادہ طرزِ زندگی اختیار کر کے خداداد حسن میں اور بھی اضافہ کر لیا تھا۔

علامہ مرحوم کی زندگی کے متعلق کچھ روز ہوئے ایک دوست سے باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ دوست ملک عبدالحیٔ ہیں اور بچپن میں جاوید اقبال کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ میں نے علامہ مرحوم کے بستر کے متعلق دریافت کیا تو کہنے لگے کہ ان کے کمرے میں داخل ہونے کی جرأت تو خاص خاص آدمیوں کو ہوتی تھی، البتہ ایک دفعہ گھر میں ان کی رضائی کے متعلق بات ہوئی تھی۔ علامہ مرحوم رضائی کا استر کھدر کا لگواتے تھے۔ ایک بار گھر میں کسی نے کہا کہ آپ کے پاس بڑے بڑے آدمی آتے ہیں، مناسب ہوگا کہ استر کسی نفیس کپڑے کا لگا دیا جائے، جواب میں فرمایا مجھے

• بصد شکریہ، نوائے وقت، لاہور، 21 اپریل 1961، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 191-192۔

لوگوں سے کیا غرض! مجھے تو اپنا آرام وآسائش دیکھنا ہے۔ اس کے بعد ان کی رضائی کا استر کھدر کا ہی رہنے دیا گیا۔

سادگی کے متعلق ایک اور واقعہ ملک عبدالحئی صاحب نے بیان کیا کہ ایک دن گھر میں کسی بچی کے سر کے بال وقت کے تقاضے کے مطابق بنے ہوئے دیکھے، حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یہ طرز اچھی نہیں البتہ سادہ مینڈھوں والا پرانا طریقہ بہت ہی اچھا ہے۔ ایک دن منہ ہاتھ دھو چکے تو گھر میں سے کسی نے کہا کہ آپ نے صابون سے منہ نہیں دھویا، جواب میں فرمایا جو پہلے ہی حُسین ہوں انہیں صابون کی حاجت نہیں ہوا کرتی۔ یہ جواب بھی اُسی قسم کا ہے جو علامہ مرحوم نے ایک دفعہ اپنے اُستادِ مکرم کو دیا تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ جماعت میں دیر سے آئے تھے، استاد نے پوچھا: ''اقبال دیر سے کیوں آئے ہو؟'' جواب دیا۔ ''اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔''

# اقبال رحمۃ اللہ سے ایک ملاقات●

ڈاکٹر ریاض الحسن

۱۹۳۵ء کی شروع گرمیاں تھیں کہ ہندوستان کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومتِ کینیڈا نے معاشیات یا سیاسیات میں تحقیقات کے لیے ونسنٹ ماسی وظیفہ دو سال کے لیے دینے کا اعلان کیا۔ میں نے اس کے لیے درخواست بھیج دی اور اپنے پروفیسروں سے مناسب سرٹیفکیٹ حاصل کر کے اس کی نقلیں اس درخواست کے ساتھ منسلک کر دیں لیکن اس کے بعد مزید تفصیل حاصل کرنے کا خیال ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کے لیے ایک کمیٹی بن گئی ہے اور منجملہ دیگر ممبروں کے دو کے نام معلوم ہو سکے یعنی مسٹر رلیا رام سیکرٹری وائی ایم سی اے لاہور اور جسٹس دلیپ سنگھ لاہور۔ چنانچہ میں نے ان دونوں حضرات سے ملنے کا ارادہ کیا تا کہ مزید تفصیلات معلوم کر سکوں۔ اس خیال سے الٰہ آباد سے روانہ ہونے سے قبل میں اصغر گونڈوی سے ملا اور ان سے اپنے لاہور جانے کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ لاہور جاؤ تو اقبالؔ سے ضرور ملو اور ساتھ ہی ایک تعارفی خط بھی دے دیا۔

میں ۲۳ یا ۲۴ مئی کو لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں نہ تو رلیا رام ہیں اور نہ جسٹس دلیپ سنگھ۔ پھر ۲۵ مئی کی شام کو میں اقبالؔ کی کوٹھی واقع میکلوڈ روڈ پر گیا۔ میں اس وقت یہ نہیں بتا سکتا کہ آیا اس سڑک کا صحیح نام یہی تھا یا کوئی اور، اس لیے کہ میرا حافظہ سڑکوں وغیرہ کے معاملہ میں بہت کچا ہے۔(۱)

میں چہار دیواری کے اندر داخل ہوا تو سامنے چھوٹا سا میدان تھا۔ میدان کے آخر میں

● بعد شکریہ، ساغر کراچی، 30 نومبر 1974، بحوالہ صابر کلوروی، اقبال کے ہم نشین، ص 175-181۔

کوٹھی تھی، کوٹھی کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور برآمدے کے پیچھے اقبالؔ کے ملنے کا کمرہ تھا۔ جب میں داخل ہوا تو میں نے ان کے ملازم علی بخش کو دیکھا۔ میں نے اصغر گونڈوی کا تعارفی خط اس کے ہاتھ میں دیا اور انتظار کرنے لگا، تین چار منٹ کے بعد اُس نے آ کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔

میں جب کمرے میں داخل ہوا تو اقبال ایک پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے لیٹے ہوئے تھے، میں نے السلام علیکم کہا تو انہوں نے جواب دے کر ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

مجھے نہیں معلوم ہوا کہ دو تین دن پہلے ان کی بیگم یعنی والدۂ جاوید کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی صرف خیریت دریافت کی اور ماتم پرسی کی بابت کچھ نہ کہا۔ کوئی سال ڈیڑھ سال پہلے میں نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے عالمگیر شہرت کا ناول ''نوجوان ورتھر کی داستانِ غم'' کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا اور اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب کو بھیج چکا تھا، میں نے اس ترجمے کی بابت ان سے سوالات کیے تو جو کچھ انہوں نے کہا، اُس کو میں اُس ناول کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں بیان کر چکا ہوں۔ اس لیے یہاں دوبارہ دوہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

اس کے بعد عالمِ اسلام کے موضوع پر ان سے دلچسپ گفتگو ہوئی۔ انہوں نے عالمِ اسلام کے درخشاں اور شاندار مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ لاہور میں انگریزوں کے آنے سے قبل ایسے محلے تھے جن میں وسط ایشیا، افغانستان اور ان کے باشندے مستقل حیثیت سے رہتے تھے اور ان میں ایسے بھی تھے جو تھوڑی مدت کے لیے لاہور آتے تھے۔ پھر اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے لیکن انگریزوں نے ہندوستان میں ان قوموں کی آمد اور لاہور میں ان کے قیام کو رفتہ رفتہ کم کرنے کی پالیسی اختیار کی اور اس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ لاہور میں وسط ایشیا کا کوئی خاندان آباد نہیں ہے جس کا سلسلہ براہِ راست وسط ایشیا سے آمد و رفت کی بنا پر ہو۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمان افغانوں، ایرانیوں اور ترکوں سے دور ہوتے گئے۔

اس کے بعد اقبال نے کہا لیکن اب ایسا زمانہ آ رہا ہے جب وہ مغربی قومیں جنھوں نے مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اس پالیسی کو چھوڑنے پر سیاسی حالات کی بنا پر مجبور ہو جائیں گے اور ان قوموں کے درمیان رابطہ بڑھانے

کی کوشش کریں گے۔ اس وقت مسلمانوں کے عالمی اتحاد کو منظم کرنے کا اچھا موقع ہوگا۔

اس پر میں نے سوال کیا کہ وہ کیا سیاسی حالات ہوں گے جن پر مغربی اقوام اپنی قدیم معاندانہ پالیسی ترک کر دیں گی۔

اس پر ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ذرا زور پیدا ہو گیا اور وہ بولے کہ روس کا اشتراکی انقلاب مغربی اقوام کے لیے ایک بڑے خطرے کا حامل ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مغربی ممالک کو ان مسلمان قوموں کے تعاون کی ضرورت ہوگی جو روس کی سرحد پر آباد ہیں۔ اس میں ترکی سے لے کر ہندوستان تک کے مسلمان ہوں گے۔ اس طرح مغربی ممالک مسلمان ملکوں میں ربط ضبط بڑھانے اور ان کو ایک متحدہ مقصد کے لیے آپس میں متحد ہونے کی دعوت دیں گے۔

پھر میں نے سوال کیا کہ کیا ہندوستان کے مسلمان بھی اس اتحاد میں شریک ہوں گے کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اشتراکیت کا پرچار شروع ہو گیا ہے۔

اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ممکن ہے کہ مسلمان اشتراکیت کے بعض اصول مان لیں مگر یہ تسلیم کر لینا وقتی ہوگا کیونکہ مجموعی طور پر مسلمان اشتراکی طرزِ زندگی کو جس میں خدا کا کوئی تصور نہیں ہے، کبھی دل سے قبول نہیں کر سکتے۔ اشتراکیت کو مان لینے سے گویا وہ خود اپنی زندگی کی نفی کر دیں گے اور جو قوم ایسا کرتی ہے، وہ زندہ نہیں رہتی۔

پھر میں نے پوچھا کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر انہوں نے کہا کہ روس کے اشتراکی دباؤ کی بنا پر شاید وہ اشتراکیت کے بعض اصول وقتی طور پر قبول کر لیں مگر اس کا سخت ردعمل ہوگا اور وہ بھی کوئی موقع پا کر اس اصول کو دریا بُرد کر دیں گے، پھر انہوں نے کہا کہ میں تصور نہیں کر سکتا کہ امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) اور دوسرے عظیم مسلمان مفکرین کا ملک اپنی زندہ روایات کا منکر ہو جائے۔

پھر انہوں نے کہا کہ اگر ہندو مسلمان مسئلہ طے ہو جائے تو مجھے قوی امید ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اسلام کی نشاۃ الثانیہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ (۲)

❁❁❁

## حواشی: از صابر کلوروی

(۱) سڑکوں کے بارے میں ڈاکٹر ریاض الحسن نے اپنے حافظے کے بارے میں جو ارشاد کیا ہے درست ہے۔ جاوید اقبال کی والدہ کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو ہوا تھا۔ علامہ اقبال ۲۱ مئی ۱۹۳۵ء کو میکلوڈ روڈ سے اٹھ کر جاوید منزل واقع میو روڈ (موجودہ علامہ اقبال روڈ) میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ جاوید اقبال کی والدہ کا انتقال اسی کوٹھی میں ہوا تھا، لہٰذا موصوف نے علامہ سے جاوید منزل میں ملاقات کی تھی نہ کہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر۔

# اقبال کے ہاں ایک شام•

ڈاکٹر سعید اللہ

۲۱ نومبر ۱۹۳۷ء کو پروفیسر عبدالواحد اور میں سر اقبال کی کوٹھی کے بائیں دروازے سے داخل ہوئے۔ علی بخش اپنے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ اس سے علیک سلیک ہوئی۔ پوچھا، کیا ہم ڈاکٹر صاحب سے مل سکتے ہیں۔ علی بخش نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی بچی منیرہ بیمار ہے۔ ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ یہ کہتے ہوئے علی بخش ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں گیا۔ اور فوراً ہی ''آ جاؤ جی'' کی آواز آئی۔ ہم کوٹھی کے وسطی کمرے میں داخل ہوئے، جس کی سامنے کی دیوار پر سر اقبال کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں ہے۔ اس کمرے سے گزر کر بائیں ہاتھ پر جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں پہنچے۔ سر اقبال پلنگ پر لیٹے تھے۔ لحاف کو دو دفعہ تہہ کر کے پاؤں کی طرف رکھا ہوا تھا اور ڈاکٹر صاحب وہی پرانا سبز حاشیے اور بادامی رنگ کا دُھسہ لیے لیٹے تھے۔ پلنگ کے پاس میز پر کچھ کتابیں تھیں اور دو تین نیچے فرش پر۔ ڈاکٹر صاحب کے پلنگ کے پاس ایک نوجوان ہندو ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ ہم نے ''السلام علیکم'' کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا، آیئے۔

میں عمومیت کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا اپنا تجربہ یہی ہے کہ جب کبھی ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، سلام کا جواب ہمیشہ ہاتھ اٹھا کر دیا۔ رسمی گرمجوشی نہیں ہوتی تھی اس کی جگہ خندہ پیشانی ہوتی۔ جن لوگوں کو ان سے پہلی دفعہ ملنے کا اتفاق ہوتا ان پر یہ طریق ملاقات کسی قدر گراں گزرتا۔ مگر جو ڈاکٹر صاحب کی راہ و رسم سے واقف تھے وہ خوب جانتے تھے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی بڑی شخصیت گزری ہو جس کا دروازہ اس طرح ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلا رہا

• بصد شکریہ۔ محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 103۔115۔

ہو۔ صلائے عام تھی جس کا جی چاہتا چلا آتا، گھنٹوں بیٹھتا، باتیں کرتا۔ انہیں کبھی ناگوار نہ گزرتا۔ دو چار ملنے والے جاتے تو دو چار اور آ جاتے۔ صبح سے شام تک یہ دھارا یوں ہی بہتا چلا جاتا۔ اکثر دل میں سوال پیدا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کس وقت کھانا کھاتے ہیں۔ کب پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں! لوگ بھی ہر طرح کے ملاقات کے لیے آتے۔ ہم ملاقات کے لیے پہنچے تو دیکھا کہ کوئی حکیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ ان سے طب سے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ حکیم صاحب گئے تو اخبار نویس آ گئے اور سیاسیات کی بحث شروع ہو گئی۔ سیاسیات کی بحث چل رہی تھی کہ ایک اور بزرگ آ گئے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے سیاسیات سے جو گریز کیا تو خوش طبعی اور لطیفہ گوئی شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض عقیدت مند ایسے بھی تھے جنہیں وہ بنایا کرتے تھے۔ دوسری دفعہ جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جرمن سیاح ملنے کے لیے آیا ہوا ہے۔ اور فلسفۂ خودی اور زمان و مکان پر بحث ہو رہی ہے۔ وہ صاحب اُٹھ کر گئے تو ایک پہلوان آ گئے۔ ان سے پہلوانی کی باتیں ہوتی رہیں۔ بات کسی قسم کی ہو سر اقبال کا اپنا رنگ قائم رہتا تھا۔

جو لوگ ڈاکٹر صاحب کو ان کی شاعری کے ذریعہ جانتے ہیں اُن کو اس بات کی مطلق خبر نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں مزاح اور خوش طبعی کس شدت سے تھی۔ کسی قسم کا موضوع ہو مزاح کا پہلو وہ ہمیشہ نکال لیا کرتے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حکایات سنانے میں انہیں ویسا ہی کمال حاصل تھا جس طرح فلسفہ کے مسائل بیان کرنے میں۔ جس موضوع سے بحث کرتے اُس پر گویا مرتب اور مدوّن رسالہ پیش کر دیتے۔ اور سننے والوں کو یوں معلوم ہوتا گویا ساری عمر صرف اسی ایک موضوع کی نذر کر دی ہے۔

لوگ ملاقات کے لیے آتے تو سر اقبال خوش ہوتے مگر لوگوں کی شخصیت سے ڈاکٹر صاحب کو چنداں سروکار نہ ہوتا۔ ہر شخص ان کے لیے چند خیالات کا مجموعہ تھا۔ اس لیے ہر ایک سے اس کی بساط کے مطابق باتیں کرتے اور اسی وجہ سے رسمی گرمجوشی سے نہیں ملتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو طرح طرح کے خطوط آتے۔ ہندوستان کے اور ہندوستان کے باہر کے۔ ان خطوں کا جواب وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ جو سوال کیا جاتا اس کا جواب دیتے۔ یہ کام گو بہت مشکل اور صبر آزما ہے مگر یہ فرض وہ خندہ پیشانی سے انجام دیتے۔ یہ وصف سر اقبال کی خصوصیات میں شامل تھا۔

گوشہ نشینی بھی ان کا ایسا وصف تھا جس کی پابندی نہایت سختی سے کرتے۔ اپنے گھر سے باہر شاذ و نادر ہی نکلتے تھے۔ جسے ملنا ہوتا تو وہیں آ جاتا۔ چائے کی دعوت ان کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوتی۔ فرماتے کہ ان پارٹیوں میں کھانے کو تو کچھ مل جاتا ہے مگر روحانی تکلیف ہوتی ہے۔

سر اقبال کی لمبی ''ہُوں'' نہایت پُرمعنی اور مخصوص چیز تھی۔ اس کا استعمال گفتگو میں اکثر ہوتا۔ کسی مسئلہ پر کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد خاموش ہو جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد یہ ''ہوں'' نمودار ہوتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مسئلہ زیر بحث نے خیالات میں ہیجان پیدا کر دیا ہے اور مسئلہ زیر بحث کے متعلقات کی وسعتوں اور گہرائیوں میں ڈوب کر پھر سے ابھرے ہیں۔ یہ ''ہوں'' کی ایک صورت تھی۔ دوسری صورت یہ ہوتی کہ جب کوئی شخص کوئی بات کہتا جس سے ڈاکٹر صاحب کو اتفاق نہ ہوتا۔ تو آپ خاموش رہتے اور پھر کچھ وقفہ کے بعد یہ ''ہوں'' نمودار ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب گفتگو ہمیشہ پنجابی میں کرتے۔ اگر کوئی ایسے بزرگ تشریف لے آتے جو پنجابی سے ناواقف ہوتے تو حسبِ ضرورت اردو، فارسی، انگریزی میں گفتگو فرماتے۔ دورانِ گفتگو میں جب خاموشی کا وقفہ آ جاتا تو اکثر سر کے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرتے۔ اور کبھی کبھی ''یا اللہ'' کی ضرب لگاتے۔

یہ جملہ معترضہ کسی قدر لمبا ہو گیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو سر اقبال پلنگ پر لیٹے تھے اور ایک نوجوان ہندو ڈاکٹر پاس بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بچی کو بخار اور نزلہ کی شکایت کی ہے۔ بچی گرم کپڑے نہیں پہنتی۔ کہتی ہے، مجھے سردی نہیں لگتی۔ آخر بیمار ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ معمولی امراض کا علاج تو ڈاکٹر کر سکتے ہیں، اکثر بیماریاں اُن کے بس کا روگ نہیں۔ مثلاً تپدق، ذیابطیس، ٹائیفائیڈ۔ لاہور میں اب صرف ایک حکیم ہے قرشی، مگر وہ کتابیں لکھتا ہے، علاج معالجہ کی طرف توجہ کم کر دی ہے۔ نمونیا کا شرطیہ اور حکمی علاج کرتا ہے۔ نوجوان ڈاکٹر نے کہا، نمونیا خود بخود دسویں دن غائب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''ہوں''۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کل ایک حکیم میرے پاس آیا۔ شدت سے جھکّی تھا۔ بہت لمبی تقریر کرتا رہا۔ جب تقریر ختم کی تو میں نے پوچھا کہ آپ کے مریض بچ بھی جاتے ہیں۔ کہنے لگا،

یہ قصہ رہنے دیجئے۔ وقت علاج کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا، کسی شخص نے حکیم محمود خاں دہلوی سے کہا کہ آپ کے مریض بھی مرتے ہیں اور دوسروں کے بھی۔ پھر ان میں اور آپ میں فرق کیا ہوا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ آں قرم ساقان بے قایدہ ے کشند و من با قاعدہ۔

فرمایا کہ میری والدہ کو درد گردہ اس شدت سے ہوتا تھا کہ ہمیں ان کی موت سامنے نظر آیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ وہ درد گردہ سے بے ہوش پڑی تھیں۔ رات کا وقت تھا کہ حکیم نور الدین صاحب قادیانی نے آ کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حکیم صاحب نے جو گھر میں ہیجان دیکھا تو پوچھا، کیا بات ہے۔ ہم نے صورت حال بیان کی۔ حکیم صاحب نے کہا، میں ذرا دیکھوں۔ حکیم صاحب نے ایڑی کے قریب کسی رگ کو دبایا تو والدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ حکیم صاحب نے کہا، اب رات کا وقت ہے۔ اس وقت تو سینک کرو۔ صبح باقاعدہ علاج ہو گا۔ صبح ہوئی تو حکیم صاحب نے والدہ کے لیے چوزہ تجویز کیا۔ کہا۔ اس کا شوربہ پئیں اور گوشت کھائیں۔ اس علاج کا یہ اثر ہوا کہ والدہ کو پھر عمر بھر درد گردہ کی شکایت نہ ہوئی۔ والدہ عرصۂ دراز تک چوزہ کھاتی رہیں۔ کھاتے کھاتے تنگ آ گئیں تو حکیم صاحب کو لکھا گیا کہ اگر مناسب ہو تو چوزے کا بدل بتا دیں۔ جواب آیا، انڈا بدل ہے۔

فرمایا، ”ایک دفعہ جب میں انارکلی میں رہتا تھا مجھے gout (جوڑوں کے درد) کی شکایت ہوئی۔ حکیم نور الدین صاحب لاہور آئے ہوئے تھے۔ علی بخش کو ان کے پاس بھیجا کہ میں درد کی وجہ سے چلنے سے معذور ہوں، اگر آپ تشریف لے آئیں تو عنایت ہو گی۔ علی بخش کی معرفت جواب آیا کہ کھانا کھا کر مرغی کے پر کو حلق میں ڈال کر قے کر دو۔ میں کھانا کھا چکا تھا۔ علی بخش مرغی کا پَر لایا۔ قے کر دی۔ درد جاتا رہا۔ مستقل طور پر نہیں۔ میرے بائیں گردے میں درد ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر ایکس ریز فوٹو لیا گیا۔ معلوم ہوا گردے میں پتھری ہے۔ ڈاکٹر نے ولایت جا کر اپریشن کروانے کی صلاح دی۔ میں جانے کو تیار ہو گیا۔ اتنے میں مولوی میر حسن صاحب کا سیالکوٹ سے خط پہنچا۔ انہوں نے اپریشن کی مخالفت کی تھی۔ میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثنا میں دہلی سے حکیم نابینا صاحب کا خط آیا کہ مجھے اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ آپ پتھری کا اپریشن کروانے ولایت جا رہے ہیں۔ آپ دہلی آ جائیں، بغیر اپریشن کے پتھری دُور ہو

جائے گی۔ میں گیا۔ چودھری محمد حسین اور علی بخش ساتھ تھے۔ درد کم ہو چکا تھا، مگر گرانی کا احساس شدت سے تھا۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ایک گولی دی کہ اسے ابھی کھا لیں۔ پانچ بجے سہ پہر تک گرانی جاتی رہے گی۔ چنانچہ ویسے ہی ہوا۔ باقاعدہ علاج کے لیے دوائی دے کر رخصت کر دیا۔ لاہور آ کر دوائی شروع کی تو پیشاب کا رنگ سیاہی مائل ہونا شروع ہوا۔ روز بروز زیادہ سیاہی مائل ہوتا گیا۔ آخر کم ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اصلی رنگ پر آ گیا۔ سال بھر دوائی کھاتا رہا۔ اس کے بعد دس سال سے دردِ گردہ نہیں ہوا۔ اب چند دن ہوئے معمولی سا ہوا، مگر دوسرے گردے میں۔ حکیم صاحب کو لکھا گیا۔ انہوں نے دوائی بھیج دی۔"

کچھ دیر ڈاکٹر صاحب خاموش رہے اور انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے رہے۔ پھر فرمایا، حیدر آباد میں ایک انگریز پروفیسر ہے جو میری بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ لکھا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے جسم میں گرم ملک کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے اُسے لکھا کہ آپ ملازمت نہ چھوڑیں۔ گرم ملک کے جراثیم آپ کے جسم میں نہیں ہو سکتے۔ اگر ہوں گے تو ڈاکٹر کے دماغ میں۔ باقی رہے مغربی جراثیم، سو وہ میرے جسم میں ہو سکتے ہیں آپ کے جسم میں نہیں۔

فرمایا، ایک دفعہ میں حکیم اجمل خاں صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کے دو بجے کے قریب میری داڑھ میں درد ہونے لگا۔ میں نے حکیم صاحب کے ملازم کو جگایا اور اسے کہا کہ حکیم صاحب کو جگاؤ۔ اس نے کہا، حکیم صاحب زنانے مکان میں سو رہے ہیں۔ یہ مشکل کام ہے۔ میں بضد ہوا تو وہ حکیم صاحب کو جگا کر لایا۔ میں نے حکیم صاحب سے صورتِ حال بیان کی۔ انہوں نے ملازم سے کچھ کہا۔ وہ تھوڑی دیر میں کوئی چیز لے آیا۔ حکیم صاحب نے کہا، جس ڈاڑھ میں درد ہے اُس پر اسے رکھ کر اوپر کی ڈاڑھ سے دبا دو۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ تھوڑی دیر میں درد جاتا رہا۔ میں نے حکیم صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا چیز تھی۔ فرمایا، ہمارے بزرگوں نے نادر شاہ سے جواہرات کے تھال لے کر یہ چیز تو اسے دی تھی جس سے اس کا درد جاتا رہا تھا، مگر اس کی اصلیت نہیں بتائی تھی۔ بھلا میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں۔ حکیم صاحب مسکرائے اور فرمایا، ادرک اور اس پر پسا ہوا نمک۔

میں نے سوال کیا کہ آپ نے ''وقت'' کو تلوار کہا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟

اے خوش آن وقتے کہ سیفِ روزگار
یا توانا دستیٔ ما بود یار!

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ''وقت'' تلوار اس لیے ہے کہ انسان پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بڑھاپا آتا ہے، پھر موت۔ یہ وقت کی تلوار ہے۔ ''وقت'' ایک طرح سے رحمت بھی ہے کہ گزر جاتا ہے۔ تکلیف آئی اور گزر گئی۔

میں نے دوسرا سوال کیا کہ حدیث ہے: ''دہر کو برا مت کہو، دہر خدا ہے'' اس کا کیا مطلب ہے۔ پہلے تو ہوں ہاں کرتے رہے۔ آخر کہا کہ reality کا لازمی جزو ''دہر'' ہے۔ اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا، پیرس میں برگساں سے جب ملاقات ہوئی تو اسے gout کی شکایت تھی۔ پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ نوکر کرسی کو چلا کر اِدھر اُدھر لے جاتا تھا۔ میں نے برگساں کو یہ حدیث سنائی تو کرسی سے اچھل پڑا۔ پوچھا، یہ کون کہتا ہے۔ میں نے کہا، ہمارا رسول ﷺ۔ ''وقت'' کو ہم eternal مانتے ہیں، مگر وہ بھی گزر رہا ہے۔ اگر ان دونوں کو ملایا جائے تو جس چیز کو ہم now کہتے ہیں وہ eternal now بن جاتی ہے۔ reality دو معنوں میں لی جا سکتی ہے، ایک extensive اور دوسرے intensive۔ Intensive سے مراد یہ ہے کہ مثلاً ایک گیند اپنے محور کے گرد حرکت کرتے اور گردش میں اس کا رنگ بدل جائے۔ ''وقت'' تو اس تمیز سے پاک ہے۔ زرتشت تو غالباً ایک خدا کو مانتا تھا، مگر ایران میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت موجود تھی۔ ایک روشنی (دن) اور دوسرا تاریکی (رات)۔ ان دونوں کا اجتماع reality ہے۔ قرآن میں بار بار دن اور رات کا ذکر آتا ہے۔ ہندو تو ''وقت'' کو مایا کہتا ہے۔ بدھوں نے اس کی اصلیت کو مانا ہے اور اس کے حصے کیے ہیں۔ وقت کا atomic تصور بدھوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا، ''وقت'' کا تصور personality کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان truth کا متلاشی تھا۔ ایران beauty کا۔ اور عرب goodness کا۔ اسلام نے تینوں کو personality میں جمع کر دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب پھر خاموش ہو گئے اور میں نے تصوف کی بحث چھیڑ دی۔ فرمایا، تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے۔ یونانی تصوف، ایرانی تصوف، ہندوستانی تصوف،

سب انحطاطِ قومی کے نشان ہیں۔ اسلامی تصوف بھی اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔ اسلام کے اولیں دور کے صوفی زہاد تھے۔ زُہد اور تقویٰ ان کا مقصد تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعات اور نظریات شامل ہو گئے۔ تصوف اب محض زُہد نہیں رہتا۔ اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں۔ یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ "وحدت اور کثرت" کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے اور اس کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے۔ وہ فلسفہ اور وہ مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشوونما کے منافی ہو بیکار چیز ہے۔ تصوف نے scientific روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے تعویذ تلاش کرتے ہیں۔ گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جدوجہد سے کرنے کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش ہے۔ "شجرِ ممنوعہ" میرا خیال ہے تصوف سے مراد ہے۔ خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام میں جائیں ؎

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

پھر فرمایا، اناالحق کے معنے یہ نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ "انا" ہی اصلی چیز ہے۔ بندہ اگر خدا میں گم ہو گیا تو اس نے اپنی ہستی مٹا دی۔

پروفیسر عبدالواحد نے پوچھا evolution کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا، پسندیدہ ہے مگر اسے اصلیت نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اونٹ کی گردن اس لیے لمبی ہو گئی کہ اسے اپنی خوراک شاخوں پر تلاش کرنی پڑی۔

تصوف کی بحث "کرامات"، "دستِ غیب" اور "بخشش" کے سوال کو لے آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ قصے سمجھ میں تو نہیں آتے، مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کبھی سمجھ میں آ جائیں۔

دستِ غیب سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مولانا وحید الدین سلیم نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے پیر حضرت غوث علی قلندر نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ ہمارا دوست تھا۔ ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں۔ جب روپے کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفہ کو پڑھنا۔ پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے۔ پیر

صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں۔ نہ آٹا نہ دال۔ وظیفہ پڑھا گیا۔ تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے۔ مولانا کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ کر تعلیم حاصل کی۔ جب خود روپیہ کمانے لگے تو وظیفہ بند کر دیا۔ سرسید سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے سرسید سے کہا کہ آپ نیچری ہیں، مگر ہمارے وظیفہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔

کرامت کی بھی ایک مثال ڈاکٹر صاحب نے سنائی۔ فرمایا، سرسید احمد کی طرح ان کے باپ کے گلے میں بھی رسولی تھی۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کا کچھ علاج کیجئے۔ پیر صاحب نے کہا، دیکھیں۔ سرسید کے والد نے سر آگے بڑھایا۔ پیر صاحب نے ان کی ڈاڑھی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور فرمایا، بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی۔

بخشش کی بھی مثال سنائی۔ فرمایا، ایک سب انسپکٹر پولیس ہے۔ وہ سانپ کے کاٹے کا دم کرتا ہے اور شفا ہو جاتی ہے۔ کئی سو میل سے بھی دم کا اثر ہو جاتا ہے۔

خاموشی کے ذرا سے وقفہ کے بعد میں نے پوچھا ''جن'' کا ذکر قرآن میں آتا ہے۔ ''جن'' کس چیز سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، بعض اس کے معنے جنگلی آدمی کے بیان کرتے ہیں، کیونکہ وہ چھپے ہوتے ہیں۔ اسی مصدر سے جنت، جنین اور جنۃ (ڈھال) نکلے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ایسی مخلوق ہو جسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔ کئی رنگ ہیں جنہیں ہماری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ کئی آوازیں ہیں جنہیں ہمارے کان نہیں سن سکتے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، چند دن ہوئے میں باہر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لیے، تہمد باندھے آ گیا۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری ٹانگیں دبانے لگا۔ میں مزے سے بیٹھا رہا۔ اور وہ میرے پاؤں دباتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا، آپ کس طرح آئے ہیں۔ اس فقیر نے کہا، میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تمہارے علاقہ کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے تو ابھی تک کوئی اطلاع اس قلندری کے بارے میں نہیں پہنچی۔ میری بات کو اس فقیر نے قلندری کے کوچہ کی کوئی رمز سمجھا۔ ٹانگیں دباتا رہا۔ اتنے میں چودھری محمد حسین صاحب تشریف

لے آئے اور آتے ہی سر سکندر کے بارے میں گفتگو شروع کرنے ہی کو تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا، چوہدری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجئے، آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: جن دنوں میں انار کلی میں رہا کرتا تھا، ایک دفعہ جاڑے کے موسم میں ایک فقیر نے رات کے دو بجے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ علی بخش نے دروازہ کھولا۔ میں نے علی بخش سے پوچھا، کون ہے؟ اس نے کہا، ایک فقیر ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں بستر سے اٹھا۔ فقیر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا، آپ کس طرح تشریف لائے۔ کہنے لگا، مجھے دوسری جگہ جانے کا حکم ملا ہے۔ میں جا رہا ہوں، اس لیے آپ سے ملنے آ گیا۔ میں نے پوچھا، آپ اس دنیا کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ کہنے لگا، اب امام مہدی کے ظہور کا وقت آ گیا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر چہ شدت کی سردی تھی مگر اس فقیر نے رات کے دو بجے دہی کی لسی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ علی بخش گیا۔ کسی دُکاندار کو جگا کر لسی بنوا کر لایا۔ اس فقیر نے پی اور کہا، اب میں چلتا ہوں۔ میں نے کہا، اس وقت تو ریل نہیں ملے گی۔ اس نے کہا، فقیر کو ریل سے کیا غرض۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: اکثر لوگ مہدی کے منتظر ہیں مگر وہ آنے میں نہیں آتا۔ ایک اور بزرگ لاہور میں ہوا کرتے تھے، جب کبھی ملتے مہدی کے آنے کی تاریخ بتا جاتے۔ وہ تاریخ گزر جاتی تو ایک نئی تاریخ مقرر کر دیتے۔ اسی انتظار میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مگر مہدی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ کچھ دن ہوئے ایک اور بزرگ تشریف لائے۔ وہ بھی مہدی کے آنے کی خوشخبری دے گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے پہلے بھی کئی لوگ مہدی کی آمد کی خبر دے گئے ہیں، مگر ابھی تک وہ نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے کام مہدی کے لیے نہیں اٹھا رکھنے چاہئیں۔

مہدی کے قصے کے بعد قدرتی طور پر مسیح کا ذکر آ گیا۔ میں نے کہا، احمدیوں کے رے میں جو آپ نے رسالہ شائع کیا ہے اس میں آپ نے لکھا ہے کہ سپنگلر (Spengler) نے مسلمانوں کو مجوسی اقوام میں شامل کرنے میں غلطی کی ہے۔ سپنگلر نے مجوسی اقوام کی ایک خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ کسی آنے والے نبی کی منتظر رہتی ہیں۔ مسلمان کسی آنے والے نبی کے منتظر نہیں۔ میں نے کہا، آپ کا یہ دعویٰ کہ مسلمان کسی آنے والے نبی کے منتظر نہیں، درست نہیں، کیونکہ مسلمان عام طور پر مسیح کی آمد ثانی کے منتظر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، میں اس کا

قائل نہیں۔ میں نے اپنے اشعار میں اس عقیدہ کا اظہار بھی کیا ہے۔ اسی بنا پر احمدیوں نے مسلمانوں کو میرے خلاف ابھارنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ اثر نہ ہوا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: میرے والد صاحب کی دُکان پر ابن عربی کی خصوص الحکم با قاعدہ پڑھی جایا کرتی تھی۔ مولوی عبدالکریم صاحب قادیانی کہ ان کی آواز بلند تھی یہ خدمت سرانجام دیا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی بھی اس صحبت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مجاز اور حقیقت کی داستان وہ ابنِ عربی سے سنتے رہے۔ یہی فلسفہ بعد میں انہوں نے حقیقی اور مجازی نبوت کے شکل میں پیش کیا۔ اس طرح گویا مرزا صاحب نے ابنِ عربی سے فیض حاصل کیا۔ اور ابنِ عربی نے افلاطون سے۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا، ابن عربی، بیدل اور ھیگل کے جال میں جو ایک دفعہ پھنس جاتا ہے اس کی رہائی مشکل سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا، سیالکوٹ کا ذکر ہے۔ میں شام کے قریب گھر سے نکلا تو دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے احمدی جمع ہیں۔ بعض میرے واقف تھے۔ میں گیا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ ایک صاحب نے کہا، حضرت مرزا صاحب نے عبداللہ آتھم کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی کہ اگر وہ توبہ نہ کرے گا تو چار برس کے اندر مر جائے گا۔ آج ان چار سالوں کا آخری دن ہے۔ ہم تار کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے رندانہ طریق سے کہا کہ خدا کی بات کو اس طرح نہ مان لیا کرو۔ اس کا کیا اعتبار ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی بات ہے، پوری ہو کر رہے گی۔ میں نے کہا، وہ پیش گوئی مشروط تھی۔ اگر عبداللہ آتھم نے چپکے سے توبہ کر لی تو پیش گوئی پوری نہیں ہوگی۔ اگر ایسی صورت پیش آ گئی تو پھر تم کیا کرو گے۔ وہ دن گزر گیا۔ عبداللہ آتھم نہ مرا۔ دوسرے ہی دن قادیان سے اشتہار نکلا۔ جو صورتِ حال میں نے احمدی دوست سے بیان کی تھی وہی پیش آئی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے غیر مشروط طور پر عبداللہ آتھم کی موت کی دوبارہ پیش گوئی کی جو پوری ہوئی۔ میں نے پوچھا، پیش گوئیاں اور معجزات نبوت کی دلیل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ فرمایا، نہیں۔ اکثر رمل، جفر والے بھی پیش گوئیاں کرتے ہیں کچھ پوری ہو جاتی ہیں، کچھ غلط۔ یہ اتفاقی بات ہے۔ نبی کی تعلیم اور اس کی زندگی ہی نبوت کے لیے حجت ہو سکتی ہے۔

میں نے سوال کیا: مرزا محمود صاحب قادیانی سیاسیات میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے گفت وشنید فرما رہے ہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ فرمایا، ہاں میں نے بھی اخباروں میں یہ خبر پڑھی ہے۔ انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ سے tender مانگے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ انگریز سے کہہ رہے ہیں میں تم سے خفا ہوں، جلدی کرو اور مجھے مناؤ۔

گفتگو کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے نو وارد سے مخاطب ہو کر کہا: کہو جی چودھری جی، آپ کے پیر صاحب کیا کہتے ہیں۔ چودھری صاحب بولے، ڈاکٹر صاحب آپ کو کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ آپ ایک دیگ پلاؤ کی غریبوں کو کھلا دیں۔ آپ کا حلق ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: نہ چودھری جی یہ بات غلط ہے۔ پہلے صحت، اس کے بعد ایک کی جگہ دو دیگیں۔ چودھری صاحب نے کہا، تو آپ کی مرضی۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے۔ ذرا سے توقف کے بعد کہا: ''ہوں''۔ اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرنے لگے۔ پھر یکایک ''یااللہ'' کی ضرب لگائی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے مناسب موقع دیکھ کر پوچھا: Psycho-analysis (تجزیۂ نفسی) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا، جنسی جذبات اور تحت الشعور پر علم النفس کی عمارت بنانے کے بعد فرائیڈ جنسی جذبات پر مابعد الطبیعات کی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں۔ ذرا سے وقفہ کے بعد فرمایا، مجھے قبض کی شکایت تھی۔ میں نے خواب دیکھا کہ سات چور میرے مکان میں گھس آئے۔ صبح رفع حاجت کے بعد میں نے کموڈ میں نظر ڈالی تو اس میں سات سُدّے تھے۔ تجزیۂ نفسی والے اس کی کیا تشریح کریں گے۔

میں نے پوچھا، غالب کی شاعری کے بارے میں آج کل یہ بحث ہو رہی ہے کہ آیا وہ قنوطی تھا یا رجائی۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ فرمایا، قنوطیت فلسفہ کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی اچھی چیزوں میں برائی کا پہلو نکالا جائے۔ اس طرح کے قنوطی بدھ مت والے ہیں۔ یا پھر اُن کا پیرو شوپن ہاوئر (Schopenhauer)۔ اس لحاظ سے غالب قنوطی نہیں۔ البتہ شاعر پر کبھی ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ دنیا سے بیزاری کی داستان بیان کرتا ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اسے قنوطیت نہیں کہتے۔ بہر حال قنوطیت سے بحث کرتے وقت اس فرق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

اس کے بعد میں نے پوچھا، Civilisation (تمدن) اور Culture (تہذیب) آج کل اس طرح استعمال ہو رہے ہیں کہ گویا وہ ہم معنی ہیں۔ آپ ان میں کس طرح امتیاز کریں گے۔ فرمایا Civilisation کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور Culture کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ڈاکٹر صاحب بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرتے رہے۔ پھر یکا یک فرمایا: مذہب نے کچھ جانوروں کے کھانے کی اجازت دی ہے اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ پر طب کے نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس میں جمالیات کو بھی دخل ہے۔ اگر سب حلال اور حرام جانوروں کی دو علیحدہ فہرستیں بنائی جائیں تو میرا خیال ہے حلال جانور خوبصورت نکلیں گے اور حرام بدصورت۔ اس نقطۂ نگاہ سے آج تک کسی نے اس مسئلہ سے بحث نہیں کی۔

تھوڑے سے وقفہ بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: جب میں بھاٹی دروازہ میں رہا کرتا تھا، ایک بزرگ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ اس وقت میری شاعری کا آغاز تھا۔ غالباً میرے اشعار نے ملاقات کی خواہش پیدا کی ہوگی۔ میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے کہا، آپ تشریف رکھیے۔ میں آپ کے آنے کی اطلاع شیخ محمد اقبال کو کیے دیتا ہوں۔ نہانے کے بعد میں آیا تو ان سے کہا، فرمائیے! میں آ گیا ہوں۔ اس شخص کو نہایت مایوسی ہوئی۔ اس شخص نے اپنے ذہن میں جو شکل میری بنا رکھی تھی غالباً میں اس معیار پر پورا نہ اُترا۔ نادر خاں سے جب اول مرتبہ ملاقات ہوئی تو وہ کابل جاتے ہوئے لاہور میں ٹھہر گئے تھے۔ وہ میری صورت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے، آپ اقبال ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ لمبی ڈاڑھی والے بزرگ صورت ہوں گے۔ میں نے کہا، آپ سے زیادہ مجھے حیرانی ہے۔ آپ تو جرنیل ہیں۔ میں سمجھتا تھا آپ دیو ہیکل ہوں گے۔ مگر آپ میں جرنیلی کی کوئی شان نہیں۔ اس قدر دُبلے پتلے۔

اس کے بعد فرمایا: میں نے مومن کا دیوان نہیں پڑھا تھا۔ اب دیکھا ہے۔ اس میں مجھے صرف ایک شعر پسند آیا ہے ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعروشاعری کی بات جوشروع ہوئی تو میں نے کہا کہ آج کل ہندوستان کے قومی ترانہ کا سوال درپیش ہے۔ مسلمان بندے ماترم پر بڑے معترض ہیں۔ آپ ہندوستان کے لیے ایسا قومی ترانہ کیوں نہیں لکھتے جس میں معنوی اور صوتی لحاظ سے گرمی ہو۔ فرمایا: ہندوستان میں قوم ہے کہاں جس کے لیے قومی ترانہ لکھا جائے۔

مختصر سی خاموشی کے وقفے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: میں عمر بھر کرایے کے مکانوں میں رہا ہوں۔ جاوید منزل جاوید کی ملکیت ہے۔ میں اس کو پچاس روپے ماہوار کرایہ دیتا ہوں۔ ایک دفعہ سر ذوالفقار علی خاں مجھ سے کہنے لگے، اپنا مکان کیوں نہیں بنواتے۔ میں نے کہا، تم سرمایہ داروں نے چار چار پانچ پانچ مکانوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ ہم جیسوں کے حصے میں اپنا مکان کیسے آسکتا ہے۔

اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت مانگی۔ فرمایا ''جا رہے ہیں، اچھا'' ہم اٹھے اور رخصت ہوئے۔

# علامہ اقبال سے ایک ملاقات•

ڈاکٹر شیر بہادر خان

''۲۱۔ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے جب کہ برصغیر ہند و پاک، آزادی کی انقلاب آفرین تحریکوں کا مرکز بن رہا تھا اور محکوموں کے سرد خون میں حرارت پیدا ہو رہی تھی اور ملک و ملت کے اہل علم و فکر اپنی اپنی بصیرت سے قوم کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان دنوں میں اور میرے چند دوست جو لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ ہر سیاسی علمی اور مذہبی محفل میں شامل ہونے کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور ہمارا اجتماع زیادہ تر مولوی محمد عبداللہ صاحب قصوری مرحوم کے مکان پر شیر نوالہ دروازہ میں ہوا کرتا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی زندگی دعوت و تبلیغ کے لئے وقف کی تھی ...... ایک دن ہم نے مولوی صاحب مرحوم سے درخواست کی کہ علامہ اقبال سے ملاقات کرنی چاہئے۔ چنانچہ ایک دن وہ ہمیں ان کے دولت کدے پر لے گئے۔

جب ہم وہاں گئے تو حضرت علامہ آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ ہم نے ان کو بے حد خاموش اور گہری سوچ کی حالت میں پایا۔ سلام کے بعد جب ہم سب بیٹھ گئے تو مولوی صاحب مرحوم نے اس استغراق اور گہری سوچ کی وجہ پوچھی۔ فرمانے لگے۔

''مولوی صاحب مدت سے ایک انجمن بنانے کی فکر میں ہوں'' مولوی صاحب نے کہا پھر دیر کس بات کی ہے کام شروع کر دیں۔ جواباً کہنے لگے ''کیا کروں انجمن کے لئے موزوں ارکان نہیں ملتے۔ باوجود اتنی تلاش اور فکر کے اب تک صرف ایک ہی رکن مل سکا ہے۔ دوسرے کی

• بصد شکریہ، ہفت روزہ چٹان، لاہور، مئی ۱۹۵۸، بحوالہ، رحیم بخش شاہین، مرتبہ، اوراق گم گشتہ، ص 97-98۔

تلاش ہے"

مولوی صاحب...... "جو رکن مل گیا ہے وہ کون ہے؟" فرمانے لگے۔ "وہ رکن تو میں خود ہی ہوں"۔

اللہ اللہ...... حکیم ملت کی دوررس نگاہ کہاں تک پہنچ رہی تھی اور ہم کیا سمجھ رہے تھے ہم اس وقت حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب کو فلسفیانہ موشگافی اور شاعرانہ نکتہ دری سمجھے لیکن انہوں نے جو بات کہی اس کا نتیجہ کہیں بیس سال بعد ظاہر ہوا۔ یعنی طویل غور و فکر اور کد و کاوش کے بعد آخر حضرت علامہ کو اس انجمن کا دوسرا رکن ملا یعنی قائد اعظم۔ ایک نے تخیل پیش کیا اور دوسرے نے اس تخیل کو عملی جامہ پہنایا۔"

# علامہ اقبال سے میری چند ملاقاتیں•

ڈاکٹر محمد جان

یہ کاپی مجھے میرے رفیق عزیز شبیر احمد شائق صاحب نے اس لیے دی ہے کہ میں اپنی چند مختصر ان ملاقاتوں کی روداد قلمبند کر دوں جو کسی وقت سابق میں جناب ڈاکٹر علامہ اقبال ؒ سے ہوئی تھیں۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ روداد کبھی معرض تحریر میں لائی جائے گی کیونکہ اس موضوع پر بہت سے دانشور اہل قلم نے لکھا ہے۔ بہرحال امتثال امر کے خیال سے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ اقبال ؒ جس قوم کو مخاطب کرتے رہے اس نے تو اقبال کی دعوت کو سمجھنا ضروری نہ سمجھا تھا بلکہ کلام اقبال ؒ قوالوں کو الاٹ کر دیا گیا۔

اب چونکہ کلام اقبال، ان کی فکر اور شخصیت پر باتیں ہونے لگی ہیں۔ ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹی وی، اخبارات و رسائل بھی توجہ کر رہے ہیں، لہٰذا میں بھی اپنی یادداشت قلمبند کرتا ہوں۔ سال و ماہ و تاریخ کا تعین اب ذہن میں محفوظ نہیں رہا۔

(۱)

بسلسلہ ملازمت دیہات کے ماحول میں وقت گزار رہا تھا۔ علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی، لہٰذا مشاہیر اہل علم و فضل کی تصانیف پڑھا کرتا تھا۔ جناب اقبال ؒ کی کتب بھی میسر تھیں۔ ان کے مطالعہ سے مصنف موصوف سے قلبی لگاؤ عقیدت کی حد تک ہو گیا تھا مگر شرف

• بصد شکریہ، سہ ماہی سیارہ، اقبال نمبر اشاعت خاص نمبر 32، بحوالہ جعفر بلوچ، مرتبہ، مجالس اقبال۔ ص 230-234۔

ملاقات حاصل نہ تھا۔ ایک مرتبہ سگ گزیدگی کے ٹیکے لگوانے لاہور آیا۔ موچی دروازے کے اندر چوک نواب صاحب میں اپنے اعزہ کے گھر قیام تھا مگر یہ ماحول میرے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ اس لیے میو ہسپتال میں روزانہ ٹیکہ لگوا کر اخبار و جرائد لے کر چیرنگ کراس یا عجائب گھر کے پاس مال روڈ کے فٹ پاتھ پر وقت گزارتا۔ چیرنگ کراس پہنچتا، یہاں قریب ہی چند طلباء بھی مصروف مطالعہ ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے خبر دی کہ آج جناب علامہ اقبال گول باغ ایک اجلاس میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے یہاں سے گزریں گے۔ میں ہمہ تن انتظار سڑک کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسی نوجوان نے انگلی سے اشارہ کر کے مجھے بلایا۔ میں اٹھ کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ تانگہ قریب آیا تو میں نے بڑھ کر سلام کیا۔ تانگہ رک گیا۔ مصافحہ کیا اور عرض کیا، مسافر ہوں۔ ملاقات کا شوق تھا جو آج خدا نے پورا کر دیا۔ کیا میں کبھی کبھی درِ دولت پر حاضری کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟ فرمایا، شوق سے اور آگے روانہ ہو گئے۔

کچھ مدت کے بعد میں کسی محکمانہ کام سے لاہور آیا تو فارغ ہو کر میو روڈ (حال اقبال روڈ) کوٹھی پہنچا۔ پنجابی لباس، ہاتھ میں چھڑی اور ایک نوجوان کے پیچھے لپک رہے تھے۔ چہرے پر غصہ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ نوجوان اپنی سائیکل لے کر یوں باہر کو دوڑا جیسے پٹائی کے خوف سے بھاگ رہا ہو۔ میں یہ منظر دیکھ کر گیٹ کے اندر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ مسکرا کر فرمایا "آؤ بھئی چودھری تم کیوں ڈر رہے ہو؟ یہ جانور مجھ سے فلسفہ کے مقالات پوچھنے آتے ہیں۔ یہ مجھے فلسفی سمجھتے ہیں۔ آؤ بیٹھیں۔" کوٹھی کے برآمدے میں چارپائی پر خود بھی بیٹھ گئے۔ مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا اور پہلی ملاقات کا حوالہ دے کر فرمایا "آپ سے سرِ راہ ملاقات ہوئی تھی بہت مختصر۔" میں نے اپنا مختصر سا تعارف عرض کر دیا کہ تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے گاؤں میں ڈسپنسر ہوں اور یہاں کبھی کبھی آنا ہوتا ہے۔ فرمایا "بھائی میں خود سادہ مزاج آدمی ہوں۔ سادگی کو پسند کرتا ہوں۔ سادگی اخلاص کی بھی علامت ہوتی ہے۔ کھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ آپ کھانا تو کھائیں گے نا۔" میں نے عرض کیا "میں جب لاہور آتا ہوں تو اپنا کھانا ساتھ لے کر آتا ہوں۔" فرمایا "پھر ہمیں بھی اپنا کھانا کھلاؤ۔" میں نے اپنا تھیلا کھولا، پراٹھے ٹھنڈے ہو چلے تھے۔ خادم بابا کو بلا کر گرم کروا دیئے۔ ساتھ لیموں کا اچار تھا۔ چند نوالے میرے ساتھ کھا کر لیموں کے اچار کو بڑا پسند فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔ "حضرت آپ کے ایک شعر کو نادان لوگ عجیب معنی پہناتے ہیں اور

اپنے حسب منشا تعبیریں کرتے ہیں۔ کیا میں معلوم کرنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ آپ کی مراد کیا ہے؟'' پوچھا ''کیا؟'' میں نے مشہور شعر دہرادیا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

میرا سوال سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ ''دراصل لفظ خودی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میری مراد خود بندے کا وجود، ذہن و کردار، سیرت و اخلاق ایسی صفات ہیں جو خالق نے ہر بندے کو ودیعت فرمائی ہیں اور ان کے بگاڑ اور سدھار کا بندے کو مختار بنایا ہے۔ پھر بے خبری میں نہیں رہنے دیا۔ وحی اور انبیاء و رسل کے ذریعے خوب وزشت سمجھادیا۔ بندے کی فلاح وخسران کو واضح کردیا۔ میرا مخاطب بندۂ مومن و مسلم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اے بندۂ خدا، خود اپنے وجود کو اتنا سدھار، اتنا معیاری بنا اور بلند کرلے کہ تو مرضیٔ مولا کا نمونہ بن جائے اور خالق کو تیری مرضی پسند آجائے۔ یہ بالکل سیدھی سی بات ہے۔'' اس دن میری موجودگی کے وقت تک اور کوئی ملاقاتی نہ آیا۔ میں اجازت لے کر واپس آگیا۔

(۲)

اگلی برسات کے موسم میں لاہور جانا ہوا تو میں پانچ سیر لیموں بطور تحفہ ساتھ لے گیا۔ پیش کیے تو فرمایا ''یہ کیا لے آئے چودھری!'' عرض کیا کہ جناب نے لیموں کا اچار بہت پسند فرمایا۔ ان سے اچار بنوا لیجیے۔ تکلف فرمانے لگے۔ عرض کیا کہ خریدے نہیں اپنے ہی درختوں کا پھل ہیں اور یہ صرف ایک ہی ماہ یعنی ساون میں تیار ہوتا ہے۔ چنانچہ لیموں رکھ لیے اور خدمتگار بابا کے سپرد کردیے۔ اس نشست میں پشاور سے ایک صاحب تشریف لائے تھے۔ چند مقامی احباب بھی تشریف رکھتے تھے۔ نووارد شب خوابی کے مختصر لباس ہی میں آگئے تھے۔ یہ پشاور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے اور ایک سائل کی حیثیت سے دیوانہ وار چلے آئے تھے۔ لباس کا بھی اہتمام نہ کیا تھا۔ تشریف رکھنے کو کہا گیا تو نہایت عجز کے ساتھ بولے ''جناب ایک گرانقدر متاع عزیز کے لیے فی سبیل اللہ سائل ہو کر آیا ہوں۔ آپ کی ایک رباعی ماہنامہ ہمایوں لاہور [میں] پڑھی ہے۔ اگر آپ وہ رباعی خدا کی راہ میں مجھے ہبہ فرمادیں تو میں بیٹھتا ہوں۔'' ارشاد ہوا، کون سی رباعی؟ تو انہوں نے پرنم آنکھوں کو جھکائے ہوئے رباعی پڑھی:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　روز محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر　　از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

تمام موجود حاضرین کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ علامہ نے بھرائی ہوئی آواز اور تر آنکھوں کے ساتھ پوچھا، کیا کرو گے؟ جواب میں سائل نے کہا: ''اپنے گھر کے افراد کو وصیت کروں گا کہ میری موت کے بعد غسل و کفن سے فارغ ہو کر یہ رباعی میری پیشانی پر رکھ دیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میری نجات اخروی کے لیے کافی ہوگی۔'' فرمایا ''سب سے زیادہ اس امر کا حاجت مند تو میں خود ہوں مگر میں نے یہ آپ کو بخشی۔'' تب اس مردِ خدا نے اپنا تعارف کرایا اور جزائے عظیم کی دعا دیتا ہوا شاداں و فرحاں واپس چلا گیا۔

(۳)

اسی طرح ایک بہت ہی بے تکلف دوست پنجابی لہجے میں پکارتے ہوئے تشریف لائے۔ پنجابی ہی میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا، کیا ہو گیا؟ بولے ایک شعر ہو گیا ہے۔ سنو:

زلف آوارہ، گریباں چاک، او مست شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

علامہ اقبال اٹھ کر برآمدے میں ٹہلنے لگے اور فرمایا: لکھو! حقے کا کش لگاتے جاتے ٹہلتے ٹہلتے کہا، لکھ اوئے۔

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں　　آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
بے حجابی نے تری توڑا نگاہوں کا طلسم　　اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عرصہ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی　　داور محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

آخری شعر کے بارے میں فرمایا، اسے کاٹ دو۔ یہ چھپنے کے قابل نہیں۔ عرض کیا گیا، جناب کیوں؟ فرمایا، اس خیال کی جتنی چاہو داد دو مگر علم شاعری کی رو سے اس میں تکرار لفظ ''محشر'' کے باعث سقم ہے، لہٰذا اسے درج نہ کیا گیا۔ یہ نظم نعتیہ اور فی البدیہہ تھی۔

(۴)

ایک دفعہ محفل جمی ہوئی تھی کہ اچانک ایک مسماۃ تشریف لائیں۔ یہ مغنیہ تھیں۔ حضرت اقبال رحمہ اللہ نے پوچھا "تم کیوں آئی ہو؟" اس نے کہا کہ ہمارے ہاں ایک سوال زیر بحث ہے۔ میں نے سوچا کہ خود آپ ہی سے پوچھ لیا جائے۔ آپ ہی فرمائیے کہ آپ کے اشعار کی کتابوں میں آپ کا شاہکار کونسی کتاب ہے؟ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تمام اہل مجلس ادھر متوجہ ہو گئے۔ میر مجلس نے فرمایا، بھئی یہ فیصلہ تو آپ ہی لوگوں کو کرنا ہے کیونکہ شاعر کے نزدیک تو اس کا ایک ایک شعر شاہکار ہوتا ہے۔ حاضرین میں بڑے بڑے دانشور، اہل قلم اور قادر الکلام اصحاب تشریف رکھتے تھے۔ ایک میں ہی (راقم الحروف) سادہ دیہاتی تھا۔ جناب علامہ نے فرداً فرداً سب سے ان کی رائے طلب فرمائی مگر سب احتراماً خاموش رہے۔ ہر کسی نے اس مسئلہ میں اظہار رائے سے اجتناب کیا۔ آخر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا "کیوں بھئی چودھری! تم؟" عرض کیا "جناب میں تو تکلف نہیں کرتا، میں تو اس بارے میں رائے رکھتا ہوں۔" فرمایا، پھر کہو!

میں نے عرض کیا، کوئی اختلاف رائے کر سکتا ہے مگر میرے نزدیک اردو کلام میں "بال جبریل" اور فارسی کلام میں "زبورِ عجم" آپ کے شاہکار ہیں۔ تبسم فرمایا اور الماری میں سے کتابوں کا ایک ایک نسخہ کرافٹ پیپر میں جمع کر کے بنڈل بنایا اور مرحمت فرمایا اور ارشاد ہوا۔ "تم اس کے حقدار ہو۔" میں نے سر خم کر کے عرض کیا، خود ہی اس پر رکھ دیجیے۔ مسئلہ حل ہو گیا اور سائلہ کو فرما دیا گیا کہ، اب تم جا سکتی ہو۔

بس یہی چار ملاقاتیں قابل ذکر میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔

# ایک فیضانی لمحے کی یاد•

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

ایک شام کو ہم چار: تاثیر، چغتائی اور ان کے دو بھائی حضرتِ علامہ کی خدمت ہوئے اور جاتے ہی غیر مطبوعہ اردو کلام کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اور دلائل کی بوچھاڑ کر دی: اُردو میں آپ نے دیر سے نہیں لکھا۔ اردو بحیثیت زبان کے مستحق امداد ہے۔ اردو دان لوگ بحیثیت ہم قوم ہونے کے پیغام اقبال سننے کے مستحق ہیں۔ مسلمانانِ ہند کو اور کون اُبھارے گا؟ کارواں کے نکالنے کے لیے آپ ہی نے مشورہ دیا تھا۔ آپ کا غیر مطبوعہ اردو کلام نہ ہوا تو ہماری نیاز مندی لوگوں کی نظر میں مشکوک ٹھہرے گی۔ ہم کچھ نہ کچھ لے کر ٹلیں گے۔ حضرت علامہ بستر پر لیٹے ہوئے یہ سب کچھ سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے، اردو میں شعر نازل ہی نہیں ہوتے۔ جاوید نامہ کو ابھی ابھی ختم کیا ہے اور دل و دماغ نچڑ گئے ہیں، اس لیے فارسی میں بھی کچھ کہنا محال ہے۔ یوں بھی فارسی کو چھوڑ کر اردو میں کہنا سنگِ مرمر کی بجائے گارے کی عمارت بنانا ہے۔ مگر تمہارے اور دیگر عزیزوں کے اصرار سے اردو کی طرف میلان ہو رہا ہے۔ دیکھو! جو اس کی مرضی! ہم نے دلائل بازی میں شکست ہوتی دیکھ کر نیاز مندی کو سہارا بنایا اور ''اُردو غزل لے کر ٹلیں گے'' کی رٹ لگانی شروع کر دی۔ علامہ ''اردو غزل'' سن کر ذرا چونکے۔ کہنے لگے ''یہ ایک نئی شرط لگا دی'' ہماری اس فقرے سے ہمت بندھی۔ سمجھے اردو غزل نہیں تو نظم۔ یہ بھی نہیں تو غیر مطبوعہ فارسی کلام تو مل ہی جائے گا۔ اپنی اس کامیابی پر ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے کہ یکا یک حضرتِ علامہ نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ ''تم اس وفد کے سرغنہ ہو اور شاعر ہو۔ اپنے

• بصد شکریہ۔ محمود نظامی، مرتبہ، علامہ اقبال قریب سے، ص 99۔100۔

اشعار سناؤ۔ شاید طبیعت کو بہانہ مل جائے'' یہ سننا تھا کہ میری تمام شوخیوں اور مسکراہٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔ میں اور اپنے اشعار، حضرتِ علامہ کو سناؤں! مجھے کبھی اُن کے سامنے اپنے اشعار پڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور جب کبھی انہوں نے میری کسی مطبوعہ نظم کا ذکر کیا مجھے پسینہ آنے لگا۔ میری خاموشی پر حضرتِ علامہ پھر بولے، بھئی کچھ سناؤ گے تو شاید تمہاری قسمت کی کوئی چیز ہو جائے۔ اس پر چغتائی صاحب کارواں کے مفاد پر مجھے قربان کرتے ہوئے بول اٹھے: ''وہ سمجھا تھا میں والی غزل سنا دو'' باقی دو بھائی بھی ہم آہنگ ہو گئے۔ ''ہاں، ہاں سمجھا تھا میں والی غزل۔'' علامہ اقبال مسکرا رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جی کڑا کر کے ایک مطلع پڑھا۔ پھر دوسرا۔ علامہ اقبال کا ایک مصرع:

تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں

دہرانے لگے۔ مجھے تسکین ہوئی۔ آخری شعر پر مجھے خود یقین تھا:

زلفِ آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

حضرتِ علامہ کو بھی پسند آیا۔ کہنے لگے، زمین اچھی ہے، خدا کا قافیہ کیوں چھوڑ دیا؟ اور کچھ چُپ سے ہو گئے۔ فکرِ شعر میں سر جھکا لیا۔ ہماری امیدیں بلند ہو گئیں۔ مگر مجھے ایک اور فکر لاحق ہو گئی۔ میری غزل اچھی تھی۔ بہت اچھی تھی۔ لیکن حضرتِ علامہ نے اس پر کچھ کہہ دیا تو قدرِ عافیت معلوم! بے حیثیت ہو کر رہ جائے گی۔ ہاں اردو ادب اور کارواں دولتمند ہو جائیں گے۔ مگر میرے دماغ میں یہ کش مکش جاری تھی کہ حضرتِ علامہ بولے، اگر قافیہ بدل جائے تو؟ میں فوراً بولا تو بہتر ہو گا اور اطمینان کا سانس لیا۔ حضرتِ علامہ کہنے لگے، لو سنو۔ تم غزل غزل پکار رہے تھے تو غزل ہی سہی:

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی!
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

یہ شعر کہہ کر علامہ اقبال کچھ رُکے، دو تین منٹ تک۔ اور پھر یہ حالت تھی کہ میں نقل نہیں کر چکتا تھا کہ ایک اور شعر تیار ہوتا۔ دوسرا شعر جاوید نامہ کی کیفیات کا حامل تھا

''مہر و ماہ و مشتری کو ہمعناں سمجھا تھا میں''

جوں جوں شعر ہوتے جاتے، علامہ کی حالت بدلتی جاتی۔ بستر ہی میں اٹھ کر پاؤں کے بل بیٹھ گئے۔ آواز میں لرزش سی آ گئی۔ جھوم جھوم کر داہنے ہاتھ کی سبابہ اٹھا کر اِنشا کرتے تھے اور اس شعر

تھی وہ اِک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

وہ بھی رو رہے تھے اور ہم بھی! نہ جانے یہ غزل کتنی لمبی ہو جاتی، مگر یہ فیضانی سلسلہ ایک اجنبی ملاقاتی کی آمد سے منقطع ہو گیا اور ہم اس درانداز کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد بہت ملاقاتیں ہوئیں، مگر ہم نے دوبارہ اس غزل کا ذکر تک نہ کیا اور نظر ثانی کے لیے بھی شعروں کی نقل نہیں دی۔ مطلع کے متعلق علامہ نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ یوں کر دیا جائے ؎

اپنی جولان گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
کس رباطِ کہنہ کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

مگر میں نے تعمیل ارشاد نہ کرتے ہوئے اس فیضانی لمحے کی یادگار کو جوں کا توں رہنے دیا۔

❁❁❁

# مرد قلندر کی بارگاہ میں

راجہ حسن اختر ایڈووکیٹ

زمانۂ طالب علمی میں ایک دن ایک دوست کے مکان پر گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ گفتگو کا رخ ''شکوہ اقبال'' کی طرف پلٹا۔ ہم صحبتوں میں سے ایک نے شکوہ (ایک پمفلٹ میں سے) پڑھنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے یہ بند پڑھا:

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

اسلام کے عظیم الشان عہد ماضی کے متعلق یہ پہلی اذان تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے اس وقت تک حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کا نام تک نہیں سنا تھا۔ میں نے و کتابچہ اٹھایا اور اس کی پشت پر حضرت کی مطبوع نظموں کی ایک فہرست دیکھی۔ یہ نظمیں مرغوب ایجنسی لاہور سے ملتی تھیں۔ میں نے آرڈر بھیجا اور کچھ دنوں کے بعد یہ نظمیں مجھے مل گئیں۔ میں انھیں بار بار پڑھا کرتا اور اکثر مجھے ازبر ہو گئی تھیں۔ کاش کہ آج بھی کوئی ایسی ایجنسی موجود ہوتی جو مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے علمی اور عملی کارناموں اور راستوں کی دریافت او وضاحت کا کام اپنے ذمے لے لیتی اور انھیں چھوٹی چھوٹی سبک کتابوں کی شکل میں شائع کرتی۔

# پہلی ملاقات

قریباً دو سال بعد حضرت علامہ کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہوا۔ جس جذبہ کے تحت حاضر ہوا، وہ کچھ ایسے ہی تھا جیسے لوگ شالامار دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ شہر لاہور میں نے پہلی مرتبہ ہی دیکھا اور حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بھی فاتحہ خوانی کے لیے پہنچا۔ دوسری دفعہ میں حضرت کے مکان پر ۱۹۲۶ء میں حاضر ہوا۔ میں ایک دفعہ حضرت علامہ کو دیکھ چکا تھا اور اس دوران میں اسرار خودی کا مطالعہ بھی کر چکا تھا۔ اس لیے اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ جہاں اسلامی آداب ملحوظ رکھنے ہوں گے۔ مکان کے بالکل قریب ایک ہوٹل تھا جہاں میں قرب مکانی کی وجہ سے ٹھہرا۔ ملاقات کے دوران میں حضرت نے پوچھا ''کہاں ٹھہرے ہو؟'' میں نے کہا ''ساتھ والے ہوٹل میں۔'' فرمانے لگے ''اس ہوٹل کی شہرت اچھی نہیں۔'' میں نے کہا ''محض قرب مکانی کی وجہ سے یہاں ٹھہرا ہوں۔'' خندہ بلب ہو کر فرمایا ''مسجد کے قریب شراب خانہ ہو تو وہاں جانا بھی پسند کرو گے؟'' میرے عزیزوں میں سے یک مولوی صاحب بھی ہمراہ تھے۔ اس پر وہ خوب ہنسے، حالانکہ وہ بھی اسی ہوٹل میں اترے ہوئے تھے۔

۱۹۲۶ء کے بعد بسلسلہ ملازمت کبھی پنجاب کے مغربی کونے میں پہنچا اور کبھی مشرقی کونے میں لیکن میں حضرت کی خدمت میں باقاعدہ سال میں پانچ چھ مرتبہ آتا رہا۔ ہر مرتبہ کچھ دن لے کر آتا اور گھنٹوں تک پاس بیٹھا رہتا۔ ۱۹۳۴ء کی ابتداء میں میں لاہور آیا اور حضرت کی فات تک یہاں ہی رہا۔ اس زمانے میں مجھے قدم بوسی کا زیادہ موقع ملتا رہا۔ آپ کے خادم علی بخش سے بھی میرے برادرانہ مراسم پیدا ہو گئے۔ یہ شخص حضرت علامہ کی خدمت میں کمر بستہ اور گوش برآواز رہتا۔ ان کی خدمت میں، میں نے ہمیشہ یکساں طور پر اسے مطمئن اور مستعد پایا۔ حتیٰ کہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ لازوال دولت ہم سے چھن گئی۔ اس سانحہ عظیم پر ہمارے ایک درد مند دوست نے ہمارے موافق حال رومی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر پڑھا تھا:

شرح گل بگزار از بہر خدا
شرح بلبل گو کہ از گل شد جدا

اپنے ملازمین کے ساتھ حضرت کا سلوک نہایت ہی بزرگانہ اور مساویانہ تھا۔ ایک دفعہ آپ کے معصوم بچے نے علی بخش کو ایک تلخ سی بات کہی تو وہ بھی حضرت کو ناگوار گزری۔ عزیزی جاوید کا ایک اتالیق کبھی کبھی انہیں پیٹ دیا کرتا تھا۔ آپ نے بلا کر اسے صرف اتنا کہا کہ ''سزا دیتے وقت اس بات کا خیال رکھا کیجیے کہ مجھ تک پیٹنے کی آواز نہ پہنچے۔''

بچوں کو دیکھ کر آپ بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ میرا چھوٹا بچہ آپ کی خدمت میں جب پہلی مرتبہ حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا ''بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا ''محمود۔'' آپ ازراہ شفقت فرمانے لگے:

الٰہی عاقبت محمود گرداں!

ایک دفعہ میں نے کسی خطا پر اسی بچے کے منہ پر ہلکا سا چانٹا مارا۔ کچھ دیر بعد میں حضرت کے مکان پر حاضر ہوا۔ فرمانے لگے ''رسول اللہ ﷺ نے بچوں کے منہ پر چانٹا مارنا منع فرمایا ہے کیونکہ اس سے ابن آدم کی بے عزتی ہوتی ہے جو حضور ﷺ کو بہت ناگوار تھی۔'' اس ارشاد میں اسلامی تعلیم و تربیت کے بنیادی اصول ''عزت نفس'' کی طرف ایک لطیف اشارہ موجود ہے۔

آپ کے رہائشی کمروں میں ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے چند کوچیں اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور فرش پر ایک دو قالین۔ میکلوڈ روڈ اور میورو ڈ والی کوٹھیوں کی قریب قریب ایک ہی حالت تھی۔

## تنوع پسندی

آپ کے دسترخوان پر کھانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی مگر جس ایجاد و اختراع کو وہ زندگی کی علامت سمجھتے تھے، اس کا لحاظ کھانوں کے باب میں بھی رکھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے دور تنزل کے باورچیوں کے متعلق فرماتے تھے ''باقی قوم کی طرح ان کے اندر بھی ایجاد و اختراع کا مادہ نہیں رہا۔'' آپ کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ جب گھر میں ہوتے تو سردیوں میں زیادہ تر ایک قمیص، پاجامہ اور کشمیری دھسہ اوڑھ لیتے اور گرمیوں میں زیادہ تر بنیان اور تہ بند پر ہی گزارہ کرتے۔ شام کے وقت کوٹھی سے باہر صحن میں چارپائی پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ ایسی حالت

میں بجلی کا پنکھا میں نے کبھی وہاں استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔

آپ جس جگہ بیٹھے ہوتے وہ بھرپور معلوم ہوتی۔ اس حالت میں آپ کے پاس ہر طبقہ کے لوگ حاضر ہوتے۔ آپ کی طبیعت میں حد درجہ کی شگفتگی تھی۔ معمولی باتوں میں بھی کوئی نہ کوئی شگفتہ پہلو نکال لیتے تھے۔ ایک خاص فرقے سے تعلق رکھنے والا ایک آدمی جو اپنے آپ کو بڑے اصرار سے مصلح موعود خیال کرتا تھا، آپ کے پاس میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر آیا اور کہنے لگا، مجھ سے اللہ تعالیٰ باتیں کرتا ہے۔ خندہ بلب ہو کر کہنے لگے: ''خدا کی سب باتیں مان نہ لیا کرو، وہ بعض باتیں یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے۔'' اس نے کہا کہ وہ ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جائے گا اور دہلی کو اپنا پایہ تخت بنائے گا۔ اسی رنگ میں فرمانے لگے ''ہم تو اس وقت تک موجود نہیں ہوں گے۔ ہمارے جاوید کو نہ بھولنا اور کم از کم مہرولی کا علاقہ اسے بخش دینا۔'' ایام رحلت میں وہی شخص عیادت کے لیے آپ کے پاس آیا۔ آتے ہی کہنے لگا '' آپ نے تو مجھے پہچانا نہیں ہوگا۔'' فرمانے لگے ''ہم اور آپ کو نہ پہچانیں، ولی را ولی مے شناسد۔''

ایک مرتبہ علی بخش سے دل لگی کے طور پر کہنے لگے ''عجب ہے کہ اردو کے شعراء زلفوں اور مانگوں کا ذکر تو کرتے ہیں مگر علی بخش کی مونچھوں کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔''

ایک دن لاہور کے اکابر میں سے ایک صاحب تشریف لائے جو نہایت ہی سیاہ فام تھے اور سر سے پاؤں تک سفید لباس اوڑھے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے '' بھئی آج تو بجھے ہوئے سگریٹ نظر آتے ہو۔''

## مسولینی سے ملاقات

آپ کی شگفتہ باتوں سے سامعین تو خوب محظوظ ہوتے لیکن آپ کی ہنسی زیرلب رہتی۔ یک دفعہ فرمایا، جب میں روما میں مسولینی سے ملاقات کے بعد باہر آیا تو اخباروں کے نمائندوں نے آگھیرا۔ ہر ایک مسولینی کے متعلق میری رائے دریافت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سب کو نزدیک بلا کر کہا ''مسولینی لوتھر تو ہے مگر بغیر بائبل کے۔''

(Mousolini is Luther without the Bible)

یورپین اقوام کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا ''ہر فرعون کی حکمرانی کے اصول قریب

قریب ایک جیسے ہوتے ہیں۔" پھر یہ آیت پڑھی ان فرعون علی فی الارض وجعل اھلھا شیعا۔ اس کے بعد کہا "ایک بحیرہ قلزم میں ڈوبا تھا ممکن ہے دوسرا بحیرہ روم میں غرق ہو۔" ممکن ہے مندرجہ ذیل رباعی بھی اسی اثر کے ماتحت کہی گئی ہو:

بہ ساحل گفت موج بے قرارے — بہ فرعونے کنم خود را عیارے
گہے برخویش مے پیچم چوں مارے — گہے رقصم بہ ذوق انتظارے

آپ کی خدمت میں دیہاتی بھی اکثر آیا کرتے تھے جن سے آپ اپنی معمولی سادگی اور بے تکلفی سے باتیں کیا کرتے۔ ایک مرتبہ راولپنڈی کے چند لوگ حاضر ہوئے۔ گفتگو کے دوران میں ایک نے عرض کیا "جناب مولوی محمد صاحب نے اپنی پنجابی نظم "سیف الملوک" میں بھی بعض موقعوں پر انھی خیالات کا اظہار کیا ہے جن کا آپ نے......" فرمانے لگے: "سو سیانے تے اکومت۔"

دوران گفتگو میں ایک نے کہا "خودی کا علم اخلاص کے بغیر ممکن نہیں۔ جوں جوں آدمی اخلاص میں ترقی کرتا ہے، وہ خودی کے علم میں بھی ترقی کرتا جاتا ہے۔" یہ دن کا واقعہ تھا۔ اسی روز شام کو فرمانے لگے "اس دیہاتی نے خوب بات کہی۔ زندہ خیالات اسی طرح مختلف لباسوں میں پھیلتے رہتے ہیں۔"

آپ کا چہرہ چاندنی کی طرح پاک اور بے لوث تھا اور گفتگو آئینہ کی طرح صاف اور بے داغ جاوید نامہ میں مولانائے روم کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کے وقت آپ نے جن مشاہدات کو بیان کیا ہے وہ حرف بہ حرف آپ پر بھی صادق آتے تھے:

طلعتش رخشندہ مثل آفتاب — شیب او فرخندہ چوں عہد شباب
حرف او آئینۂ آویختہ — علم باسوز دروں آمیختہ

جذب کی حالت میں ہوتے تو تھوڑے وقفہ کے بعد بھری ہوئی آواز میں "یا اللہ" پکارتے۔ آپ کی تصانیف کے اندر حکمت کے دو دریاؤں کا اتصال ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

آبجویم از دو بحر اصل من است

آپ کے حکیمانہ فکر کی مثال:

حرف تہ دارے بانداز فرنگ

اور کلیمانہ ذکر کی مثال:

نالۂ مستانہ از تار چنگ

## کردار کی تلاش

آپ کی تعلیمات میں عقل و عشق، ذکر و فکر، سوز و ساز ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے قومی کردار میں بھی ان عناصر کا گہرا امتزاج ہے۔ آپ مرد مسلمان کے اندر اسی قوم کردار کی آواز پیدا کرتے ہیں اور اسی کی جستجو میں لگا دیتے ہیں۔ یہی کردار ابن آدم کی امتیازی شان ہے۔ اسی سے وہ "جہان تحت وفوق" کی تسخیر کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے اسے ملائکہ مقربین پر بھی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ سب ہیں ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء
مقام ذکر کمالات رومی و عطار
مقام فکر مقالات بو علی سینا
مقام فکر ہے پیمائش زمان و مکاں
مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

افرنگی قوموں نے فکری علوم میں کمال تو حاصل کر لیا لیکن اپنے ناقص اور ناہموار قومی کردار کی وجہ سے ان علوم کے ذریعہ ایک ایسی تہذیبی عمارت کھڑی کی جس کے اندر شریف انسانیت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اسی لیے حضرت علامہ جستجوئے علم کی تلقین کے ساتھ فرنگیوں کی تہذیب سے بار بار متنبہ کرتے ہیں:

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست — اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است — ایں گہر از دست ما افتادہ است
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشۂ اسلاف ماست — باز صیدش کن کہ ایں از قاف ماست
لیکن از تہذیب لادینے گریز — زانکہ او با اہل حق دارد ستیز

اس تہذیب سے گریز اس لیے لازمی ہے کہ یہ حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے اور اہل حق اس

کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہوتے ہیں۔ حضرت علامہ علم کو جبریل سے مشابہ قرار دیتے ہیں مگر فرنگیوں کی صحبت بد میں یہ جبریل ''ابلیس'' بن جاتا ہے۔

''جبرئیل از صحبت اش ابلیس شد''

فرنگیوں کے مزاج میں دوئی ہے، اس لیے انھیں جان وتن اور ملک ودین میں بھی دوئی اور تفریق نظر آتی ہے:

تن و جاں را دوتا گفتن کلام است
تن و جاں را دوتا دیدن حرام است

---

دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

دوئی کے تمام مظاہر کے خلاف شاعر ربانی نے ساری عمر بغاوت کی اور بیسیوں مثالوں اور پیرایوں کے ساتھ احقاق حق اور ابطال باطل کیا۔

مردِ حق کا اس دنیا میں طریقہ کار یہ ہے:

نقش حق اول بجاں انداختن
باز او را در جہاں انداختن

مردانِ حق دنیا کے اندر نقش حق کے اتمام کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ نقش حق کے اتمام کو ہی دیدار حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تقدیر تدبیر کے ہم عنان ہو جاتی ہے۔ دین ودنیا میں کوئی تنازع باقی نہیں رہتا اور دنیاوی علائق انسان کی دینی ترقی میں حائل نہیں ہوتے۔

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی

انسان شمشیر ہے۔ عالم اور اہرمن اس شمیر کو تیز دم کرنے والی سان۔

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن عالم ایں شمشیر را سنگ فسن
خویش را بر اہرمن باید زدن تو ہمہ تیغ، او ہمہ سنگ فسن
تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

دینی اور دنیوی، زمینی اور سماوی زندگیوں میں ہم آہنگی کا راز ''نسیم و شبنم'' کے سوال و حواب میں نظر آئے گا:

نسیم

انجم کی فضا تک نہ ہوئی میری رسائی
کرتی رہی میں پیرہن و لالہ و گل چاک
مجبور ہوئی جاتی ہوں میں ترک وطن پر
بے ذوق ہیں بلبل کی نواہائے طرب ناک
دونوں سے کیا ہے تجھے تقدیر نے محرم
خاک چمن اچھی کہ سرا پردہ افلاک

شبنم

کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک
گلشن بھی ہے اک سرسرا پردۂ افلاک

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

صحبت گل دانہ را سازد درخت
آدمی از صحبت گل تیرہ بخت
دانہ از گل می پذیرد پیچ و تاب
تا کند صید شعاع آفتاب

شاعر ربانی نے فطرت کی سی گوناگونیت کے ساتھ زندگی کے ان دقیق مسائل کی توضیح کردی ہے۔

آپ فرنگی نظریہ وطنیت کے سخت مخالف تھے اور اسے موجودہ زمانے میں دوئی اور تفریق کا سب سے بڑا مظہر سمجھتے تھے۔ اکثر ان لوگوں کی کج نظری پر افسوس کرتے جو اس نظریہ کو حب وطن سے مخلوط کرتے۔ ایک موقع پر اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی تو آپ نے یہ شعر پڑھا:

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

ایک مقامی ہندو کالج کے چند طلباء آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ سب کچھ مسلمانوں کے لیے لکھتے ہیں اور ہمارے لیے کچھ نہیں لکھتے۔ فرمایا ''تم نے میری کون سی کتاب پڑھی ہے؟'' انھوں نے جواب دیا بانگ درا پھر بانگ درا منگوا کر انھیں کہا کہ اس میں سے ان نظموں کو گنو جنھیں تم خالص اسلامی کہتے ہو۔ جب انھوں نے ایسی نظمیں گننا شروع کیں تو کوئی زیادہ نہ نکلیں۔ اس پر آپ نے کہا ''اب تم اپنے ظرف کا اندازہ لگاؤ۔'' پھر فرمانے لگے ''یہ تو محض تمہارے سوال کا جواب تھا۔ اب حقیقت سنو۔ ایک شخص کی اپنی والدہ بیمار اور جاں بلب ہے۔ کیا اس حالت میں تم اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ اسے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور کی تیمارداری میں مصروف ہو جائے گا۔'' طلباء نے جواب دیا ''ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔'' فرمایا ''میری قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ میں اسے اس حالت میں چھوڑ دوں تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غداری کے مترادف نہ ہوگا؟''

---

ایک دن ایک دوست کے ہمراہ حاضر خدمت ہوا۔ میرے دوست نے پوچھا ''جناب نے کبھی ہیٹ پہنا ہے؟'' فرمایا ''نہیں۔'' پھر فرمایا:

عجیب چیز ہے یورپ کی زندگی جس سے
دماغ ہوتا ہے دل آشنا نہیں ہوتا

قندھار میں خرقہ شریف کی زیارت کا ذکر کرتے ہوئے آپ ''مسافر'' میں لکھتے ہیں:

خرقۂ آں ''برزخ لا یبغیاں''
دیدمش در نکتۂ لی خرقتاں

میں نے پوچھا ''پہلے مصرع میں سرور کائنات ﷺ کی طرف اشارہ ہے؟'' فرمانے لگے ''ہاں حضور ﷺ کی ذات کے اندر درویشی و سلطانی دونوں سمندر باہم ملتے ہیں۔''

ذیل کے اشعار میں بھی وہی حقیقت آشکار ہے:

خسروی شمشیر و درویشی نگاہ　　ہر دو گوہر از محیط لا الٰہ
فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است　　ایں تجلی ہائے ذات مصطفیٰ است
آں فتوحات جہان ذوق و شوق　　ایں فتوحات جہان تحت و فوق
ہر دو انعام خدائے لا یزال　　مومناں را ایں جمال است آں جلال

حضرت علامہ کے علمی تبحر کے متعلق ایک دفعہ میں نے ازراہ عقیدت عرض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشرق و مغرب کے علوم کا جامع بنایا ہے۔ فرمانے لگے ''ان علوم نے مجھے چنداں نفع نہیں پہنچایا۔ مجھے نفع تو صرف ایک بات نے پہنچایا ہے جو مجھے میرے والد نے بتائی۔'' مجھے جستجو ہوئی کہ اس سر عظیم کو کس طرح معلوم کروں جس نے اقبال کو اقبال بنایا۔ آخر دل کو مضبوط کر کے عرض کیا ''وہ بات پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟'' فرمانے لگے ''رسول اللہ ﷺ کے نام پر صلوٰۃ و درود'' پھر فرمایا ''ایک دن یونہی خیال آیا کہ میں نے حضور ﷺ کو کے دفعہ درود بھیجا ہے؟'' گننے بیٹھا تو اس دن پورے ایک کروڑ کی تعداد تھی۔ ایک دفعہ فرمانے لگے ''بعض درویشوں کا تو تمام عمر کا وظیفہ سرورِ کائنات پر صلوٰۃ و درود بھیجنا رہا ہے۔''

آپ نے مسلمانوں کی جو خدمت کی، ایک موقع پر آپ کے روبرو اس کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ:

''سوئے ہوئے بچے کا منہ چومنے والی بات ہے۔''

حضرت اپنی واردات کا عام طور پر اخفا کرتے تھے:

بازیاب ایں نکتہ را اے نکتہ رس
عشق مرداں ضبط احوال است و بس

مجھ میں اور میرے ایک عزیز دوست میں ''ذوق و شوق'' کے متعلق اختلاف رائے ہوا۔ ہم میں سے ایک کی رائے یہ تھی کہ یہ نظم حضورِ حق ہے۔ دوسرا کہتا تھا کہ یہ بحضور رسالت مآب ﷺ ہے۔ شام کو ہم اکٹھے حاضر ہوئے اور اپنی مشکل بیان کی۔

فرمایا: ''یہ حضور رسالت مآب ﷺ ہے۔'' اور خاموش ہو گئے۔ کچھ وقفہ کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا:

عین وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

اور عرض کیا: ''جناب کا ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔'' اس کا جواب گہری خاموشی میں ملا۔ واپس گھر آیا تو میرے دل نے سخت ملامت کی:

حرف پریشاں نہ کہہ اہل نظر کے حضور

رسول اللہ ﷺ کا نام لب پر آتے ہی سراپا رقت ہو جاتے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اس قدر والہانہ محبت کے باوجود بھی حضور ﷺ کے ساتھ آپ کا ادب بے مثال تھا۔ جاوید نامہ کی اشاعت کے وقت میں نے نادانستہ طور پر پوچھا۔ ''اس ادبی معراج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی؟'' مجھے کیا معلوم تھا کہ کسی نہایت ہی نازک تار پر چوٹ پڑے گی۔ ایک عجیب کیفیت عجز طاری ہو گئی۔ فرمایا ''وہاں پہنچنا کب آسان ہے۔ کتاب میں ذکر تو کئی جگہ پر آیا ہے۔'' پھر یہ شعر پڑھا۔

می توانی منکر یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

اس پر سخت رقت طاری ہو گئی اور اسی سینہ سوز رقت کے عالم میں زندہ رود کا یہ سوال پڑھا:

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطا ست    سرِ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰ ست
آدمے یا جوہرے اندر وجود    آنکہ آید گاہے گاہے در وجود

اور اسی عالم میں حلاج کا یہ جواب پڑھ گئے:

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است    خویش را خود عبدہ فرمودہ است
عبدہ از فہم تو بالاتر است    زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہر او نے عرب نے عجم است    آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہ صورت گر تقدیر ہا    اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہ ہم جانفزا ہم جانستاں    عبدہ ہم شیشہ ہم سنگ گراں
عبد دیگر عبدہ چیزے دگر    ما سراپا انتظار، او منتظر
عبدہ، دہر است دہر از عبدہ ست    ما ہمہ رنگیم، او بے رنگ و بوست
عبدہ با ابتداء بے انتہا ست    عبدہ از صبح و شام ما کجا ست
کس ز سر عبدہ آگاہ نیست    عبدہ جز سر الا اللہ نیست

آپ کے روبرو قرآن حکیم پڑھا جاتا تو بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ چہرہ تمتما اٹھتا اور آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر میں نے جب پہلی مرتبہ یہ نظارہ دیکھا تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ایک اور مرتبہ عالم کیف میں آپ بار بار قرآن مجید کے متعلق یہ مصرعہ

دہرا رہے تھے۔

این کتابے نیست چیزے دیگر است

آپ کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ رقت اور سوز کی حالت میں جو کیفیت ہوجاتی، وہ ناقابل بیان ہے۔

نگرید مرد از رنج و غم و درد ز دوراں کم نشیند بر دلش گرد
قیاس او مکن از گریۂ خویش کہ ہست از سوز و مستی گریۂ مرد

ایک دفعہ جذب کی حالت میں میر رضی دانش کا یہ شعر (بہ تغیر لفظی) بار بار پڑھ رہے تھے۔

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب
بر دل ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

یہ شعر سن کر مجھے یہ خیال ہوا کہ سنگ آمد و سخت آمد و بر دل آمد لیکن اس کا اصل مفہوم مجھ پر واضح نہ ہوا۔ مدت کے بعد جب ارمغان حجاز شائع ہوئی تو میں نے اس مفہوم کی رباعی دیکھی:

چسان احوال او را برلب آرم تو می بینی نہان و آشکارم
ز روداد دو صد سالش ہمیں بس کہ دل چو کندۂ قصاب دارم

اس رباعی کو پڑھ کر یہ راز کھلا کہ فرنگیوں کے سفاک اور ظالم ہاتھوں نے ہماری دوصد سالہ غلامی کے دوران میں ہماری تہذیب و دین پر جو گہرے زخم لگائے، ان کی وجہ سے شاعر ملت کا دل کندہ قصاب کی طرح مجروح ہے اور اس ظلم کی روداد وہاں درج ہے۔

ایک طرف اگر ذوق وشوق کا یہ عالم تھا تو دوسری طرف جہاں بینی اور خود آگہی بھی درجہ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ باقاعدگی کے ساتھ واقعات حاضرہ کا مطالعہ کرتے اور دنیا کی سیاسی، علمی اور دینی تحریکوں کا جائزہ لیتے۔ آپ ملت اسلامیہ کے ماضی، حال اور مستقبل کو بطور کل اپنے سامنے رکھتے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے:

''اس امت کی تیرہ سو سال کی زندگی میں جس جگہ سے اس کی دیواروں کے اندر سیلاب آگھسا ہے میری نظر ایسی جگہوں پر رہتی ہے اور میں ان کے بند کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہوں:''

اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا جیسا ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستا خیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلہ کی طرح روشن جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

آپ کو فخر تھا کہ درویشی آپ کو وراثت میں ملی ہے۔ اپنے والد کی درویشانہ خوبیوں اکثر ذکر کرتے۔ یہ بھی فرماتے کہ جس بزرگ کی آپ اولاد ہیں، اسلام لانے کے بعد وہ ہر سال پیدل حج کو جایا کرتے تھے جس کی وجہ سے اہل کشمیر انہیں "حاجی لول حج"، یعنی مشتاق حج کہتے جاوید نامہ میں اپنے لڑکے کو نصیحت فرماتے ہیں:

اہل دیں را باز داں از اہل کیں　　　ہم نشیں حق بجو با او نشیں

آگے چل کر فرماتے ہیں:

گر نیابی صحبت مرد خبیر　　　از اب وجد آنچہ من دارم بگیر

حضرت علامہ نے اپنے کلام میں دو آدمیوں کو اپنا مرشد ظاہر کیا ہے۔ ایک مولانا روم:

مرشد رومی حکیم پاک زاد　　　سر مرگ و زندگی برمن کشاد

اور دوسرے اپنے والد ماجد کو...... حضرت کے والد کا مزار حضرت "امام علی الحق" کے قبرستان میں بمقام سیالکوٹ واقع ہے۔ زائر کو قبر کے کتبہ میں یہ شعر دکھائی دیتا ہے:

رہبر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت　　　ماہمہ راہ رواں، منزل ما ملک عدم

ایک دفعہ کوہ مری ہمراہ جاتے ہوئے میں نے پوچھا "قرب حق" کسے کہتے ہیں۔ جواب میں مولانا روم کا یہ شعر پڑھا:

قرب حق بالا زپستی رفتن است　　　قرب حق از بند ہستی رستن است

ایک اور دفعہ میں نے عرض کیا کہ باری تعالیٰ سے شکوہ کا لہجہ بعض جگہ بہت تیزی سے تلخی اختیار کر جاتا ہے۔ کہنے لگے:

گستاخی و بے باکی رمزیں ہیں محبت کی
ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بے باک

پرانی کوٹھی پر ایک دفعہ آپ کے پاس دو بزرگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح کھانے کے وقت دستر خوان پر بیٹھے ہوئے ان میں سے ایک نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے انسان ملائکہ سے افضل ہے۔ فرمانے لگے:

"پیدائش کے اعتبار سے تو افضل نہیں۔ البتہ ملائکہ سے آگے بڑھ ضرور جاتا ہے۔"

اسی محفل میں آپ نے وہ جملے دہرائے جو خوارج کے جواب میں امام شافعی رحمۃ اللہ نے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں کہے تھے۔

علی حبه جنة إمام الإنس و الجنة
(وصي المصطفى حقا) قسيم النار و الجنة

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ فقر کی پہلی منزل کسب حلال ہے۔ نور ایمان بھی کسب حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ بغداد کے ایک بزرگ (ان کا نام میں بھول گیا ہوں۔) کے متعلق فرمایا کہ ان کی ہمشیرہ قاضی شہر کے پاس گئیں اور سوال کیا کہ "ہم غریب ہیں۔ ہمارے گھر میں روشنی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک امیر آدمی رہتا ہے۔ اس کی شمعوں کی روشنی ہمارے صحن میں بھی پڑتی ہے اور اس روشنی میں مطالعہ کرتی ہوں۔ فرمایئے کہ شریعت کی رو سے پڑوسی کے گھر کی روشنی کا ایسا استعمال حرام ہے یا حلال؟" قاضی نیکی اور تقویٰ کا یہ لطیف اور عمیق احساس دیکھ کر حسرت زدہ ہو گیا۔ پوچھا: "آپ کون ہیں؟" خاتون نے جواب دیا، میں فلاں درویش کی ہمشیرہ ہوں۔ قاضی نے کہا "آپ کے لیے حرام ہے لیکن باقی لوگوں کے لیے حلال۔" اس پر حضرت علامہ پر سخت رقت طاری ہو گئی جس سے دوسرے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے:

آں نوا کز جان تو آید بروں می دھد ہر سینہ را سوز دروں

حضرت علامہ کا کلام ایک آئینہ کی طرح ہے جس کے اندر مرد مسلمان کو اپنا چہرہ نظر آتا ہے:

بنتے ہیں میری کارگاہ فکر میں انجم لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

ایک دن رومی کے حوالہ سے بتایا کہ کسی گڈریے نے اتفاق سے ایک بھیڑیے کا بچہ پکڑ لیا اور اپنی بھیڑوں کی طرح ہی اس کی پرورش شروع کر دی۔ وہ جب جوان ہوا تو انھیں کی طرح زندگی گزارنے لگا۔ ایک دن وہ چراگاہ میں پھرتے پھراتے ایک چشمہ کے کنارے جا نکلا۔ صحبت ناجنس میں زندگی گزارنے والے بھیڑیے کی نظر چشمے کے صاف و شفاف پانی پر پڑی تو اسے اپنی شکل نظر آئی جسے دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہم صحبتوں سے بالکل الگ شے ہے۔ اس پر اس نے غیرت محسوس کی۔ ایک جست لگائی اور چشمہ پھاند کر اپنے ناجنس ساتھیوں سے الگ ہو گیا:

جوانوں کو مری آہ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

پانی پت میں مولانا حالی کی پچاس سالہ برسی غالباً ۱۹۳۵ء میں منائی گئی۔ حضرت علامہ بھی تشریف لے گئے۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ تقریب کے خاتمہ پر منتظمین کی طرف سے مدعوئین کی فوٹو کا انتظام کیا گیا۔ فوٹو کے لیے حضرت علامہ کی کرسی صدر جلسہ نواب صاحب بھوپال کے ساتھ رکھی گئی۔ اس بات کی اطلاع مولانا حالی مرحوم کے صاحبزادہ نے ہمیں دی۔ حضرت علامہ یہ سن کر وہاں سے چل دیئے اور اپنی جائے رہائش پر پہنچ گئے۔ وہاں سے سامان لے کر سٹیشن پر پہنچے۔ میں حیران تھا کہ فوٹو میں شامل ہونے سے آپ نے کیوں اجتناب فرمایا ہے۔ ویٹنگ روم میں علی بخش نے حقہ تازہ کر کے پیش کیا۔ آپ نے ہلکے ہلکے کش لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے تصویر میں نہ شامل ہونے کے معمہ کو معلوم کرنے کی غرض سے پوچھا: ''ہمارے علماء کے نزدیک فوٹو کھنچوانا حرام ہے۔ ان کی یہ بات صحیح ہے یا غلط؟'' فرمانے لگے ''بات تو صحیح ہے لیکن دلیل غلط دیتے ہیں۔'' میں نے عرض کیا ''صحیح دلیل کیا ہے؟'' فرمانے لگے ''صحیح دلیل یہ ہے کہ مومن کو بے مثال ہونا چاہیے۔'' کچھ عرصہ بعد میں نے یہ واقعہ ایک اہل دل یار طریق کو بیان کیا جس نے ایک گہرے اثر کے ماتحت اپنا یہ شعر پڑھا:

خیال کو بھی اسیر نگاہ کرتا ہے
مری نظر میں مصور گناہ کرتا ہے (۱)

غرض کہ حضرت علامہ ایک مرد آفاقی تھے۔ ان کا قلب ایک مرد مومن کا قلب تھا اور ان کی نگاہ ایک مرد مومن کی نگاہ۔ دین ہو یا سیاست، علم ہو یا فن، ان سب سے متعلقہ مسائل کا محاسبہ وہ ایک مرد مسلمان کی حیثیت ہی سے کرتے تھے:

کل ساحل دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے ۔۔۔ تو ڈھونڈ رہا ہے سم افرنگ کا تریاق
اک نکتہ میرے پاس ہے شمشیر کی مانند ۔۔۔ برندہ و صیقل زدہ و روشن و براق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے ۔۔۔ مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

حواشی: از جعفر بلوچ

(۱) یہ شعر حضرت اسد ملتانی کا ہے۔

✿✿✿



ڈاکٹر ندیم شفیق ملک تاریخ، بین الاقوامی تعلقات، قومی سلامتی، زبان وادب اور اقبالیات کے مطالعہ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے تاریخ میں ایم ایس سی، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ مزید براں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ایم اے پنجابی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے پاکستانی زبانیں وادب میں ایم فل کی ڈگریاں لیں۔ انھیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے اقبالیات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی عطا کی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ویمن سٹڈیز میں ایم ایس سی اور نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اسلام آباد سے بین الاقوامی تعلقات میں ایم فل کی ڈگریاں بھی حاصل کر چکے ہیں۔

تحریک وتاریخ پاکستان، بین الاقوامی تعلقات اور سیاسیاتِ پاکستان پر ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کے ستر سے زیادہ تحقیقی مقالات اور پچاس سے زیادہ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی نمایاں کتب میں، اقبال اینڈ دی انگلش پریس آف پاکستان، دی پالیٹکس آف اپوزیشن ان پاکستان، ریسرچ پیپرز اون پاکستان، دی پولیٹکل سیگیسٹی آف اقبال، دی آل انڈیا مسلم لیگ، ۱۹۰۶ـ۱۹۴۷، علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد، ۱۹۳۰ء: ایک مطالعہ، دی فارمیٹویر ز آف آل انڈیا مسلم لیگ، ۱۹۰۶ـ۱۹۱۹ء، آل انڈیا مسلم لیگ اینڈ علامہ اقبال الہ آباد ایڈریس، ۱۹۳۰، علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد، ۱۹۳۰ء، صدائے بام دنیا: وخی زبان، ادب و معاشرت پر ایک نظر، آسوشو لینگینوسٹک سٹدی آف واخی لینگویج آف نادرن پاکستان، علامہ اقبال اینڈ انگلش نیوز پیپرز آف پاکستان، ۱۹۵۸ـ۱۹۴۷، علامہ اقبال کی تابندہ یادیں، انڈیا ورسس چائنہ: آراویو آف دا اکسی چن بادرڑ دسپیوٹ، دی چلڈرنس کاروپونڈس ویڈدی قائداعظم محمد علی جناح ۱۹۴۸ـ۱۹۳۹، علامہ اقبال کے چند نادر ونایاب خطوط، نوادراتِ علامہ اقبال، چند معاصرین اقبال، علامہ اقبال کے چند احباب، بریدرین ان فیتھ: دی آل انڈیا مسلم لیگ اینڈ دی پیلسٹین ایشو (۴۷ـ۱۹۱۷)، گلوبل امپرنٹس اینڈ ایپریسی ایشن آف علامہ اقبال، دی قائداعظم محمد علی جناح، آل انڈیا مسلم لیگ اینڈ اچیومنٹ آف پاکستان (۱۹۱۷ـ۱۹۴۷)، علامہ اقبال: ایز رپورٹیڈ ان دی پولیس ایبس ٹریکٹ آف انٹیلی جنس پنجاب (۳۵ـ۱۹۰۴)، پرس پیکٹوز اون علامہ اقبال: اے ورلڈ سروے آف اقبال سٹڈیز، ہمارے بہت ہی پیارے قائداعظم: بچوں کے قائداعظم محمد علی جناح کے نام خطوط (۴۸ـ۱۹۳۹)، علامہ اقبال: پنجاب پولیس کی خفیہ معلومات کے تناظر میں (۳۵ـ۱۹۰۴)، اقبال ڈے سیلبریشن آبروڈ (۲۰۰۰ـ۱۹۴۸)، دی انڈس واٹر ٹریٹی، ۱۹۶۰: ٹیکسٹ اینڈ انیلائسس، دی یو ایس اے کینیڈا اینڈ دی قائداعظم محمد علی جناح (اے کولیکشن آف دی نیوز، ویوز اینڈ کومنٹس اپیرڈ ان دی نارتھ امریکن پرنٹ میڈیا آن دی ڈمائیس آف قائداعظم محمد علی جناح)، ائیر مارشل (ریٹائرڈ) محمد اصغر خان، دی تحریک استقلال اینڈ دی پولیٹکس آف اپوزیشن ان پاکستان (۷۷ـ۱۹۷۱)، دی اینول رپورٹس آف دی آل انڈیا مسلم لیگ (۲۵ـ۱۹۱۹)، اور دی آل انڈیا مسلم لیگ: سم ہسٹوریکل اینڈ فنکشنل پروسپکٹو (۱۹۱۹ـ۱۹۰۶)، شامل ہیں۔

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک سول سروس آف پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس وقت بطور چیئرمین، نیشنل کونسل آف سوشل ویلفیئر اسلام آباد اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

نفیس اکیڈمی
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ پاکستان
فون: 0092-42-37239884-37320318
ای میل: kitabsaray@hotmail.com